وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

تفسیر القرآن

وہو

الہدیٰ والفرقان

جلد اوّل

سورۃ الفاتحہ والم البقرہ

من تصنیف نجم الہند الاسلام جناب ڈاکٹر سر سید احمد خان

کے۔سی۔ایس۔آئی۔ایل۔ایل۔ڈی

بفرمایش منشی فضل الدین ککےزئی تاجر کتب قومی

کشمیری بازار لاہور

مطبوعہ رفاہ عام سٹیم پریس لاہور

قیمت فی جلد صے

فہرست کتب تصنیفات سر سید احمد خان صاحب مرحوم و مغفور

الخطبات الاحمدیہ فی العرب و السیرۃ المحمدیہ

یعنی وہ دلچسپ کتاب جس میں مرحوم سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے تاریخ عرب اور پاک اسلام کی مذہبی تاریخ کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور عیسائی مورخوں کے بیجا اعتراضوں کے جواب جو پاک مذہب اسلام اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآن کریم پر کئے تھے ایسے تسلی بخش اور مدلل دیئے ہیں جو قابل دید ہیں۔ درحقیقت اس مرحوم و مغفور نے اس کتاب کی تصنیف سے مذہب پاک اسلام کی وہ خدمت کی ہے جو ہر طرح قابل تعریف و تحسین ہے اور ممکن نہیں کہ اس دنیوی کے ساتھ کوئی اور صاحب ایسی بے بہا کتاب تصنیف کرے اور لطف یہ کہ نہایت اعلےٰ درجہ کی صاف زبان اردو میں۔ جو مسلمان کہ سچے دل سے قوم اسلام کے ہمدرد اور ترقی خواہ اور اسلام کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ اس بے بہا کتاب کا ضرور مطالعہ کریں نئی روشنی کے تعلیم یافتہ مسلمان جو عربی زبان کی عدم واقفیت ہونے کے علاوہ انگریزی فلسفہ اور منطق سے ماہر ہیں اس کتاب میں نہایت مدلل اور مفید بحثیں دیکھینگے۔ اگرچہ اس میں ۱۲۶ نہایت دلچسپ مضامین ہیں مگر ہم مختصر طور پر تھوڑے سے مضامین کی فہرست ہدیہ ناظرین کرتے ہیں ❖

اس کتاب میں ایک دیباچہ اور بارہ خطبہ شامل ہیں دیباچہ میں یہ بحثیں ہیں۔ مذہب کیا چیز ہے۔ سچے مذہب کے پرکھنے کا سچا اصول کیا ہے۔ اسلام صحیح طور پر کن احکام کا مجموعہ ہے۔ اُن کتابوں پر بحث جو عیسائی اور مسلمانوں نے آنحضرت صلعم کی زندگی کے حالات پر لکھی ہیں۔ سر ولیم میور کی کتاب **لائف آف محمد** کا ذکر جس کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

خطبہ اول۔ عرب کا جغرافیہ۔ عرب کے قبائل اور سلاطین پر محققانہ بحث۔ لفظ سارآسن کی تحقیق۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے حالات پر محققانہ بحثیں۔ حضرت **ہاجرہ** کی حرمت پر بحث۔ **خطبہ دوم**۔ عرب جاہلیت کی رسوم عادات بُت پرستی۔ حجر اسود اور خانہ کعبہ کا ذکر۔ حج زمانہ جاہلیت میں۔ رسوم ازدواج۔ **خطبہ سوم**۔ عرب جاہلیت کے ادیان پر بحث نہایت تفصیل سے۔ اسلام کی مناسبت دیگر الہامی مذاہب سے۔ **خطبہ چہارم**۔ اسلام انسان کے لئے رحمت اور تمام انبیا کے مذاہب کی پشت و پناہ ہے۔ اسلام انسانی تمدن کے مطابق ہے۔ کثرت ازدواج۔ طلاق اور غلامی پر محققانہ بحثیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کو اسلام سے کیا فائدہ پہنچا۔ **خطبہ پنجم**۔ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں پر محققانہ بحث۔ **خطبہ ششم**۔ مذہبی روایتوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر مدلل بحث۔ **خطبہ ہفتم**۔ قرآن مجید کی جمع و ترتیب اور نزول پر بحثیں۔ **خطبہ ہشتم**۔ خانہ کعبہ کی مفصل تاریخ۔ **خطبہ نہم**۔ آنحضرت صلعم کے نسب نامہ پر محققانہ بحث۔ شجرہ نسب آنحضرت معہ شجرہ نسب مصنف کتاب۔ **خطبہ دہم**۔ بشارات نسبت آنحضرت کے جو توریت و انجیل میں ہیں۔ **خطبہ یازدہم**۔ روایات شق صدر اور معراج کی تحقیق۔ **خطبہ دوازدہم**۔ جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بارہ برس تک کے حالات ❖

اس کتاب کے شروع میں مرحوم سر سید کی رنگین عکسی تصویر بھی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط اور اعلےٰ کاغذ پر طبع کی گئی ہے ❖

قیمت مجلد ۸ روپے ❖ **قیمت بلا جلد** ۷ روپے

تحریر فی اصول التفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل القرآن علی محمد رسولہ علیہ السلام ھدایۃ للانام
والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد قد ھدانا بہ الی الاسلام وعلیٰ آلہ واصحابہ الیٰ یوم
القیام - اما بعد جب غدر کا زمانہ گذر گیا اور مسلمانوں پر بھی جو کچھ گذرنا تھا گذر گیا تو مجھ کو اپنی قوم کی اصلاح
کی فکر ہوئی - مَیں نے اس میں بہت غور کی اور ایک زمانہ دراز کے غور کے بعد فیصلہ کیا کہ اُن کی دینی و دنیوی
اصلاح بغیر اس کے کہ اُن کو علوم و فنون جدیدہ میں جو اَور قوموں کے سرمایۂ افتخار ہیں اور اُس زبان میں جو ہم
پر بمشیۃ اللہ حکومت کرتی ہے تعلیم نہ دی جاوے اور کسی طرح ممکن نہیں ÷

اس طریقہ سے دنیوی اصلاح کے ہونے کا تو ایسا مسئلہ تھا جس میں کچھ اختلاف نہیں ہوسکتا مگر یہ مسئلہ
کہ دینی اصلاح کے لئے بھی وہ مفید ہے معرض بحث میں تھا - بلکہ کوئی بھی اس کو تسلیم نہیں کرتا تھا کیونکہ یہ بات
ظاہر تھی کہ جن لوگوں نے اُن علوم میں توغل کیا خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان یا ہندو اُنہوں نے اپنے
مذہبی عقاید سے ہاتھ دھویا اس لئے کہ اُنہوں نے علوم جدیدہ کے مسائل کو سچ اور صحیح اور درست جانا اور
عقاید مذہبی کو جب اُس کے برخلاف پایا تو اُس کو غلط مانا ÷

یہ مشکل کچھ اسی وقت میں پیش نہیں آئی بلکہ اُس وقت بھی پیش آئی تھی جب کہ فلسفہ یونانی مسلمانوں
میں پھیلا تھا اور مذہبی اصول و قواعد کو اُس نے درہم و برہم کر دیا تھا - مگر اُس زمانہ کے علما نے اُس پر توجہ
کی اور علم کلام ایجاد کیا اور مذہب کی حمایت میں فلسفہ یونانی سے مقابلہ کیا اور اُنہوں نے صرف تین کام
کئے - یا تو مسائل مذہبی کو فلسفہ یونانی کے مطابق کر دکھایا - یا اُن کے دلائل کو غلط کر دیا - یا مشتبہ - مگر اس
زمانہ میں جو سخت مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفہ اور طبعیات یونانی بھی جس کی بنا پر اُس زمانہ کے علما
نے بہت سے مذہبی مسائل بھی قایم کئے تھے علوم جدیدہ سے غلط ثابت ہوئی ہے اور علوم جدیدہ کے دلائل
صرف قیاسی اور فرضی ہی نہیں رہے بلکہ تجربہ اور عمل نے اُن کو درجہ مشاہدہ تک پہنچا دیا ہے - یہاں تک کہ
عام طور پر یہ مسئلہ محقق مانا جانے لگا کہ علوم مذہب کے مخالف ہیں اور وہ مذہب کو اسی طرح جلا دیتے ہیں جیسے
چھوٹے پودے کو پالا ÷

جب کہ مَیں نے علوم جدیدہ و انگریزی زبان کو مسلمانوں میں رواج دینے کی کوشش کی تو مجھ کو

خیال ہوا کہ کیا درحقیقت وہ علوم مذہب اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ میں نے بقدر اپنی طاقت کے تفسیروں کو پڑھا اور بجز اُن مضامین کے جو علم ادب سے علاقہ رکھتے ہیں باقی کو محض فضول اور مملو بروایات ضعیف و موضوع اور قصص بے سر و پا سے پایا جو اکثر یہودیوں کے قصوں سے اخذ کئے گئے تھے۔

پھر میں نے بقدر اپنی استعداد و طاقت کے کتب اصول تفسیر پر توجہ کی اس امید سے کہ اُن میں ضرور کوئی ایسے اصول قائم کئے ہونگے جن کا ماخذ خود قرآن مجید یا کوئی اور ایسا ہوگا جس پر کچھ کلام نہ ہوسکے۔ مگر اُن میں بجز اس قسم کے بیان کے کہ قرآن مجید میں فلاں فلاں علم ہیں مثلاً فقہ و کلام و وعظ اور اسباب خفائے نظم قرآن و لطافت نظم اور بیان اختلاف تفاسیر کے یا شرح غریب قرآن کے اور کچھ نہیں ہے۔ جو زیادہ مبسوط ہیں اُن میں آیات مکی و مدنی صیفی و شتائی۔ یومی و لیلی اور اُن کے حروف و کلمات یا بحث مجاز وغیرہ کے کوئی ایسے اصول نہیں بتائے ہیں جن سے وہ مشکلات جو درپیش ہیں حل ہوسکیں *

پھر میں نے بقدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کی اور چاہا کہ قرآن ہی سے سمجھنا چاہیئے کہ اُس کا نظم کن اصولوں پر واقع ہوا ہے اور جہاں تک میری طاقت میں تھا میں نے سمجھا اور میں نے پایا کہ جو اصول خود قرآن مجید سے نکلتے ہیں اُن کے مطابق کوئی مخالفت علوم جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے اور نہ قرآن سے اگر راست بر سی من شاکر قرآن عظیم ام و ہذا اقول کما قال شاہ ولی اللہ۔ پھر میں نے انہیں اصول پر ایک تفسیر قرآن مجید کی لکھنی شروع کی جو اس وقت سورۃ النحل تک ہو چکی ہے *

اُس تفسیر کے چھپنے اور مشتہر ہونے پر لوگوں نے مخالفت کی اور اُس کی تردید میں کتابیں لکھیں۔ میں نے اُن پر کچھ التفات نہیں کیا اور نہ دیکھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے کیا لکھا ہوگا *

میرا ارادہ تھا کہ جب میری تفسیر پوری ہو جاویگی اور اول سے آخر تک قرآن بنظر غائر تمام ہو جاویگا اُس وقت میں دیباچہ تفسیر کا لکھونگا اور اُس میں وہ تمام اصول بیان کرونگا جو تفسیر لکھنے میں میں نے اختیار کئے ہیں مگر چونکہ اُس کو زمانہ دراز درکار تھا اس لئے میں نے خیال کیا کہ مقدم اصولوں کو جو میں نے تفسیر لکھنے میں اختیار کئے ہیں لکھ دوں اور باقی اصول اُس وقت پر منحصر رکھوں جب کہ تفسیر تمام ہو جاوے اور خدا کی مرضی اُن کے لکھنے پر ہو۔ پس یہ چند اصول ہیں جن پر میری تفسیر مبنی ہے اور جو ایک رسالہ کی صورت میں لکھے گئے ہیں اور اس لئے میں نے اس کا نام بھی **تحریر فی اصول التفسیر** رکھا ہے۔ اب میں اصولوں کو شروع کرتا ہوں۔ وبہ نستعین وھو نعم المولیٰ و نعم النصیر *

الاصل الاوّل

یہ بات مسلم ہے کہ ایک خدا خالق کائنات موجود ہے۔ وھو احد صمد لم یلد ولم یولد۔ واجب الوجود حی لا یموت۔ ازلی و ابدی۔ وھو علۃ العلل لجمیع المخلوقات علی ما کانت

وعلیٰ ما تکونت +

الاصل الثانی

یہ بھی مسلم ہے کہ اُس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیا مبعوث کئے ہیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم رسول برحق و خاتم المرسلین ہیں +

الاصل الثالث

یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے - منزل علی قلب محمد صلے اللہ علیہ وسلم اوبوحی الیہ وانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام - ماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی +

الاصل الرّابع

یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن مجید بلفظہٖ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل ہُوا ہے یا وحی کیا گیا ہے - خواہ یہ تسلیم کیا جاوے کہ جبریل فرشتہ نے آنحضرت تک پہنچایا ہے جیسا کہ مذہب عام علمائے اسلام کا ہے - یا ملکہ نبوت نے جو روح الامین سے تعبیر کیا گیا ہے آنحضرت کے قلب پر القا کیا ہے جیسا کہ میرا خاص مذہب ہے کما قلت ؎

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمیخواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

اور ان دونوں صورتوں کا نتیجہ متحد ہے اور اس لئے اس پر کوئی بحث ضرور نہیں ہے +

مگر مَیں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف مضمون القا کیا گیا تھا اور الفاظ قرآن آنحضرت صلعم کے ہیں جن سے آنحضرت نے اپنی زبان میں جو عربی تھی اُس مضمون کو بیان کیا ہے - والعجب العجب علےٰ ما قال الامام حجۃ الاسلام بل حجۃ اللہ فی الانام الشاہ ولی اللہ الدہلوی فے کتابہ التفہیمات الالٰہیہ حیث قال یمن ذلک (ای من التدلیات) القرآن العظیم و ذلک ان الفاظ القرآن انما ھی من اللغۃ العربیہ التی یعرفھا محمد صلے اللہ علیہ وسلم و یتحملھا والمعانی فایضۃ من الغیب تعلیماً لہ صلے اللہ علیہ وسلم تدلیاً الی الخلق فھم صار کلاماً الٰھیاً انما صار لان ارادۃ الخیر بالناس امدت فی حالہ علیہ السلام فھی التی جمعت الالفاظ و نظمھا ثم امد فی ھذا النظم فالبس لباساً کما البجیرون وصار یذلک تدلیاً الٰھیاً وسمی کلام اللہ (تفہیمات الٰہیہ صفحہ ۱۰۸) اللھم الا ان یقال ھذا بیان تدلیات

وھو رحمۃ اللہ علیہ اذ رج القرآن من حیث القاء المعانی تحت التدلبات ✤

مگر مجل شاہ صاحب کا عقل اور نفس الامر دونوں کے مخالف ہے خود قرآن مجید میں ہے کہ وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین (سورۃ شعراء آیت ۱۹۲-۱۹۴) دوسری جگہ فرمایا ہے ۔ انا انزلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون (سورۃ یوسف آیت ۲) اِس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن قلب آنحضرت پر عربی زبان میں ہُوا تھا نہ یہ کہ صرف معنی القا ہوئے تھے اور الفاظ جن سے وہ معنی تعبیر کئے گئے ہیں آنحضرت کے تھے ✤

نفس الامر کے اس لئے برخلاف ہے کہ خود تم اپنے نفس پر غور کرو کہ کوئی مضمون دل میں مجرد عن الالفاظ آہی نہیں سکتا اور نہ القا ہو سکتا ہے تخیل یا تصور کسی مضمون کا مستلزم اُن الفاظ کے تخیل یا تصور کا ہے جن کا وہ مضمون مدلول ہے مضمون کا الفاظ سے مجرد ہونا محالات عقلی سے ہے اور اس لئے قرآن مجید بلفظہ آنحضرت کے قلب پر القا ہُوا تھا اور وہی الفاظ اور اُسی نظم سے جس طرح القا ہوئے آنحضرت نے لوگوں کو پڑھ سُنایا ✤

الاصل الخامس

قرآن مجید بالکل سچ ہے کوئی بات اُس میں غلط یا خلاف واقع مندرج نہیں ہے خود قرآن مجید میں ہے وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (سورۃ فصلت السجدہ آیت ۴۱) اور حکایۃً کسی کا قول نقل کرنا صرف بغرض بیان یا بغرض تنزیل لوگوں کے اعتقادات کو جو منافی مقصد قرآن کے نہیں ہیں بلا بحث اُن کی اصلیت اور واقفیت کے تسلیم کرکے اُن پر استدلال کرنا یا بطور حجت الزامی کے پیش کرنا یا امور ظاہر الوقوع کو اُن کی ظاہری حالت پر بلا اُن کی اصلیت پر بحث کے بیان کرنا یا کلام غیر مقصود بالذات کا اثنائے کلام میں آنا قرآن مجید کی صداقت کی منافی نہیں ہے ✤

الاصل السادس

صفات ثبوتی اور سلبی ذات باری کے جس قدر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں سب سچ اور درست ہیں مگر اُن صفات کی ماہیت کا من حیث ھی ھی جاننا مافوق عقل انسانی ہے اس لئے وہ صفات جس کیفیت یا جس حیثیت سے ہمارے ذہن میں ہیں اور جن کو ہم نے ممکنات سے اخذ کیا ہے بعینہ و بحیثیتہ ذات باری پر جو واجب الوجود ہے منسوب نہیں کرسکتے اور صرف یہ کہتے ہیں کہ اُن صفات کے جو معنی مصدری ہیں وہ ذات باری میں موجود ہیں یعنی علم ایجاد ۔ قدرت ۔ حیات ۔ الی غیر ذلک

اور نیز اُن صفات کا ذات واجب الوجود یا علۃ العلل میں ہونا ضروری سمجھتے ہیں ❖

الاصل السّابع

صفات باری عین ذات ہیں اور وہ مثل ذات کے ازلی و ابدی ہیں اور مقتضائے ذات ظہور صفات سے بایّ وجہ کان وبایّ شان یکون۔ علمائے متکلمین کا یہ مذہب ہے کہ صفات باری عین ذات ہیں۔ اور نہ غیر ذات۔ مگر فلاسفۂ الٰہیین عین ذات سمجھتے ہیں اور اس لئے اُن کا ظہور مقتضائے ذات قرار دیتے ہیں مگر یہ سب نزاع لفظی ہے اور نتیجہ واحد۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ متکلمین نے جو امر اختیار کیا ہے اُس کے لئے حجت ساطع اور برہان قاطع نہیں ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ "ان نزاع الفلاسفۃ والمتکلمین فی ان اللہ تعالیٰ خالق بالاختیار او بالایجاب لیس فی معارک المعنی فی شیٔ۔ لما کان الارادۃ عند الفلاسفۃ عین الذات کان الابداع ایجابا ❖

الاصل الثامن

تمام صفات باری کی نامحدود اور مطلق عن القیود ہیں یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید۔ پس وہ اُن وعدوں کے کرنے کا مختار تھا جن کو اُس نے کیا ہے اور اُس قانون فطرت کے قائم کرنے کا بھی مختار تھا جس پر اُس نے کسی کائنات کو بنایا ہو یا اس موجودہ کائنات کو بنایا ہے یا آیندہ اور کسی صورت میں بنا دے مگر اُس وعدہ اور قانون فطرت میں جب تک کہ وہ قانون فطرت قایم ہے تخلف محال ہے اور اگر ہو تو ذات باری کی صفات کاملہ میں نقصان لازم آتا ہے۔ اور اُن وعدوں کا کرنا اور قانون فطرت پر کائنات قایم کرنا اُس کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے۔ اور اُن کے ایفا سے جس کا خود اُس نے اپنے اختیار سے وعدہ کیا ہے اُس کی قدرت کے مطلق عن القیود اور نامحدود ہونے کی معارض نہیں ہو سکتا ❖

قال اللہ تعالیٰ۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لھم مغفرۃ واجر عظیم۔ والذین کفروا وکذبوا باٰیٰتنا اولٰئک اصحاب الجحیم (ایت ۱۲ و ۱۳ سورۃ المائدہ ۵) ❖

وعد اللہ المنافقین والمنافقات والکفار نار جھنم خالدین فیھا (ایت ۶۹ سورۃ التوبہ ۹) ❖

وعد اللہ المومنین والمومنات جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین

فیہا (آیت ۲۰ سورۃ التوبہ ۹) *

جنات عدن التی وعد الرحمن عبادہ بالغیب انہ کان وعدہ ماتیا (آیت ۶۱ سورۃ مریم ۱۹) *

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات قل اتخذتم عند اللہ عہدا فلن یخلف اللہ عہدہ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون (آیت ۷۴ سورۃ البقرہ ۲) *

ونادی اصحاب الجنۃ اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فہل وجدتم ما وعد ربکم حقا قالوا نعم (آیت ۴۲ الاعراف ۷) *

ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینہم (آیت ۴۵ فصلت ۴۱ حم السجدہ) *

ان اللہ لا یخلف المیعاد (آیت ۷ آل عمران ۳) *

کان وعدہ مفعولا (آیت ۱۸ مزمل ۷۳) *

فاصبر ان وعد اللہ حق (۷۷ و ۵۵ سورۃ المؤمن ۴۰) *

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالے نے وعدہ کیا ہے اور تخلف وعدہ نہیں ہونے کا اور باوجود ان وعدوں اور اُن کی عدم تخلف کے جابجا اپنے تئیں قادر مطلق اور فعال لما یرید بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وعدہ اور عدم تخلف وعدہ اُس کے قادر مطلق ہونے اور اُس کی صفات کے مطلق عن القیود ہونے کی منافی نہیں ہے *

یہی حال قانون فطرت کا ہے جس پر کائنات بنائی گئی ہے پہلا قولی وعدہ ہے اور قانون فطرت عملی وعدہ اُس قانون فطرت میں سے بہت کچھ خدا نے ہم کو بتایا ہے اور بہت کچھ انسان نے دریافت کیا ہے گو کہ انسان کو ابھی بہت کچھ دریافت نہ ہوا ہو اور کیا عجب ہے کہ بہت کچھ دریافت نہ ہو۔ مگر جس قدر دریافت ہوا ہے وہ بلاشبہ خدا کا عملی وعدہ ہے جس سے تخلف قولی وعدہ کی تخلف کے مساوی ہے جو کبھی نہیں ہوسکتا *

خدا نے فرمایا ہے۔ انا کل شیء خلقناہ بقدر (آیت ۴۹ قمر ۵۴) یعنی جس اندازہ پر خدا نے چیزوں کو پیدا کیا ہے اُس سے تخلف نہیں ہوسکتا *

پھر خدا فرماتا ہے ولکل امۃ اجل فاذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون (آیت ۳۲ اعراف ۷) پس ممکن نہیں ہے کہ جو وقت جس چیز کے لئے مقرر ہے وہ کسی طرح ٹل سکے *

پھر خدا فرماتا ہے۔ فاقم وجہک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (آیت ۲۹ الروم ۳۰)

پس جس فطرت پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اُس کی تبدیل نہیں ہو سکتی ✦

دوسری جگہ فرماتا ہے - لا تبدیل لکلمات اللہ (آیت ۶۵ - یونس ۱۰) ہمارے نزدیک کلمات اللہ اور خلق اللہ دو مرادف الفاظ ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ فطرت میں تبدیل نہیں ہو سکتی ✦

پھر فرمایا ہے - ولن تجد لسنة الله تبدیلا (آیت ۶۲ احزاب ۳۳) پس جو طریق کہ خدا نے مقرر کیا ہے اُس میں تبدل نہیں ہو سکتا ✦

یہ تو عام ہدایتیں نسبت قانون فطرت کے تھیں مگر خدا نے ہم کو خاص خاص قانون فطرت بھی بتائے ہیں اور فرمایا ہے کہ لقد خلقنا الانسان من سلالة من طین - ثم جعلناہ نطفة فی قرار مکین - ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فکسونا العظام لحما ثم انشانٰه خلقا اخر - فتبارک اللہ احسن الخالقین (آیت ۱۲ - ۱۴ المؤمنین ۲۳) ✦

دوسری جگہ فرماتا ہے کہ - فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغیر مخلقة لنبین لکم ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی ثم نخرجکم طفلا ثم لتبلغوا اشدکم ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئا (آیت ۵ - الحج ۲۲) ✦

ایک جگہ فرماتا ہے - ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة ان فی ذلک لایات لقوم یتفکرون (آیت ۲۰ - الروم ۳۰) ✦

علاوہ ان کے اور بہت سی آیتیں اسی مضمون کی ہیں جن میں ہم کو قانون فطرت یہ بتایا ہے کہ جوڑے سے یعنی زن و مرد سے اور نطفہ کے ایک مدت معین تک مقر جگہ میں رہنے سے انسان پیدا ہوتا ہے - پس اس قانون فطرت کے برخلاف اسی طرح نہیں ہو سکتا جس طرح کہ قولی وعدہ کے برخلاف نہیں ہو سکتا ✦

ایک جگہ فرمایا ہے - وآیة لهم اللیل نسلخ منه النهار فاذا هم مظلمون والشمس تجری لمستقر لها ذلک تقدیر العزیز العلیم والقمر قدرناه منازل حتی عاد کالعرجون القدیم لا الشمس ینبغی لها ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النهار وکل فی فلک یسبحون (آیت ۳۷ - ۴۰ سورہ یٰسین ۳۶) ✦

پس یہ نہیں ہو سکتا کہ سورج خلاف قانون فطرت جس طرح کہ وہ چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے کسی کے لئے چلنے سے ٹھہر جاوے اور چاند اپنی منزلیں طے کرتا ہوا جس طرح ہلال ہوا تھا پھر ہلال نہ ہو - نہ یہ

ہوسکتا ہے کہ سورج اور چاند ٹکرا جاویں۔ نہ یہ ہوسکتا ہے کہ رات دن گڈمڈ ہوجاویں۔ اور جب کہ یہ ثابت ہوگیا ہے کہ سورج کا چلنا زمین کی حرکت سے دکھائی دیتا ہے تو اسی آیت سے لازم آتا ہے کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ زمین حرکت کرنے سے کسی وقت کسی کے واسطے ٹھیر جاوے ایسا ہونا خلاف قانون فطرت کے ہے اور وہ ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے ؛

پھر خدا نے ابراہیم کی زبان سے یہ قانون قدرت بتلایا کہ فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بها من المغرب فبهت الذی کفر (آیت ۲۶ البقر ۲) پس یہ بات غیر ممکن ہے کہ جب تک یہ قانون فطرت قایم ہے سورج مشرق سے طلوع نہ کرے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ناممکن ہے کہ زمین مغرب سے مشرق کی طرف اپنے محور پر گردش نہ کرے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے ؛

ایک جگہ ابرہیم کے قصہ میں فرمایا ہے۔ فما کان جواب قومه الا ان قالوا اقتلوه او حرقوه فانجاه اللہ من النار (آیت ۲۳ عنکبوت ۲۹) فانجاه اللہ من النار سے ثابت ہوتا ہے کہ احراق خاصہ نار کا ہے ؛

ایک اور جگہ تمثیل میں فرمایا ہے۔ فاصابها اعصار فیه نار فاحترقت (آیت ۲۶۸ البقر ۲) پس ان دونوں آیتوں سے خدا نے ہم کو قانون فطرت بتایا کہ آگ جلا دینے والی ہے پس جب تک یہ قانون فطرت قایم ہے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے ؛

ایک جگہ موسیٰ کے قصہ میں فرمایا ہے کہ۔ واذ فرقنا بکم البحر فانجینکم واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون (آیت ۴۷ البقر ۲) ؛

ایک جگہ فرمایا ہے۔ فاغرقناهم فی الیم بانهم کذبوا بایاتنا وکانوا عنها غافلین (آیت ۱۳۲ اعراف ۷) ؛

ایک جگہ فرمایا ہے۔ وقوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقناهم وجعلناهم للناس آیه (آیت ۳۹۔ فرقان ۲۵)

ان آیتوں میں اور ان کی مثل بہت سی آیتوں میں خدا نے یہ قانون فطرت بتایا کہ پانی میں بوجھل چیز ڈوب جاتی ہے پس جب تک یہ قانون قدرت قایم ہے پانی سے یہ فطرت معدوم نہیں ہوسکتی اس کا معدوم ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے ؛

ایک جگہ خدا فرماتا ہے۔ هو الذی ارسل الریاح بشرا بین یدی رحمته وانزلنا من السماء ماء طهورا لنحیی به بلدة میتا ونسقیه مما خلقنا انعاما واناسی کثیرا (آیت ۵۰

فرقان ۲۵) پس یہ نہیں ہو سکتا کہ بغیر بادل کے پانی برسے اور فوائد مبینہ کے جو خدا نے بیان کئے ہیں وہ اُس سے حاصل نہ ہوں۔ اُن کے خلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کا خلاف ہونا ناممکن ہے ✣

یہ چند آیتیں ہم نے بطور مثال کے لکھی ہیں ان کے سوا اور بہت کچھ قرآن مجید میں آیا ہے اور خدا نے ہم کو قانون فطرت بتایا ہے ✣

علاوہ اس کے انسان نے اُن چیزوں کے تجربہ سے جو خدا نے پیدا کی ہیں اُس کی مخلوقات کے قانون فطرت کو معلوم کیا ہے اور بے شبہ وہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے مخلوقات کے تمام قوانین فطرت کو دریافت کر لیا ہے اُن میں سے بہت سے ایسے محقق ہیں جو درجہ یقین کو پہنچ گئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ابھی درجہ یقین کو نہیں پہنچے۔ اور معلوم نہیں کہ ابھی تک کس قدر نامعلوم ہیں ✣

جو کچھ کہ ہم نے قرآن مجید کی آیتوں سے قانون فطرت بتایا ہے اُس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قانون فطرت عام نہیں ہے بلکہ اُس میں مستثنیات بھی ہیں لیکن اُس کے ذمہ اُن مستثنیات کا قرآن مجید سے ثابت کرنا لازم ہوگا۔ مگر ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ قرآن مجید سے اُس قانون فطرت میں مستثنیٰ ہونا ثابت نہیں ہوتا جس کو ہم آیندہ بیان کرینگے ✣

جو قانون قدرت کہ انسان نے تجربہ سے قایم کیا ہے اُس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ جب کہ تمام قانون فطرت ابھی تک نامعلوم ہیں تو ممکن ہے کہ کوئی قانون فطرت ایسا ہو جس سے مستثنیات ثابت ہوتے ہیں مگر یہ کہنا کافی نہیں ہے اس لئے امکان عقلی تو کوئی شے وجودی نہیں ہے صرف ایک خیال غیر محقق الوقوع ہے۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔ علاوہ اس کے امکان کا اطلاق اُس چیز پر ہوتا ہے جو کبھی ہو اور کبھی نہ ہو لیکن جس چیز کا کبھی وقوع ثابت نہ ہُوا ہو تو اُس پر امکان کا اطلاق غلط اور محض سفسطہ ہے۔ غرضکہ جو شخص قانون فطرت میں مستثنیات کا مدعی ہو اُس کو اُن مستثنیات کے کبھی واقع ہونے کو ثابت کرنا بھی لازم ہے ✣

الاصل التاسع

قرآن مجید میں کوئی امر ایسا نہیں ہے جو قانون فطرت کے برخلاف ہو واما المعجزات فقد ثبت من القرآن انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ما ادعی باحد من المعجزات وقال علیہ السلام انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد وقال علیہ السلام فی موضع اٰخر انما انا بشیر و نذیر۔ وھٰذا قال المحقق الاجل الشاہ ولی اللہ فی التفھیمات الالٰھیہ ولم یذکر اللہ سبحانہ شیئاً من المعجزات فی کتابہ ولم یسر الیھا قط ✣

مگر شاہ صاحب کے اس قول سے یہ بات سمجھنی مشکل ہے کہ اُن کی مراد اس نفی سے کیا ہے آیا اُن کا یہ مطلب ہے کہ قرآن مجید میں کسی نبی کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں ہے یا صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں ہے۔ ہم تنزلاً قبول کرتے ہیں کہ اُن کا مطلب صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر نہ ہونے سے ہے۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہئیے کہ اُن کا قول نسبت معجزات کے کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

فاللہ سبحانہ احدی مجرد من الصفات فی مرتبہ واحدۃ ولحاظ واحد ومقرون بالصفات فی مرتبہ اخری ولحاظ اخر وعلی ھذا القیاس ان مواطن نفس الامر متفاوتہ منھا مواطن الاسباب وھیہ العلۃ والمعلول فقط والسبب والمسبب فحسب ومن المتحقق عندنا انہ لم یترک الاسباب قط ولن یترک ولن یجد لسنۃ اللہ تبدیلا وانما المعجزات والکرامات امور اسبابیہ غلب علیھا السبوغ فتابیب سائر الاسبابیات (تفہیمات الٰہیہ صفحہ ۵۳) ✤

پس شاہ صاحب معجزات کو مسبب باسباب سمجھتے ہیں اور اس قول پر معجزات کا وقوع قانون فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور ہم کو اس میں کچھ بحث نہیں ہے۔ بحث اس میں ہے جب کہ معجزات کو مافوق الفطرت قرار دیا جاوے جس کو انگریزی میں "سُپر نیچرل" کہتے ہیں اور اس سے انکار کرتے ہیں اور اُن کا وقوع ایسا ہی ناممکن قرار دیتے ہیں جیسے کہ قولی وعدہ کا ایفا نہ ہونا۔ اور علانیہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے امر کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ہے جو مافوق الفطرت ہو اور جس کو تم معجزہ قرار دیتے ہو اور اگر بفرض محال خدا کی قدرت کے حوالہ پر اُس کو تسلیم بھی کریں تو وہ ایک بیفائدہ امر ہوگا جو نہ مثبت کسی امر کا ہے اور نہ مسکت للخصم ✤

بیشک ہمارے بعض اخوان کو اس پر غصہ آویگا اور قرآن مجید میں سے بعض امور کو معجزہ قرار دیکر اور اُن کو مافوق الفطرت سمجھ کر پیش کرینگے اور کہینگے کہ قرآن مجید میں معجزات مافوق الفطرت موجود ہیں ✤

ہم اُن کے اُس قول کو نہایت ٹھنڈے دل سے سُنینگے اور عرض کرینگے کہ جو آیت قرآن مجید کی آپ پیش کرتے ہیں اور اُس سے معجزات مافوق الفطرت پر استدلال فرماتے ہیں آیا اُس کے کوئی دوسرے معنی بھی ایسے ہیں جو موافق زبان و کلام عرب کے اور موافق محاورات اور استعمالات اور استعارات قرآن مجید کے ہو سکتے ہیں اگر نہ ہو سکتے ہوں تو ہم قبول کرینگے کہ ہمارا یہ اصول غلط ہے اور اگر ہو سکتے ہوں تو ہم نہایت ادب سے عرض کرینگے کہ آپ اس بات کو ثابت نہیں کر سکے کہ قرآن مجید میں معجزات مافوق الفطرت موجود ہیں۔ اگر وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مفسرین کے اقوال پیش کریں یا یہ کہیں کہ تیرہ سو برس سے کسی نے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین یا علمائے مجتہدین و مفسرین نے یہ معنی نہیں کہے بلکہ خدا بھی یہ معنی نہیں سمجھا جو تم کہتے ہو تو ہم ادب سے عرض کرینگے کہ اس دلیل سے ہم کو معاف رکھئے اور صرف یہ بتائیے کہ

قرآن مجید کے الفاظ سے اور اُن محاورات اور استعارات سے جو قرآن مجید میں آئے ہیں وہ معنی جو ہم نے
بیان کئے صحیح ہوتے ہیں یا نہیں۔ غرضکہ جب تک وہ ہم کو ثابت نہ کریں کہ اُس آیت کے جو انہوں نے
پیش کی ہے اور کوئی معنی بجز اُس کے جو وہ بیان کرتے ہیں ہو ہی نہیں سکتے اور وہ آیت مافوق الفطرت
ہونے پر نص صریح ہے اُس وقت تک ہم اُس کا مافوق الفطرت ہونا تسلیم نہیں کرینگے لیکن کسی آیت
کے کوئی معنی بیان کرنا اور اُس کی صحت کے لئے خدا کے قادر مطلق ہونے پر حوالہ کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ
ہمارے نزدیک خدا بموجب اپنے وعدہ کے سب کام اُس قانون قدرت کے مطابق کرتا ہے جو اُس نے
بنایا ہے ◆

واما ماهية نفس الانسان و القوى المودعة فيها وما يكون لها بعد الموت من حشر
الاجساد وغيرها وكيف يكون يوم الآخرة وما حقيقة الجنة والجحيم وما كيفية نعيمها
وعقابها فكلها خارجة عن فهم الانسان لانها ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر
على قلب بشر ولهذا سبحانه جل شانه بينها بمثال يليق بفهم الانسان و بين نعيمها على
افضل ما يرغب به الانسان و عقابها على اكبر ما يدهش به فكلها ليست بخارجة عن
قانون الفطرة بل كلها امثال واستعارات لاحوالها ونعيمها وعقابها لكي يتخيل بها
الانسان نوع تخيل ما فيه وما بعد الموت وما نعيمها وما عقابها وهذا سياق الكلام
المجيد فى ضرب الامثال فى امور شتى لتفهيم الانسان و توضيح البيان بقدر الامكان
ولا يخفى هذا على من قرأ القرآن بالامعان فتدبر ◆

هذا قولى فى الفطرة التى قدرها الله سبحانه تعالى لكننا لا نجد صفات الله
بجديل نقول ان يشاء يذهب السموات والارض وما بينهما لا جل اجل لها ويأت
بآخرين على فطرت يشاء كما قال الله تعالى ولله ما فى السموٰت وما فى الارض و
كفى بالله وكيلا ان يشاء يذهبكم ايها الناس و يأت بآخرين وكان الله على ذلك
قديرا (آيت ۱۳۲ - نساء ۴) ◆

الاصل العاشر

قرآن مجید جس قدر نازل ہوا ہے تمام موجود ہے نہ اُس میں سے ایک حرف کم ہوا ہے نہ زیادہ ہوا ہے
وتواترت عليه جيل بعد جيل فى قرن بعد قرن الى زماننا هذا وقال الله تعالى
انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون (آيت ۹ - الحجر ۱۵) ◆

الاصل الحادی عشر

ہر ایک سورہ کی آیات کی ترتیب میرے نزدیک منصوص ہے اذا نزلت الآیات اشار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انها من سورۃ کذا بعد اٰیۃ کذا وحفظها الحفاظ فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی هذا الترتیب ولم یزل الصحابہ والتابعون ومن بعدهم یقرؤن القرآن علی هذا فثبت ترتیب الآیات علی هذا المنوال من التواتر جیلا بعد جیل وقرنا بعد قرن الی زماننا هذا۔ اور یہی قول شاہ ولی اللہ صاحب کا ہے جہاں فوز الکبیر میں انہوں نے فرمایا ہے کہ "در زمان آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہر سورتے علیحدہ محفوظ ومضبوط بود"۔

الاصل الثانی عشر

قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ نہیں ہے یعنی اسکی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوئی۔ ولیس فی القرآن نوع من الاشارۃ علی هذا واما انه ما ننسخ من آیۃ او ننسها نات بخیر منها او مثلها فمتعلق بشرائع ما قبل الاسلام لا بآیات القرآن ولا شك ان اهل الکتاب من الیهود والنصاری والمشرکین لا یودون من احکام الاسلام ما خالف شرائعهم فذکره سبحانه تعالی اولا وقال ما یود الذین کفروا من اهل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللہ یختص برحمته من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ ثم قال ما ننسخ من آیۃ او ننسها نات بخیر منها او مثلها الم تعلم ان اللہ علی کل شئ قدیر (آیت ۹۹ - ۱۰۱ البقرہ ۲) فظاہر ان النسخ المذکور فی الآیۃ المذکورۃ متعلق بشرائع ما قبل الاسلام لا بآیات القرآن ولا دلیل علی ان المراد بلفظ الآیۃ فی قوله واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ (آیت ۱۰۳ - النحل ۱۶) آیات القرآن ولا دلیل علی ان قوله یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعنده ام الکتاب (آیت ۳۹ الرعد ۱۳) متعلق بنسخ آیات القرآن۔ فتدبر۔

الاصل الثالث عشر

قرآن مجید دفعۃً واحدۃً نازل نہیں ہوا ہے بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے۔ قال اللہ تعالے وقرآنا فرقناه لتقراه علی الناس علی مکث ونزلناه تنزیلا (آیت ۱۰۷ - بنی اسرائیل ۱۷) وقتاً فوقتاً واقعات کے پیش آنے سے روح القدس یعنی ملکہ نبوت کو انبعاث ہوا اور اس کے سبب سے وحی نازل ہوئی پس مختلف اوقات کے کلام کا مجموعہ ہے جو خدا نے وقتاً فوقتاً بمقتضائے اس وقت کے نازل کیا ہے۔ اور

بطور ایک تصنیف کی ہوئی کتاب کے نہیں ہے جس میں اول مصنف ابواب و فصول کو تقسیم کر کے اُس کے مضامین کو ترتیب خاص سے مرتب کرتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فوز الکبیر میں لکھتے ہیں کہ "قرآن را بروش متون مبوب و مفصل ساختہ نشدہ است تا ہر مطلبے ازاں در بابی یا فصلے مذکور شود بلکہ قرآن را مانند مجموعہ مکتوبات فرض کن چنانکہ بادشاہان برعایائے خود بحسب اقتضائے حال مثال ہا می نویسند و بعد زمانے مثال دیگر و علیٰ ہذا القیاس تا آنکہ امثلہ بسیار جمع شود شخصے آں امثلہ را تدوین کند مجموعہ مرتب سازد ہمچنیں ملک علی الاطلاق برپیغمبر خود صلے اللہ علیہ وسلم برائے ہدایت بندگان بحسب اقتضائے حال سورۃ بعد سورۃ نازل فرمود و در زمان آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہر سورتے علیحدہ محفوظ و مضبوط بود اما سورتہا تدوین نفرمودند و در زمان حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہمہ سورتہا در یک مجلد بترتیب خاص جمع نمودند و ایں مجموع بمصحف مسمی شد (فوز الکبیر صفحہ ۲۳)۔

قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا اور وقتاً فوقتاً واقعات کے پیش آنے پر ملکۂ نبوت کا انبعاث ہونا اور وحی کا نازل ہونا ایک طبعی امر ہے۔ انسان کے دماغ میں متعدد قسم کے علوم و فنون کا ملکہ موجود ہوتا ہے مگر بغیر محرک کے وہ ملکہ تحریک میں نہیں آتا۔ پس قرآن مجید کا اس منوال پر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے جس کے مضامین کو مصنف پہلے سے سوچ کر اور اپنی مرضی کے موافق کتاب مرتب کرتا ہے۔

قرآن مجید کے اوقات مختلفہ کے کلام کے مجموعہ ہونے پر یہ بھی دلیل ہے کہ جس طرح مختلف اوقات میں کلام کرتے ہیں اور اُس وقت بمقتضائے محل اور بغرض مزید تنبیہ اشخاص کے اُس کلام کے دوہرانے کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی پہلے وقت میں کہا گیا تھا۔ بعض مضمون کو جو مہتم بالشان ہیں ہر دفعہ کے کلام میں بار بار جتلانا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ کسی قصہ کی تلمیح کرنی ہوتی ہے بعض دفعہ کسی قصہ کے اُسی جزو کا بیان کافی ہوتا ہے جو اُس وقت کے کلام کے لئے ضرور ہے۔ بعض دفعہ کسی قصہ کو بالاجمال اور بعض دفعہ زیادہ تفصیل سے بیان کرنا مقتضائے کلام ہوتا ہے غرضکہ ہر ایک امر جو مختلف اوقات میں کلام کرنے میں پیش آتا ہے وہ سب قرآن مجید میں پایا جاتا ہے اور یہ کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ قرآن ایک تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ اور جب کہ اُس میں صرف کلمات وحی ہی لکھے گئے ہیں تو مبادی کلام جس سے وحی متعلق ہے اُس میں شامل نہیں ہیں اور اس سبب سے بعض مقامات قرآن مجید میں بلکہ متعدد ویسے ہیں کہ ایک مقصد بیان کرتے کرتے دوسرا مطلب بیان ہونے لگا ہے جو ایک نیا یا اجنبی معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے بلکہ مبادی کلام کے مندرج نہ ہونے سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ بعض دفعہ قرینہ حالیہ کسی کلام کے مقتضا پر دلالت کرتا ہے اور متکلم بغیر اس کے کہ اپنے کلام میں اُس کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت سمجھے اپنا کلام شروع کر دیتا ہے اور جب کہ صرف متکلم ہی کا کلام بلا بیان اُس قرینہ حالیہ کے لکھا جاوے تو جو دلالت کلام کی قرینہ حالیہ سے پائی جاتی تھی وہ اس میں نہیں ہوتی اور اس لئے اُس کی تلاش یا تعیین کی ضرورت پڑتی

ہے۔ اسی بنیاد پر علمائے اسلام نے آیات کی شان نزول تفتیش کرنے پر توجہ کی ہے جس کی بنیاد فقط روایات ضعیف پر ہے اور اس لئے زیادہ پُرامن طریقہ یہ ہے کہ جہاں اُس کی ضرورت ہو حتی المقدور صرف قرآن مجید کے سیاق و سباق کلام سے اور اُس کی طرز ادائے کلام سے اُس کو تلاش کیا جاوے اور جو اصول کہ قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اُن کو ہر ایسے مقام پر ملحوظ رکھا جاوے ✤

الاصل الرابع عشر

موجودات عالم اور مصنوعات کائنات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وہ سب کا سب ہو یا بحیثیۃ من الحیثیات مطابق واقع ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اُس کا قول اُس کی مصنوعات کے مخالف ہو یا مصنوعات اس کے قول کی مخالف ہوں۔ بعض جگہ ہم نے قول کو ورڈ آف گاڈ اور اُس کی مصنوعات کو ورک آف گاڈ سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ورڈ آف گاڈ اور ورک آف گاڈ دونوں کا متحد ہونا لازم ہے۔ اگر ورڈ۔ ورک کے کسی حیثیت سے مطابق نہیں ہے تو ایسا ورڈ۔ ورڈ آف گاڈ نہیں ہوسکتا ✤

الاصل الخامس عشر

باوجود اس بات کے تسلیم کرنے کے کہ قرآن مجید بلفظہ کلام خدا ہے مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اُس کے معنی اُسی طرح پر لگائے جاوینگے جیسے کہ ایک نہایت فصیح عربی زبان میں کلام کرنے والے کے معنی لگائے جاتے ہیں اور جس طرح کہ انسان استعارہ و مجاز و کنایہ و تشبیہ و تمثیل اور دلائل لمی و اقناعی و خطابی و استقرائی و الزامی کو کام میں لاتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں بھی استعارہ و مجاز و کنایہ و تشبیہ و تمثیل اور دلائل لمی و اقناعی و خطابی و استقرائی و الزامی سب موجود ہیں علاوہ اس کے ہم کو اُن اصول اور اُن قولی اور عملی وعدوں پر غور کرنا ضرور ہوتا ہے جو خود خدا نے کئے ہیں اور اُس طرز کلام اور طریق استعمال الفاظ کو دیکھنا لازم ہوتا ہے جو مخصوص قرآن مجید سے ہے اور جس کے لئے ہم کو ایک آیت کی تفسیر بیان کرنے میں دوسری آیت سے استمداد لینی پڑتی ہے ✤

ہر ایک کلام کے معنی قرار دینے میں وہ کلام کسی کا ہو خواہ خدا کا یا انسان کا مندرجہ ذیل باتوں کا محقق ہونا ضرور ہے ✤

(۱) جس لفظ کے جو معنی قرار دئے گئے ہیں اُس کی نسبت جاننا چاہیئے کہ وہ لفظ اُنہیں معنوں میں وضع کیا گیا ہے ✤

(۲) اس بات کا قرار دینا کہ جن معنوں میں وہ لفظ وضع کیا گیا تھا اُن معنوں سے کسی دوسرے معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے ✤

(۳) اگر وہ لفظ مشترک المعنی ہے تو اس بات کا قرار دینا لازم ہے کہ وہ اُن مشترک معنوں میں سے کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے ۔ضمائر جن کا مرجع مختلف ہوسکتا ہو وہ بھی اتفاقاً مشترک المعنی میں داخل ہیں ❖

(۴) اس بات کو قرار دینا ضرور ہے کہ وہ اُن اصلی معنوں میں بولا گیا ہے جو اُس سے متبادر ہوتے ہیں یا مجازی معنوں میں ❖

(۵) اس بات کو قرار دینا کہ اُس کلام میں کوئی شے مضمر ہے یا نہیں ❖

(۶) اس بات کو قرار دینا ضرور ہے کہ جن معنوں پر وہ لفظ دلالت کرتا ہے اُس میں کوئی تخصیص بھی ہے یا نہیں ❖

(۷) یہ بات دیکھنی لازم ہے کہ جو معنی اُس لفظ کے قرار دئے گئے ہیں اُس پر کوئی عقلی معارضہ بھی ہے یا نہیں ۔ اگر ہے تو وہ معنی اُس کے صحیح نہ ہونگے ۔ اور یہ بات کوئی نئی نہیں ہے بلکہ تمام علمائے اسلام نے سیکڑوں مقاموں میں اس کی پیروی کی ہے ۔ مثلاً خدا کے عرش پر استوا ہونے میں ۔ اُس کے ہاتھ اور مُنہ اور ساق ہونے میں اور مثل ان کے اور بہت سے لفظوں کے اصلی معنی اس لئے نہیں لئے گئے کہ دلیل عقلی اُن کے برخلاف تھی پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اور الفاظ کے ایسے معنی جو دلیل عقلی سے محال ہیں یا خود اُس قانون فطرت کے مخالف ہیں جو خود خدا نے بیان کیا ہے یا تجربہ کے مخالف ہیں چھوڑ کر دوسرے معنی نہ لئے جاویں ❖

اس میں کچھ شک نہیں کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں الفاظ کے معنی معین و مستعمل تھے اور اگر ہم تسلیم کرلیں کہ وہی معنی تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں تو اس سے صرف امر اول کا تصفیہ ہو جاتا ہے ۔ مگر اس بات کا تصفیہ کہ وہ لفظ دوسرے معنوں میں مستعمل نہیں ہوا اور اگر وہ مشترک المعنی ہے تو کون سے معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور وہ مجازی معنوں میں مستعمل ہوا ہے یا نہیں الٰے غیر ذالک نہیں ہوسکتا پس جب تک کہ ساتویں امر کی پیروی نہ کی جاوے جس کی پیروی بہت سے مقاموں میں علمائے اسلام نے کی ہے نہ کسی انسان کے کلام کے معنی صحیح طور پر قرار دئے جاسکنے میں نہ خدا کے کلام کے ❖

قرآن مجید کے معنی قرار دینے میں ہم کو ایک اور مشکل یہ پیش آتی ہے کہ عرب جاہلیت کا کلام بہت کم ہم تک پہنچا ہے اور کچھ شک نہیں کہ اُس میں سے بہت بڑا حصہ ضائع ہوگیا ہے اور علمائے علم ادب اس بات کو خود تسلیم کرتے ہیں ۔ پس یہ امر قابل یقین نہیں ہے کہ اہل لغت اور علمائے علم ادب نے جو معنی الفاظ کے لغت کی کتابوں میں اور اُس کے محاورات اور استعارات کو لکھا ہے اُن کے سوا اور کوئی معنی اور استعارات زمانہ جاہلیت اور خود زمانہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم میں نہ تھے ❖

بلاشبہ اس امر میں ہم مجبور ہیں اور بجز اس کے کہ قرآن مجید کے معنی قرار دینے میں موجودہ لغت کی کتابوں اور علم ادب کی کتابوں کی طرف رجوع کریں اور کچھ چارہ نہیں ہے لیکن اگر بالفرض ہم کو قرآن مجید سے کسی لفظ کا ایسے طور پر استعمال یا ایسے معنوں میں استعمال بطور یقین کے ثابت ہو جاوے جو کتب لغت یا علم ادب

کی کتابوں میں نہ ملے تو ہم اُس کے اختیار کرنے میں کوئی وجہ تامل نہیں پاتے اور ایسا کرنے میں ہم قرآن مجید کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہ کرینگے جو کلام جاہلیت کے ساتھ کیا ہے کیونکہ ہماری تمام لغت کی کتابوں اور علم ادب کی کتابوں کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ ہم نے وہ معنی یا محاورہ کلام جاہلیت سے اخذ کیا ہے ✤

(۸) قرآن مجید کے معنی قرار دینے میں ہم کو ایک اور امر کا تصفیہ بھی لازم ہے کہ جس کلام پر ہم استدلال کرتے ہیں آیا وہ کلام مقصود ہے یا غیر مقصود کیونکہ اگر وہ کلام غیر مقصود ہے تو اس پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ کلام غیر مقصود قرآن مجید میں بہت جگہ پایا جاتا ہے اور انسان کے کلاموں میں بھی کلام غیر مقصود ہوتا ہے جس پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً خدا کا یہ فرمانا کہ ان الذین کذبوا بایاتنا واستکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (آیت ۳۸ - اعراف ۷) اس سے استدلال نہیں ہو سکتا کہ کسی وقت میں اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نکلجاویگا کیونکہ وہ کلام غیر مقصود ہے اور صرف اُن لوگوں کے جنہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا ہے جنت میں داخل ہونے کے عدم امکان کا بیان ہے۔ اسی طرح اس آیت سے آسمان کے دروازوں کے ہونے پر بھی استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ کلام اس مقصد کے لئے نہیں بولا گیا ہے بلکہ صرف خدا کی رحمت سے محروم رہنے کے مقصد سے بولا گیا ہے۔ اسی طرح کلام غیر مقصود کی بہت سی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور اُن سے اُن کے اصلی معنوں پر استدلال نہیں ہو سکتا ✤

اِسی کے ضمن میں ایک بہت بڑی بحث تاویل کی آتی ہے یعنی جب کسی لفظ کے اصلی معنی نہیں بن سکتے تو دوسرے معنی اختیار کرتے ہیں جس سے قول قایل کا صحیح ہو جاوے۔ مگر میں اس مقصد سے تاویل کو قرآن مجید میں جائز نہیں سمجھتا اور میری رائے یہ ہے کہ تاویل اُس کو کہتے ہیں جب کہ یہ متحقق ہو جاوے کہ قایل کا اس کلام سے درحقیقت یہ مطلب تھا اور وہ مقصد صحیح نہ ہو اور اُس وقت اُس کلام کے دوسرے معنی اختیار کئے جاویں تا کہ وہ کلام صحیح ہو جاوے۔ اور اگر قایل کا درحقیقت وہی مقصد ہو جو بعد تاویل کے قرار دیا گیا ہے تو وہ تاویل نہیں ہے بلکہ قایل کے اصلی مقصد کا ظاہر کرنا ہے۔ مثلاً قایل کا یہ قول کہ "زید اسد" اگر قایل کا درحقیقت لفظ اسد سے حیوان معروف مراد ہو اور وہ زید پر صادق نہ آوے اور کوئی شخص خلاف مقصد اُس قایل کے اس کے معنی شجاعت کے لے تو درحقیقت تاویل ہے۔ اور اگر قایل نے اسد کے لفظ سے خود ہی شجاعت مراد لی ہو تو اسد سے شجاعت مراد لینا تاویل نہیں ہے بلکہ قایل کے اصلی مطلب کا اظہار ہے۔ اسی طرح جب ہم قرآن مجید کے کسی لفظ کے اصلی معنی نہیں لیتے بلکہ مجازی معنی لیتے ہیں تو ہم اُس کو تاویل نہیں کہتے اس لئے کہ ہم بقدر اپنی طاقت کے یہی سمجھتے ہیں کہ خدا نے اِنہی مجازی معنوں میں اِس لفظ کو استعمال کیا ہے ✤

قرآن مجید کے معانی بیان کرنے میں سب سے زیادہ دھوکا انسان کو اُن مقامات پر پڑتا ہے جہاں قرآن میں قصص انبیاے سابقین بیان ہوئے ہیں۔ انبیاے سابقین کے قصے عہد عتیق کی کتابوں میں بھی آئے

ہیں اور علمائے یہود نے بھی قصص انبیا مستقل کتابوں میں لکھے ہیں جن میں بہت کچھ باتیں دور از عقل و خلاف قانون فطرت مندرج ہیں وہ قصے مشہور تھے اور ہمارے علما بھی اُن سے مانوس تھے اور اُن کے عجائبات کو جو قانون فطرت کے برخلاف تھے معجزات قرار دیتے تھے وہ قصے قرآن میں بھی بیان ہوئے ہیں اور وہ بیان بہت کچھ اُسی کے مشابہ اور مماثل ہے جو اُن قصوں کی نسبت بیان ہوا ہے - مگر قرآن مجید کے الفاظ اُن قصوں میں اس طرح آئے ہیں کہ اُن سے وہ باتیں جو دور از عقل اور خلاف قانون قدرت اُن قصوں میں مشہور تھیں اُن کا ثبوت نہیں ہوتا - ہمارے علمائے متقدمین نے اس بات پر خیال نہیں کیا بلکہ جہاں تک اُن سے ہو سکا قرآن مجید کے الفاظ کو اُن قصوں پر بعینہٖ حمل کرنے پر کوشش کی اور اس کے کئی سبب تھے ؂

اول - یہ کہ اُن قصوں کی کیفیت مشہورہ اُن کے دل میں بسی ہوئی تھی اس لئے قرآن مجید کے اُن الفاظ پر اُنہوں نے توجہ نہیں کی ؂

دوسرے - یہ کہ اُن کے پاس ہر ایک چیز گو کہ وہ کیسی ہی قانون فطرت کے برخلاف کیوں نہ ہو خدا کی قدرت عام کے تحت میں داخل کر دینے کا نہایت سہل طریقہ تھا اور اس سبب سے اُن الفاظ کی حقیقت پر غور کرنے کو توجہ مائل نہیں ہوتی تھی ؂

تیسرے - یہ کہ اُن کے زمانہ میں نیچرل سینز نے ترقی نہیں کی تھی اور کوئی چیز اُن کو قانون فطرت کی طرف رجوع کرنے والی اور اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی - پس یہ اسباب اور مثل اِن کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ اُن کی کافی توجہ قرآن مجید کے اُن الفاظ کی طرف نہیں ہوئی ؂

مثلاً اُن کے زمانہ میں یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ طوفان نوح کا تمام دنیا میں عام ہونا اور پانی کا اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہو جانا محالات سے اور خلاف واقع ہے اور اس لئے اُن کے خیال میں یہ بات نہ آئی کہ قرآن مجید میں جو الارض کا لفظ ہے اُس میں الف لام استغراق کا نہیں ہے بلکہ عہد کا ہے ؂

حضرت ابراہیم کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا مگر اُنہوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا ؂

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت میں کوئی نص صریح قرآن مجید میں موجود نہیں ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے ؂

اسی طرح حضرت یونس کے قصے میں اس بات پر قرآن مجید میں کوئی نص صریح نہیں ہے کہ درحقیقت مچھلی اُن کو نگل گئی تھی ابتلع کا لفظ قرآن میں نہیں ہے التقمہ کا لفظ ہے جس سے صرف مُنہ میں پکڑ لینا مراد ہے کیونکہ جب کوئی لفظ تاکید کا اُس کے ساتھ نہیں ہے جیسے التقمہ فلقمھا یا التقم کے معنی ابتلع کے نہیں ہو سکتے - اور اگر فرض کرو کہ بعد لفظ تاکید کے بھی اس کے معنی ابتلع کے ہوں تو بھی لقم و التقم

کے دو معنی ہیں ایک سرعۃ الاکل۔ دوسرے والتبادر علیہ اور ان دوسرے معنوں سے بلع ثابت نہیں ہوتا۔ پس دوسرے معنوں پر جو مطابق قانون فطرت کے تھے انہوں نے توجہ نہیں کی اور اس آیت میں کہ فلولا انہ کان من المسبحین للبث فی بطنہ الی یوم یبعثون (آیت ۱۴۳ و ۱۴۴۔ الصافات ۳۷) اس پر التفات نہیں کیا کہ لبث فی بطن الحوت کی نفی دو طرح پر تحقق ہو سکتی ہے۔ اول اس طرح پر کہ مچھلی نے نگلا ہی نہیں۔ دوسرے اس طرح کہ نگلا ہو مگر اُس کے پیٹ میں نہ ٹھیرے ہوں۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ اگر میں اُس کو نہ بچاتا تو وہ قبر میں ہوتا۔ اُس کا مقصد صرف یہی ہے کہ قتل نہیں ہوا نہ یہ کہ قبر میں جا کر نکل آیا۔ مگر اُنہوں نے اِن معنوں پر توجہ نہیں کی۔ غرضکہ اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآن مجید میں ہیں۔ ہم کو ضرور ہے کہ صرف الفاظ قرآن مجید کے پابند رہیں نہ اُن قصوں کے جو یہود و نصاریٰ میں مذکور و مشہور ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ " نقل از بنی اسرائیل بیشتر است کہ در دین ما دخل شد بعد ازانکہ لا تصدقوا اھل الکتاب و لا تکذبوھم قاعدہ مقرر است۔ پس دو چیز لازم آمد یکے آنکہ تعریض قرآن را در سنت حضرت پیغامبر صلے اللہ علیہ وسلم بیان یافتہ شود مرتکب نقل از اہل کتاب نباید شد مثلاً چوں محمل آیت ولقد فتنا سلیمان والقینا علی کرسیہ جسدا ثم اناب " در سنت نبویہ یافتہ نشود و آں قصہ ترک انشاء اللہ و مواخذہ برآں است مرتکب ذکر صخرہ مارد چرا باید شد۔ دوم آنکہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ را در نظر داشتہ قدر اقتضاء تعریض سخن باید گفت تا شہادت قرآن تصدیق کردہ باشیم و از زیادت زبان باید کشید ۱۲ (فوز الکبیر صفحہ ۹۷-۹۸)۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے معنی اس طور پر قرار دینے ضرور ہیں جس طرح کہ ایک اُمی آدمی اُس کے معنی سمجھ سکتا ہے کیونکہ بدویین اور تمام قبائل عرب کے اَن پڑھ تھے پس اُس زمانہ کے اہل عرب جس طرح سیدھے سادھے طور پر الفاظ قرآن کے ظاہری معنی سمجھتے تھے اُسی طرح ہم کو بھی قرآن کے معنی بیان کرنے چاہئیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ہم بھی اسی طرح کرتے ہیں کیونکہ الفاظ کے وہی معنی لیتے ہیں جو عرب جاہلیت سمجھتے تھے کلام جاہلیت ہی کی بنا پر صرف و نحو و لغت کی کتابیں مبنی ہیں جن سے ہم قرآن مجید کے معنی بیان کرنے میں استمداد لیتے ہیں۔ موجودہ علم ادب عربی زبان کا بدویین اور اہل عرب کے کلام کی بنا پر مبنی ہے مگر بحث اس پر آجاتی ہے جب کہ بلحاظ علوم و فنون کے قرآن مجید پر توجہ کی جاتی ہے اور جس سے اہل عرب بالکل ناواقف اور عاری محض تھے۔ اس حالت میں بھی ہم کوئی نئی بات پیش نہیں کرتے بلکہ خود موافق زبان اہل عرب کے قرآن مجید کے الفاظ کے اُن معنوں پر متوجہ کرتے ہیں جو علوم کی ترقی کے سبب ہم کو صحیح و درست معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً اہل عرب بجز اس کے کہ جس پر وہ رہتے تھے اُس کو ارض کہتے تھے اور جو نیلی نیلی چیز گنبد نما اُن کے

سر پر بھی اُس کو سما جانتے تھے اور اُور بحثوں سے جو علوم میں اُن سے متعلق ہیں محض ناواقف تھے اور باایں ہمہ جو نتیجہ ہدایت اور تعلیم روحانی اور وحدت و قدرت ذات باری کا قرآن مجید سے مقصود تھا وہ اُن کو حاصل ہوتا تھا۔ مگر جب بلحاظ علوم کے قرآن کے الفاظ پر بحث کیجاوے تو اُس وقت اُن سے کہتے ہیں کہ الفاظ قرآن کے وہ معنی لینے جو مطابق زبان عرب کے اور اُن علمی بحثوں کے مطابق ہیں کیوں نظرانداز کئے جاتے ہیں اور جو قانون فطرت خود خدا نے بتایا ہے اُس کے مطابق وہ معنی جو کلام عرب کے مطابق بھی ہیں کیوں نہیں لئے جاتے *

ہم سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید کا یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اُس طرز کلام میں نازل ہوا ہے کہ اُمّی اور عالم و جاہل و فلسفی کسی طرح پر اُس کے معنی سمجھیں سیدھے سادہ طور پر یا علمی و فلسفی طریقہ پر مگر نتیجہ میں سب متحد ہو جاتے ہیں کوئی کلام بجز قرآن مجید کے ایسا نہیں ہے کہ وہ جاہل اور اُمّی محض کو بھی اُسی نتیجہ پر پہنچاوے جس نتیجہ پر ایک عالم فلسفی کو پہنچاتا ہے اور ہر ایک بقدر اپنے علم اور استعداد کے اُس سے فائدہ اُٹھا کر ایک منزل مقصود پر پہنچتا ہے *

ہم سے طعناً کہا جاتا ہے کہ جب حکمت و ہیئت و فلسفہ یونانی مسلمانوں میں پھیلا اور جو اُس زمانہ میں بالکل سچ و صحیح اور مطابق حقیقت واقع سمجھا جاتا تھا۔ علمائے اسلام نے قرآن مجید کے اُن مقامات کی جو اُن کے مطابق معلوم ہونے تھے تائید کی اور اُن مقامات کو جو بظاہر مخالف اُن علوم کے معلوم ہوتے تھے اُن کے مطابق کرنے پر کوشش کی اب کہ معلوم ہوا کہ وہ علوم غلط اصول پر مبنی تھے اور اُن کا علم ہیئة بالکل خلاف حقیقت تھا اور علم طبعیات اور نیچرل سینز نے زیادہ ترقی کی تو اب اُن معنوں سے جو اگلے علما نے مطابق یونانی علوم کے قرار دیئے تھے تخالف کرتے ہو اور دوسرے معنی اختیار کرتے ہو جو حال کے علوم کے مطابق ہیں اور کیا عجب ہے کہ آیندہ زمانہ میں ان علوم کو اَور زیادہ ترقی ہو اور جو امور اس وقت محققہ معلوم ہوتے ہیں وہ غلط ثابت ہوں اُس وقت قرآن مجید کے الفاظ کے دوسرے معنی قرار دینے کی ضرورت ہوگی و علیٰ ہذا پس قرآن لوگوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جاویگا *

ہم اِس طعنہ کو بطور ایک بشارت کے نہایت خوشی سے تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ قرآن مجید حقیقت امور کے مطابق ہے کیونکہ وہ ورڈ آف گاڈ ہے اور بالکل ورک آف گاڈ اُس کے مطابق ہے مگر اس میں بہت بڑا معجزہ یہ ہے کہ ہمارے ہر درجہ علم میں اُن امور میں جن کی ہدایت کے لئے قرآن نازل ہوا ہے یکساں ہدایت کرتا ہے اُس کے الفاظ ایسے اعجاز سے نازل ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہمارے علوم کو ترقی ہوتی جاویگی اور اُس ترقی یافتہ علوم کے لحاظ سے ہم اُس پر غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ اُس کے الفاظ اُس لحاظ سے بھی مطابق حقیقت ہیں اور ہم کو ثابت ہو جاویگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے اور اب غلط ثابت ہوئے وہ ہمارے علم کا قصور تھا نہ الفاظ قرآن کا۔ بس اگر ہمارے علوم کو آیندہ

زمانہ میں ایسی ترقی ہوجاوے کہ اس وقت کے امور محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کرینگے اور اُس کو ضرور مطابق حقیقت پا وینگے اور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دئے تھے وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔ قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا ٭

مثلاً فرض کرو کہ قرآن مجید سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ سورج زمین کے گرد پھرتا ہے جس سے طلوع و غروب ہوتا ہے اب معلوم ہؤا کہ سورج ساکن ہے اور زمین سورج کے گرد پھرتی ہے اب ہم قرآن مجید پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورج کا پھرنا قرآن مجید میں بطور حقیقت واقع کے بیان نہیں ہؤا بلکہ علےٰ ما یشہدہ الناس بیان ہوا ہے اور وہ سچ ہے۔ پس ہم نے جو اُس کو بطور حقیقت واقع کے سمجھا تھا وہ ہماری غلطی تھی نہ قرآن مجید کی غرضکہ ترقی علوم سے ہم کو اُن امور سے رجوع کرنا جو ہم نے پہلے نسبت قرآن کے قرار دئے تھے اور قرآن مجید کا اُس کے مطابق پانا جس کی طرف ہم نے بعد ترقی علم رجوع کی ہے ہمارے علم سابق کا نقصان اور قرآن مجید کے کامل ہونے کا ثبوت ہے مگر ہماری نسبت کسی قسم کی طعنہ زنی کا سبب نہیں ٭

یہ بحثیں جہاں تک ہیں صرف اُن امور سے متعلق ہیں جو علوم سے اور طبیعیات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ باقی رہے وہ امور جو روحانی تعلیم سے متعلق ہیں اور جن کو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ حاوی ہے ہر وقت میں ایک حالت مستقل پر قایم ہیں اُس میں نہ کبھی تبدل ہؤا۔ نہ ہوگا۔ نہ ہونے کی حاجت۔ جس کے لئے منطوق آیہ کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا شاہد عادل ہے ٭

الآن نختم الکلام و نقول ھذہ اصول معدودۃ من الاصول التی اسسنا علیھا تفسیر القرآن و نبین کلھا فی وقت اخر ان شاء اللہ تعالیٰ ٭

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃ

(سورۃ الفاتحہ) قرآن مجید کی سورتوں کو جو سورۃ کہتے ہیں اُس کی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال ہیں۔ سب سے صاف یہ ہے کہ سورت شہر کی فصیل کو کہتے ہیں جس سے شہر محدود ہو جاتا ہے۔ اُسی مناسبت سے قرآن مجید کی آیات معینہ محدودہ پر سورت کا اطلاق کیا گیا ہے ٭

قرآن مجید میں بھی آٹھ جگہ سورت کا لفظ آیا ہے۔ اگرچہ وہاں لفظ سورت سے قرآن مجید کی سورتیں جو سورتوں کے نام سے مشہور ہیں مراد نہیں ہے۔ بلکہ اُن سے قرآن مجید کا ایسا حصہ مراد ہے جن میں کوئی پورا مطلب در منشا، بیان کیا گیا ہو۔ مگر جب کہ کوئی حصہ تعین کیا جاویگا تو ضرور ہے کہ وہ بھی معین و محدود ہوگا۔ اُسی مناسبت سے قرآن مجید میں اُس پر سورت کا اطلاق ہوا ہے۔ پس اُسی کی پیروی سے۔ اُن مجموعہ آیات پر۔ جو درحقیقت معین و محدود اور اپنے ماقبل و مابعد سے علیحدہ ہیں سورت کا اطلاق کرنا۔ نہایت درست و صحیح ہے ٭

قرآن مجید میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ اُن میں سے بجز اُنتیس (۲۹) کے جن کی ابتدا میں حروف مقطعات ہیں اور کسی کو خدائے تعالیٰ نے کسی نام سے موسوم نہیں کیا۔ جس قدر نام سورتوں کے ہیں وہ سب بعد کے رکھے ہوئے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین کے زمانہ ہی میں یہ نام مشہور ہو گئے ہوں۔ مگر ان میں سے کسی بات کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔ حدیثوں میں جو ان سورتوں میں سے بعض کے نام آئے ہیں اگرچہ وہ حدیثیں ثابت نہیں ہیں۔ تاہم اگر اُن کو ثابت بھی مانا جائے تو اُس سے بجز اِس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کہ راوئ اخیر کے زمانہ میں وہ سورت اُس نام سے

مشہور تھی ❖

یہودیوں کا دستور تھا کہ توریت کی سورتوں کو یا اُس کے شروع کے لفظ سے موسوم کرتے تھے۔ یا جس معاملہ یا مطلب پر وہ سورت دلالت کرتی تھی اُسی میں سے کوئی لفظ لیکر اس کا نام رکھ دیتے تھے۔ مثلاً توریت کی پہلی سورت کے شروع میں لفظ "براشیث" בראשית آیا ہے اُس کا نام اُنہوں نے "سورۂ براشیث" פרשת בראשית رکھا ہے اور دوسری سورت میں حضرت نوحؑ کا قصہ ہے اُس کا نام "سورۂ نوح" פרשת נח رکھا ہے اُسی قاعدہ کے مطابق اہل اسلام نے بھی قرآن مجید کی سورتوں کے نام رکھے ہیں۔ اس سورت کا نام جو سورۂ فاتحہ رکھا ہے اس لحاظ سے رکھا گیا ہے کہ قرآن مجید اس سے شروع ہوتا ہے۔ مگر یہ نام اُن ناموں میں سے نہیں ہے جو وحی سے ٹھیرائے گئے ہیں ❖

(اختلاف قرأت) جب قرآن نازل ہوتا تھا۔ تو متفرق ٹکڑوں پر لکھ لیا جاتا تھا اور لوگ جو سنتے تھے اُس کو برزبان یاد بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر جیسا کہ عام قاعدہ فطرت انسانی کا ہے۔ برزبان یاد کرنے والوں کو پیش آتا تھا یعنی جس کا حافظہ قوی تھا اُس کو نہایت صحت و ضبط کے ساتھ یاد رہتا تھا اور جس کا حافظہ قوی نہ تھا اُس کو ایسے ضبط سے یاد نہ رہتا تھا۔ اور اس وجہ سے اختلاف قرأت پیدا ہو گئے تھے۔ کسی کو واو کی جگہ فے یاد رہگئی۔ کسی کو زیر کی جگہ زبر کسی کو سکون کی جگہ تشدید اور کچھ شبہ نہیں کہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شخص برزبان یاد رکھنے میں کوئی کلمہ یا آیت بھول گیا۔ یا کوئی غیر کلمہ اُس کی زبان پر چڑھ گیا جو درحقیقت اُس میں نہ تھا۔ غرضکہ زبانی یاد رکھنے میں جو امور کہ مطابق فطرت انسانی پیش آسکتے ہیں اُس زمانہ کے لوگوں کو بھی پیش آتے تھے۔ مگر جو لغزشیں اس طرح واقع ہوتی تھیں اُن کے درست کرنے والے یا تو وہ لوگ تھے جو نہایت صحت و ضبط سے یاد رکھتے تھے یا وہ متفرق لکھے ہوئے پرچے تھے جو قرآن نازل ہونے کے وقت لکھ لئے جاتے تھے۔ غرضکہ زبانی غلطیاں یا تو بخوبی یاد رکھنے والوں سے یا متفرق لکھے ہوئے پرچوں سے جو لوگوں کے پاس تھے صحیح ہو جاتی تھیں ❖

یہ اختلاف روز بروز جیسا کہ عام قاعدہ ہے بڑھتا جاتا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں صحابہ نے اس پر اتفاق کیا کہ اُن متفرق پرچوں کو جمع کر کر تمام قرآن مجید کو ایک جگہ لکھ لینا چاہئے تاکہ اختلاف نہ پڑے۔ پس زید بن ثابت نے وہ تمام متفرق پرچے جمع کئے اور اپنے ہمعصروں سے جو قرآن کو بخوبی یاد رکھتے تھے اور جن کے پاس متفرق پرچے لکھے ہوئے تھے مدد لی۔ اور اول سے آخر تک قرآن مجید لکھ لیا ❖

حضرت عثمانؓ کے وقت تک بلاد دور دست میں اسلام پھیل گیا تھا۔ اور صرف ایک قرآن کا

مدینہ میں ہونا کافی نہ تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے اُس قرآن کی جس کو زید بن ثابت نے لکھا تھا متعدد نقلیں کیں اور دُور دُور کے ملکوں میں بھیج دیا۔ یہ کارروائی نہایت مفید ہوئی اور سب سے بڑا یہ کام ہُوا کہ اُس زمانہ سے پہلے کسی کو کوئی سورۃ یاد تھی اور کسی کو کوئی سورت یاد تھی۔ کسی کو دو یاد تھیں کسی کو دس یاد تھیں۔ کسی کو آدھی یاد تھی۔ کسی کو پاؤ۔ اب سینکڑوں ایسے لوگ پیدا ہو گئے۔ جن کو بہ ترتیب من اوّلہ الیٰ آخرہ تمام قرآن یاد تھا *

اگرچہ اب وہ غلطیاں جو نسبت اسقاط یا اضافہ کلمات کے زبانی یاد رکھنے والوں کو پڑتی تھیں۔ بالکل جاتی رہیں۔ مگر پھر بھی کسی قدر اختلاف قرأت باقی رہا۔ اِس لئے کہ یہ سب قرآن جو لکھے گئے تھے قدیم کوفی خط میں تھے۔ جس میں نہ نقطے ہوتے تھے نہ اعراب۔ اور اگرچہ عرب اس سبب سے کہ اُن کی زبان تھی اُس کو بخوبی بلا تکلف بصحت پڑھتے تھے۔ مگر پھر بھی بعضے ایسے لفظ تھے کہ بلحاظ قواعد صرف و نحو زبان عرب کے۔ یا یوں کہو کہ مطابق بول چال اہل عرب کے۔ اگر اُس کو (ی) سے پڑھو تو بھی معنی ٹھیک ہوتے ہیں۔ اور اگر (تے) سے پڑھو تو بھی معنی ٹھیک ہوتے ہیں۔ اگر سکون سے پڑھو تو بھی صحیح ہے۔ اور اگر تشدید سے پڑھو تو بھی صحیح ہے۔ چنانچہ اس قسم کے اختلاف قرأت مگر بہت کم باقی رہ گئے *

تھوڑے دنوں بعد جب کہ بعض صحابہ اور بہت سے تابعین زندہ تھے۔ اور ہزاروں شخص قرآن مجید کو بہ ترتیب من اوّلہ الیٰ آخرہ یاد رکھنے والے موجود تھے۔ اس اختلاف کے رفع کرنے پر بھی کوشش کی گئی۔ اور قرآن مجید میں اعراب اور نقاط بالکل لگا دئیے۔ کتابوں میں تو بلاشبہ اُن پہلے اختلافوں کا ذکر ہوتا ہے مگر فی الواقع اختلاف قرأت بالکل جاتا رہا۔ اور ہزارہا آدمی ہر زمانہ میں ایسے موجود ہو گئے۔ جن کو بہ ترتیب من اوّلہ الیٰ آخرہ قرآن حفظ یاد تھا۔ اور کسی کی قرأت میں ایک حرف یا ایک اعراب کا بھی فرق نہ تھا۔ اور آج کے دن بھی جو یکم شوال ۱۳۰۰ نبوی مطابق ۱۲۹۷ ہجری موافق ۹۔ اکتوبر ۱۸۸۰ عیسوی کے ہے ہزاروں حافظ ہر ملک میں اسی قسم کے موجود ہیں۔ درحقیقت یہ شرف سوائے قرآن مجید کے اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے کہ اگر تمام دُنیا سے قرآن کے قلمی اور چھاپے کے نسخے معدوم کر دئیے جاویں تو حافظوں کے سینہ سے پھر قرآن مجید ایسا ہی نقل ہو سکتا ہے جیسا کہ ہے۔ اور جس میں ایک لفظ اور ایک شوشہ ایک اعراب کا بھی فرق نہ ہوگا *

اس کے سوا ایک اور قسم کا اختلاف قرأت ہے جو عرب کی مختلف قوموں کے لہجہ اور محاورۂ زبان سے علاقہ رکھتا ہے یا جو اختلاف گنواروں اور اشرافوں اور پڑھے لکھوں اور جاہلوں کی زبان میں ہوتا ہے۔ اُس کو اختلاف قرأت پر منسوب کرنا بیجا ہے۔ کیونکہ وہ اختلاف قرأت نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف تلفظ ہے۔ جس کو انگریزی زبان میں "پرونسی ایشن" کہتے ہیں *

توریت اور صحف انبیاء اور انجیل کے قلمی نسخے جو اب دنیا میں موجود ہیں۔ وہ آپس میں نہایت مختلف ہیں۔ اگرچہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کی ہے۔ اور نہ علمائے متقدمین و محققین اس بات کے قائل تھے۔ مگر علمائے متاخرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف و تبدیل کی ہے۔ اُس پر عیسائی مصنفوں نے اس امر محال کے اثبات پر کوشش کی ہے کہ قرآن میں بھی تحریف ثابت کریں اور اُنہوں نے اپنی اس ناشدنی سعی میں کامیاب ہونے کو تین امر پر استدلال کیا ہے۔ اوّل اختلاف قرأت پر جس کا تفصیل اوپر مذکور ہوا۔ دوم شیعہ مذہب کی ایسی روایتوں پر جن کو خود شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے جن میں کذاب اور ایک گروہ کے طرفدار راویوں نے بیان کیا ہے کہ قرآن میں اور بھی آیتیں یا سورتیں حضرت علی اور اہلبیت کی شان میں ہیں۔ جو جامعین قرآن نے داخل نہیں کیں۔ سوم اُن لغو اور بیہودہ روایتوں پر جن میں بعض آیات متروک التلاوت یا منسوخ التلاوت کا ہونا بیان کیا گیا ہے اور جن کو شریر و بدمذہب آدمیوں نے شہرت دیا ہے *

قرآن مجید کے اختلاف قرأت کو اور توریت و صحف انبیاء و زبور و انجیل کے اختلاف عبارت کو یکساں قرار دینا دیدہ و دانستہ ایک غلطی کرنا ہے۔ ریورنڈ مسٹر ہارن مختلف عبارتوں کا ذکر لکھتے وقت لکھتے ہیں کہ ”دو یا زیادہ مختلف عبارتوں میں صرف ایک عبارت صحیح ہوسکتی ہے۔ باقی خواہ تو دیدہ و دانستہ تبدیل کی گئی ہونگی یا وہ نقل کرنے والوں کی غلطیاں ہونگی“ پھر وہ یہودی اور عیسائی کتب مقدسہ میں اختلاف عبارت ہونے کے چار سبب لکھتے ہیں۔ اوّل لکھنے والے کی غفلت یا غلطی۔ دوم جن نسخوں سے نقل کی گئی ہو اُن کا غلط یا ناقص ہونا۔ سوم نقل کرنے والے کا بلا کافی و معتبر سند کے اصل عبارت میں اصلاح دینا چہارم دیدہ و دانستہ کسی خاص فریق کی تائید کے لئے عبارت کا بگاڑ دینا۔ پس قرآن مجید کا کوئی بھی اختلاف قرأت ان حالتوں میں سے کسی حالت کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتا *

علاوہ اس کے قرآن مجید کی تحریف ثابت کرنے کو عیسائی مصنفوں نے جن مذکورہ بالا امور پر استدلال کیا ہے۔ اور جو مخرج فی نفسہ غلط ہیں۔ اُن کی غلطی ثابت کرنے پر ایک طولانی بحث کرنے سے زیادہ تر یہ مختصر بات بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جس بناء پر عیسائیوں نے تحریف قرآن کا دعوے کیا ہے۔ اُس طرح پر دعوے کرنا بمقابل اُن مسلمانوں کے جو دعوے تحریف لفظی کا کتب مقدسہ یہودیوں اور عیسائیوں پر کرتے ہیں صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اُن مسلمانوں کا یہ دعوے ہے کہ جس طرح پر کہ ابتدا میں توریت و صحف انبیاء و زبور و انجیل لکھی گئی تھی بعد اُس کی تحریر کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اُس میں تحریف لفظی کی ہے اور جملے اور کلمے اور آیتیں نکال دی ہیں۔ اور اپنی طرف سے آیتیں اور جملے اور کلمے بلکہ کتابیں کی کتابیں لکھ کر داخل کردی ہیں *

پس اگر کوئی عیسائی اس کے مقابلہ میں قرآن کی تحریف کا دعوے کرنا چاہے۔ تو اُس کو اختلاف قرأت یا روایات غیر مسلم اہل مذہب کا پیش کرنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُن کے مقابل جب ہو سکتا ہے جب وہ یہ دعوے کرے کہ جو قرآن زید بن ثابت نے ابتدا میں لکھا تھا اُس کی تحریر کے بعد یہ آیت یا یہ سورت اُس میں سے نکال ڈالی گئی ہے اور یہ آیت یا یہ کلمات اُس میں بڑھا دئیے گئے ہیں۔ یا یہ صیغے یا یہ اعراب تبدیل کر دئیے گئے ہیں۔ اور اگر وہ یہ دعوے نہیں کر سکتا تو بالفرض زید بن ثابت نے جو کچھ کیا ہو۔ کیا ہو۔ مگر قرآن پر تحریف کا دعوے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جیسا وہ جب لکھا گیا تھا۔ ویسا ہی اب تک موجود ہے ۔

زید بن ثابت نے جب قرآن لکھا تھا اور جس کی نقل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ اُس زمانہ میں قواعد رسم خط کے بخوبی منضبط نہیں ہوئے تھے۔ اور اس سبب سے بہت سے الفاظ زید بن ثابت نے اس طرح لکھے ہیں جو اُن قواعد رسم خط سے جو بعد کو منضبط ہوئے مختلف ہیں مگر صرف اس خیال سے کہ جو کچھ زید بن ثابت نے لکھا ہے اُس میں تبدیلی نہ واقع ہونے پاوے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی وہی رسم خط رہنے دی تھی۔ اور اُس کے بعد تمام مسلمانوں نے صرف قرآن کی تحریر میں اُسی رسم خط کو رہنے دیا۔ اور یہاں تک اُس میں غلو کیا کہ اُس کے برخلاف رسم خط تحریر قرآن میں اختیار کرنے کو گناہ اور کفر قرار دیدیا ۔

قاری مصطفےٰ تفسیر بحر العلوم کے مصنف نے لکھا ہے کہ "مطابقت خط مصحف عثمانی برکاتب قرآن از واجبات دینی است کہ اجماع صحابہ بران واقع شدہ است و مخالفت اجماع حرام باشد و جمہور علماء و آئمہ مذاہب اربعہ سنیہ برین اند در مقنعہ آمدہ۔ سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ تُكْتَبُ مَا اَحْدَثَہُ النَّاسُ مِنَ الْهِجَا فَقَالَ لَا اِلَّا عَلٰى كِتْبَةِ الْاُوْلٰى ۔

اور اتقان فی علوم القرآن میں لکھا ہے کہ " كَانَ اَحْمَدُ يُحَرِّمُ مُخَالَفَةَ خَطِّ عُثْمَانَ رضی اللہ عنہ فِیْ وَاوٍ اَوْ يَاءٍ اَوْ اَلِفٍ اَوْ غَيْرِ ذٰلِكَ ۔

اور ابن مہران کا قول ہے کہ " اِتِّبَاعُ الْمُصْحَفِ فِیْ هِجَاءِهٖ وَاجِبٌ وَّمَنْ طَعَنَ فِیْ شَیْءٍ مِنْ هِجَاءِهٖ فَهُوَ كَالطَّاعِنِ فِیْ تِلَاوَتِهٖ لِاَنَّهٗ بِالْهِجَاءِ يُتْلٰى " ۔

اور حدیقۃ البیان میں لکھا ہے کہ " اگر کسے اعتقاد کند کہ بر موافق امام یعنی مصحف عثمانی نباید نوشت نسبت خطا بر قلم اولین کردہ باشد زیرا کہ در لوح محفوظ بہمان طور نوشتہ شدہ است و نیز بجناب صحابہ رضی اللہ عنہ بلکہ بجناب رسالت معلم صحابہ و بجبرئیل معلم رسول نسبت خطا۔ قع میشود زیادتی و کمی در قرآن حاصل می آید و این ہمہ قریب کفر است ۔

اور کتاب ہجا میں ابی عبد اللہ محمد کا یہ قول ہے کہ " مَنْ خَالَفَ الْاِمَامَ صَارَ فَاسِقًا وَدَخَلَ

نَحْنُ وَعِيْدِ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ *

اور ایضاح میں لکھا ہے کہ " يُكْرَهُ قِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ مِنَ الْمُصْحَفِ الَّذِيْ يُخَالِفُ مَا خَطَّهٗ اِبْنُ ثَابِتٍ " *

یہ تشددات صرف اسی مطلب سے ہیں کہ جو کچھ زید بن ثابت نے لکھا اور جس کی بعینہٖ نقل حضرت عثمان نے کی۔ اُس میں ذرہ بھی فرق نہ پڑنے پاوے۔ چنانچہ آج تک قرآن مجید اُسی طرح محفوظ ہے پس ہر شخص یہ بات کہہ سکیگا اور قبول کرسکیگا کہ دُنیا میں کوئی قلمی کتاب بجز قرآن مجید کے ایسی موجود نہیں ہے۔ کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی ایسی ہی موجود ہو جیسی کہ پہلے دن لکھی گئی تھی جس میں ایک شوشہ تک کا فرق نہیں۔ اور باوجودیکہ لاکھہا قلمی نسخے اس کے پھیلے۔ مگر سب یکساں ہیں۔ پھر ایسی کتاب کی نسبت یہ کہنا کہ اُس میں بھی اس قسم کی تحریف ہوئی ہے جیسی کہ مسلمان توریت و انجیل میں بیان کرتے ہیں۔ ایسی بات ہے جس کو کوئی شخص نہ بت پرست نہ یہودی۔ نہ عیسائی۔ نہ سیاہ کافر۔ غرضکہ کوئی بھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ سر ولیم میور صاحب بھی اپنی کتاب مسمّٰی لایف آف محمد میں تسلیم کرتے ہیں کہ " دنیا میں غالباً کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جس کی عبارت بارہ سو (۱۲) برس تک ایسی خالص رہی ہو " *

(آیات) علاوہ اعراب کے قرآن کے نسخوں میں اور بھی نشان پائے جاتے ہیں جو آیات وغیرہ کے نشان کہلاتے ہیں *

(گول چھوٹا سا دائرہ) آیت پوری ہونے کی نشانی ہے *

(م) یہ نشان اس لئے ہے کہ اُس کلمہ پر ٹھیر جانا اور اُس کو آیندہ کے کلمے سے نہ ملانا نہایت ضرور ہے *

(ط) یہ نشان اس لئے ہے کہ اُس کلمہ پر ٹھیر جانا اور اگلے کلمہ کو جدا شروع کرنا بہتر ہے *

(ج) یہ نشان اس لئے ہے کہ وہاں ٹھیر جانا جائز ہے *

(ز) یہ نشان اس لئے ہے کہ یہاں ٹھیر جانا تجویز کیا گیا ہے۔ مگر ملانا بہتر ہے *

(ص) یہ نشانی اس لئے ہے کہ یہاں ٹھیر جانے کی رخصت دی گئی ہے *

یہ پانچ نشانیاں تو وہ تھیں جو متقدمین نے اختیار کی تھیں مگر متاخرین نے سات اور بڑھائیں *

(قف) گویا ٹھیرنے کا حکم ہے *

(ق) یعنی بعضوں نے یہاں ٹھیر جانا کہا ہے *

(صلی) اِس کلمہ کو اگلے کلمے سے ملا ہوا پڑھنا بہتر ہے *

(لا) یعنی یہاں ٹھیرنا جائز نہیں بلکہ ملا ہوا پڑھنا بہتر ہے *

(سکتۃ) یعنی ٹھیرو لو مگر دم نہ لو ✦

(ک، بمعنی کذٰلک ہے یعنی اوپر کا نشان ہے ✦

(قلا) یعنی بعضوں نے کہا ہے کہ یہاں ٹھیرنا نہیں چاہئے ✦

بہرحال یہ سب نشان علما نے قرآن کا مطلب سمجھانے کو بنائے ہیں۔ وحی سے نہیں لگائے گئے ہیں ✦

قرآن مجید جب نازل ہوا تو عرب اُس کو اپنے لہجہ میں پڑھتے تھے جیسا کہ اہل زبان کا دستور ہے، اور علاوہ اداے مخارج حروف کے جو اُن کی زبان تھی' وہ کسی لفظ کو زور دیکر پڑھتے تھے' اور کسی جگہ وقفہ کرکر' کسی کو مد دیکر' اور کسی کو قصر کرکر' پچھلے عالموں نے اُسی خیال سے آیات اور وقف مقرر کئے ہیں۔ مگر جب قرآن لکھا گیا تھا تو وہ اُن اشاروں سے معرّا تھا۔ پس یہ نشان آیتوں کے کسی کو اُن کے تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔ قرآن مجید کا طرز کلام اور اس کا مضمون خود بتاتا ہے اور ہر ایک محقق اور عالم بلکہ ہر ذی عقل و فہم اُس کے معنی دریافت کرکر سمجھ سکتا ہے کہ کہاں مطلب ختم ہوا اور کہاں سے دوسرا مطلب شروع ہوا۔ اور یہی سبب ہے کہ بعض علما نے ایک ہی فقرہ کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں منقسم سمجھا ہے اور اُس کی دو یا تین آیتیں قرار دی ہیں۔ اور بعضوں نے کل فقرہ کو ایک ہی آیت سمجھا ہے۔ اور اس سبب سے ایک عالم اُسی ایک فقرہ میں دو یا تین آیتیں کہتا ہے۔ اور ایک عالم ایک ہی اور اب بھی ہر ایک مفسر مجاز ہے کہ بلحاظ ربط کلام کے جہاں وہ چاہے آیت قرار دے۔ میں اپنی تفسیر میں مطالب کے بیان میں اُسی طریقہ کو اختیار کرونگا۔ مگر میں نے شمار آیتوں کا اس کے مطابق رہنے دیا ہے۔ جو مؤلف نجوم الفرقان نے اختیار کیا ہے۔ اِس لئے کہ اس کتاب کے مؤلف نے نہایت خوبی سے قرآن مجید کے ہر ایک لفظ کو بتایا ہے کہ کس کس آیت میں ہے اور وہی شمار قائم رکھنے سے مجھ کو اپنی تفسیر میں الفاظ وارده قرآن کا نشان دینے کو جہاں کہیں اُن کے نشان دینے کی ضرورت ہو نہایت آسانی ہوگی ✦

یہی سبب ہے کہ باوجودیکہ میرے نزدیک ہر ایک سورت پر جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھی ہوئی ہے وہ اُس سورت کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے مگر میں نے اُس پر شمار آیت کا نہیں لگایا۔ کیونکہ مؤلف نجوم الفرقان نے ہر ایک سورت میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو شمار آیتوں سے خارج رکھا ہے۔ اگر میں اُس کو شمار آیتوں میں داخل کر دیتا تو بالکل شمار مختلف ہوجاتا اور الفاظ وارده قرآن کا پتہ و نشان درست نہ رہتا ✦

(مضامین قرآن) قرآن مجید کے بعض مضامین اور احکام ایسے ہیں جو توریت یا انجیل کے مضامین سے یا یہودیوں کی روایت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور اس کا طرز کلام ایسا ہے جو زمانہ

جاہلیت کے طرز کلام سے مناسبت رکھتا ہے۔ اور بعض احکام ایسے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھے اور بعض جگہ طریقہ نظم قرآن ایسا ہے جو اور مشرک قوموں کی مقدس کتابوں میں بھی جن کو وہ الہامی سمجھتے تھے موجود ہے اور اس سبب سے مخالفین اسلام نے قرآن مجید پر اعتراض کئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ باتیں وہاں سے لیگئی ہیں *

مگر معترضوں کی یہ ایک علانیہ غلطی ہے۔ اس لئے کہ پیغمبر درحقیقت اُس قوم کے لئے یا اُس زمانہ کے لوگوں کے لئے جس میں وہ پیدا ہوئے۔ بُرائیوں کی اصلاح کرنے والے اور اچھی باتوں کے قائم کرنے والے اور سچ بات کو تسلیم کرنے والے اور حق بات کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کسی پیغمبر کے زمانہ سے پہلے جو باتیں مروج ہوں۔ یا جو باتیں بطور مذہب کے جاری ہوں۔ یا بطور تواریخی واقعات کے مشہور ہوں۔ یا بطور مقدس کلام کے سمجھی جاتی ہوں۔ یا اگلے ادیان حقہ کا بقیہ ہوں وہ سب غلط وجھوٹ اور خراب اور ناواجب ہوں۔ بلکہ بالضرور سچ میں جھوٹ اور اچھی میں بُری ملی ہوتی ہیں۔ اور اس لئے جو شخص کہ صلاح کے منصب پر ہو اُس کو اُن اچھی باتوں کو قائم رکھنا اور سچ بات کو تسلیم کرنا اور نیک کاموں کو بحال رکھنا ضرور لازم ہوتا ہے۔ اور ایسا کرنا علانیہ نیکی اور بے ریائی اور اُس اصلاح کرنے والے کی سچائی پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر قرآن مجید میں بھی ایسا ہے تو یہ وجہ اُس پر کچھ اعتراض کی نہیں ہے بلکہ اُس کی سچائی کی دلیل ہے *

بلاشبہ آتش پرستوں میں یہ رواج تھا کہ اُن کے مقدس صحیفوں کے سروں پر جن کو وہ الہامی سمجھتے تھے ایک ایسا فقرہ لکھا ہوا ہوتا تھا جو مماثل بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے ہے اور وہ فقرہ یہ ہے :-

فہ سید شمتائی ھر سند کا ھر شکر زمرپان فرا ھید ور

ترجمہ - بنام ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان داد گر

مگر یہ فقرہ (کیا عجب ہے کہ الہامی ہو) ایسا عمدہ ہے کہ جو شخص خدا پر ایمان لانے کا حامی ہو۔ اور اُسی کی لوگوں کو ہدایت کرتا ہو۔ وہ ضرور اُس کو تسلیم کریگا۔ اور اُس کا مؤید ہوگا۔ پس قرآن مجید کی ہر سورت پر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہونے پر اعتراض کرنا اور اس کو ایک سرقہ قرار دینا ایک ناانصافی اور محض مکابرہ ہے۔ کون شخص ہے جو خدا کو مانتا ہو۔ اور لوگوں کو بھی منوانا چاہے اور اس فقرہ کو مٹا دے اور نہ خدا ایسا کر سکتا ہے کہ جو کلام اُس کی مرضی کے مطابق ہے اُس کے برعکس کوئی کلام نازل کرے *

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	خدا کے نام سے جو بڑا رحم والا ہے بڑا مہربان ✤
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱)	سب بڑائیاں خدا ہی کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے (۱)
اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲)	بڑا مہربان ہے اور بڑا رحم والا (۲)
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۳)	حاکم ہے انصاف کے دن کا (۳)
اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۴)	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں (۴)
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵)	ہم کو سیدھی راہ پر چلا (۵)
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۶)	اُن لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے بخشش کی ہے (۶)
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۷)	نہ اُن کی راہ پر جن پر تیرا غصہ ہوا ہے اور نہ بھٹکنے والوں کی راہ پر (۷)

اِس سورۃ میں کچھ تو خدا کی تعریف ہے اور کچھ اپنی عاجزی اور کچھ دعا۔ پس گویا بندوں کی زبان سے کہی گئی ہے۔ اور بلاشبہ بندوں کو خدا سے اسی طرح التجا کرنی زیبا ہے ✤

دُعا جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے۔ مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لئے ہم دُعا کرتے ہیں۔ دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جاویگا۔ اور استجابت کے معنی اُس مطلب کا حاصل ہو جانا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے حصول مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کئے ہیں۔ وہ مطلب تو اُنہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ اُس مطلب کے اسباب میں سے ہے۔ اور نہ اُس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے۔ بلکہ وہ اُس قوت کو تحریک کرنے والی ہے جس سے اُس رنج و مصیبت اور اضطرار میں جو مطلب نہ حاصل ہونے سے ہوتا ہے تسکین ہوتی ہے۔ اور جب کہ دُعا دل سے اور اپنے تمام فطرتی قوٰی کو متوجہ کر کے کیجاتی ہے اور خدا کی عظمت اور اُس کی بے انتہا قدرت کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے تو وہ قوت تحریک میں آتی ہے۔ اور اُن تمام قوتوں پر جن سے اضطرار پیدا ہوا ہے اور اُس مصیبت کا رنج برانگیختہ ہوا ہے۔ اُن سب پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور انسان کو صبر و استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی کیفیت کا دل میں پیدا ہونا دعا کا مستجاب ہونا ہے ✤

اسی امر کا اشارہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں فرمایا کہ "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" یعنی دُعا خالص عبادت ہے اور اس سے بھی واضح کر کر فرمایا کہ "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" یعنی دُعا ہی عبادت ہے اور پھر فرمایا کہ تمہارا پروردگار کہتا ہے کہ "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" یعنی مجھ کو پکارو یعنی میری عبادت کرو میں تمہارے لئے اُس عبادت کو قبول کرونگا ✤ (مشکوۃ)

بس دعا سے مطلب کا حاصل ہونا موعود نہیں ہے۔ بلکہ عبادت کا جو نتیجہ ہے۔ وہ موعود ہے

خدا کے نام سے جو بڑا رحم والا ہے بڑا مہربان ٭ الٓمٓ وہ کتاب ہے	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

دُعا کے ساتھ کبھی مطلب کا حاصل ہوجانا اتفاقیہ بات ہے۔ جو اُس کے اسباب جمع ہونے سے حاصل ہوجاتا ہے[1] ٭

(۳) (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) یعنی اُس دن کا جس دن کہ اُس نور فطرت کے کام میں لانے یا نہ لانے کا جو خدا نے ہر ایک انسان میں موافق اُس کی حالت کے رکھا ہے نتیجہ ظاہر ہوگا ٭

(۶) (اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) جن پر انعام ہوا وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی نشانیوں میں غور کیا ہے اور جو نور فطرت خدا نے اُن میں رکھا ہے۔ اُس کو کام میں لاتے ہیں۔ اور قومی اور ملکی اور تمدنی و آبائی امور کی اُلفت و موانست اور خلقی امور کی قوت پر اُس کو غالب کیا ہے یا غالب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور سب چیزوں کو چھوڑ کر وہ راہ اختیار کی ہے جو خدا نے بتائی ہے ٭

(۷) (المغضوب) جن پر غصہ ہوا۔ وہ لوگ ہیں جو اُس نور فطرت کو کام میں نہیں لائے اور نہ کام میں لانے کی کوشش کی۔ اور آبائی اور مُلکی و تمدنی امور کے بوجھ میں دبے اور خلقی امور کی قوت میں مغلوب رہے اور جو راہ خدا نے بتائی تھی اُس کو اختیار نہیں کیا ٭

(الٓمّٓ) یہ سورت اُنہی اُنتیس[۲۹] سورتوں میں سے ہے جن کو خود خدا نے اُن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ حروف مقطعات اُن سورتوں کے نام ہیں۔ جن کے ابتدا میں آئے ہیں۔ اور جو سورتیں باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہیں اُن کے ایک ہی سے نام مقرر کئے ہیں۔ اب یہاں تین باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ اُنہی اُنتیس سورتوں کے نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے۔ دوسرے یہ کہ حروف مقطعات سے کیوں اُن کے نام مقرر کئے ہیں۔ تیسری یہ کہ جن حروف مقطعات سے اُن سورتوں کے نام مقرر کئے ہیں۔ اُنہی حروف سے اُن کا نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے ٭

قرآن مجید پر غور کرنے سے علانیہ پایا جاتا ہے کہ جس سورت کو خدا تعالیٰ نے قسمیہ طور پر یا اِس طرز کلام پر شروع کیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ یا یہ خدا کی بات ہے۔ اُس مقام پر خدا نے اُس سورت کو کسی اسم سے موسوم کیا ہے۔ تاکہ اُس کا نام لینے سے اُس کے مسمّٰے پر اُس امر کا اطلاق ہو۔ جس کا اطلاق کرنا منظور رہے۔ اور جن سورتوں کو اِس طرز کلام سے شروع نہیں کیا اُن کا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ٭

مثلاً اس سورت کا نام جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں (الٓمّٓ) ہے۔ اب خدا تعالیٰ نے طرز کلام اس طرح پر شروع کیا ہے۔ کہ یہ سورت خدا کی کتاب ہے۔ تو اُس نے اس سورت کا نام لیکر کہدیا کہ الٓمّٓ

[1] دعا کے متعلق رسالہ اسحابتہ دعا کا مطالعہ ضرور رہے۔ دیکھو ضمیمہ تفسیر القرآن ٭ احمد یا با مخدومی مصحح کتاب ہذا ٭

یعنی اس کا مسمےٰ وہ کتاب ہے۔ پس الٓمٓ جو اس سورت کا نام ہے مبتدا ہے اور ' ذلک ' مبتدا ثانی ہے۔ اور ' الکتاب ' اُس کی خبر ہے۔ اور یہ مبتدا و خبر ملکر پہلے مبتدا کی خبر ہیں۔ اور ' الٓمٓ ' یعنی ' الٓمٓ ' کا مسمےٰ ' ذلک الکتاب ' پر محمول ہے ✦

یہ بات بھی صاف ہے کہ اگر ان سورتوں کے نام الفاظ با معنی سے مرکب ہوتے تو ان معنوں کا جن پر وہ الفاظ دلالت کرتے ' ذلک الکتاب ' پر حمل ہونے کا شبہ پڑتا۔ اور معنی سے قطع نظر کرکے اُس کے مسمےٰ کا محمول ہونا بہت کم خیال میں جاتا۔ پس خدا تعالےٰ نے حروف مفردہ کو جو ترکیب کلام کے اصول بھی ہیں۔ اور معانی سے مبرا بھی ہیں۔ اسماء سور اختیار کیا۔ تاکہ بجز مسمےٰ کے محمول ہونے کے اور کوئی احتمال ہی نہ رہے ✦

البتہ اس بات کا تصفیہ کہ ان حروف کو اس سورۃ کے نام کے لئے کیوں مخصوص کیا مشکل ہے دنیا میں بھی جو شخص کسی کا کچھ نام رکھتا ہے اور جو مناسبت یا علت اس نام رکھنے کی اُس کے دل میں ہوتی ہے اُس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ پس یہ قرار دینا کہ خدا نے اس مناسبت سے اُن حروف مقطعات سے اس سورۃ کو موسوم کیا ہے ایک مشکل بات ہے اور ضرور ہے کہ باہم علما کے اس میں اختلاف ہو چنانچہ بہت سا اختلاف ہوا بھی ہے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے کہا کہ اس مناسبت کا علم خدا ہی کو ہے۔ مگر ہر شخص بقدر اپنے فہم کے اُس مناسبت کے بیان کرنے کا بلاشبہ مجاز ہے ✦

میری سمجھ یہ ہے کہ بعضی دفعہ اہل عرب حروف مقطعات بولتے تھے اور اس سے اشارہ کسی مطلب کی طرف ہوتا تھا۔ جیسے کہ اس شعر میں ہے :-

فقلت لها قفی فقالت لی ق لا تحسبی انا نسینا الایجاف

یعنی مَیں نے اُس سانڈنی سوار عورت سے کہا کہ ٹھیر جا یہ مت خیال کر کہ میں سانڈنی ہنکانا بھول گیا ہوں۔ اُس نے کہا کہ ' قاف ' یعنی ' وقفت ' ٹھیر گئی میں پس حرف قاف سے پورا کلام " وقفتُ " کا مُراد ہے ✦

سورہ بقرہ۔ اور سورہ آل عمران۔ اور سورہ عنکبوت۔ اور سورہ روم۔ اور سورہ لقمان۔ اور سورہ سجدہ۔ اِن سب کے سرے پر الٓمٓ ہے جو اُن سورتوں کا نام ہے۔ ان تمام سورتوں میں خدا تعالےٰ نے احکام الٰہی کی تعمیل اور امر بالمعروف کی تاکید۔ اور لیل و نہار کے اختلاف اور عالم میں جو آیات قدرت کردگار ہیں اُن سے خدائے واحد کے وجود پر استدلال کیا ہے اور موت کا اور اس کے بعد کے حالات کا بیان فرمایا ہے۔ اور اسی سبب سے الٓمٓ سے اُن سورتوں کو موسوم کیا ہے۔ تاکہ اُن تینوں حرفوں سے اُن تین مطالب عظیمہ کی طرف اشارہ ہو۔ اور انہی مطالب عظیمہ کا ذکر ان سب سورتوں میں تھا اس لئے ان سب کو ایک ہی نام سے موسوم کیا ✦

لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۱) الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲) وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَۃِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (۳)	پرہیزگاروں کے لئے اس کے رہنما ہونے میں کچھ شک نہیں (۱) جو آنکھ سے اوجھل پر ایمان لاتے ہیں، اور درستی سے نماز کو ادا کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے دیتے ہیں (۲) اور جو لوگ اُس پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا تھا، اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں (۳)

علمائے اسلام نے رفع التباس کے لئے اُن سورتوں کے نام کے ساتھ جن کے متحد نام تھے یا جن میں حروف مقطعات زیادہ تھے۔ یا کسی سورت کے اہم مضمون پر زیادہ وضاحت سے اشارہ کرنے کی غرض سے اور نیز اُن سورتوں کے لئے جو کسی نام سے موسوم نہ تھیں۔ اُسی یہودی قاعدہ کے مطابق اُسی سورت میں سے کوئی لفظ اُس سورت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے منتخب کیا۔ جو رفتہ رفتہ بطور اُن سورتوں کے نام کے متصور ہونے لگے مگر درحقیقت وہ الفاظ ہیں جو علماء نے اُن سورتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اختیار کئے ہیں *

(الکتاب) خدا اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ الٓمٓ یعنی اُس کا مسمّٰے وہ کتاب ہے یعنی وہ کتاب جو ہم تجھ پر نازل کرتے ہیں۔ عام بول چال کا محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی کتاب تصنیف کرنی یا لکھنی شروع کرے۔ یا شروع کرنی چاہے۔ تو قبل اس کے کہ وہ لکھی جا چکے یا تصنیف ہو چکے اُس پر کتاب کا لفظ بولتا ہے۔ اس خیال سے کہ وہ تصنیف ہو چکنے اور لکھے جا چکنے کے بعد کتاب ہو گی اسی طرح خدا تعالےٰ نے بھی قرآن مجید پر قبل اُس کے لکھے جانے کے کتاب کا اطلاق کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کی مرضی تھی کہ لکھی جاوے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جس قدر قرآن نازل ہوتا تھا اُسی وقت آنحضرت ہی کے وقت میں لکھ لیا جاتا تھا *

(لا ریب فیہ) کے معنی اگلے مفسرین نے یہ بیان کئے ہیں کہ اُس کے خدا کی طرف سے ہونے میں کچھ شبہ نہیں، گویا یہ خطاب ہے اُن لوگوں کی طرف جو قرآن کے خدا کی طرف سے ہونے میں جب کہ وہ نازل ہوتا تھا شک کرتے تھے، اور بطور یقین کے بلا دلیل بیان کرنا اس بات پر اشارہ ہے کہ یہ دعویٰ ایسے دلائل سے ثابت ہے یا ثابت ہو گا کہ جو بمنزلہ بدیہی کے ہیں، جیسے کہ عام بول چال میں دستور ہے کہ جو بات یقینی ہوتی ہے اُس کی دلیلیں بیان کرنے سے پہلے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس بات میں کچھ شک نہیں اور پھر اُس کی دلیل بیان کی جاتی ہے *

مگر میری سمجھ میں اس مقام میں اُن معنوں کے اختیار کرنے سے دوسرے معنی اختیار کرنے بہتر ہیں، خدا تعالےٰ نے اس جگہ تین فرقوں کا حال بیان کیا ہے۔ ایمان والوں کا۔ کافروں کا۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	وہی اپنے پروردگار کی مہربانی سے سیدھی راہ پر ہیں، اور وہی مراد کو پہنچے ہیں ﴿۴﴾ ہاں جو کفر میں پڑے ہیں

منافقوں کا - جو دل میں کافر ہیں اور جھوٹ موٹ ظاہر میں اپنے تئیں مسلمان گنتے ہیں، پہلا ریب فیہ کے ایسے معنی لینے زیادہ تر مناسب ہیں جو ان فرقوں میں سے کسی کے حال کے مناسب ہوں، اور وہ یہ معنی ہیں کہ اِس کتاب کے پرہیزگاروں یعنی ایمان والوں کے لئے ہادی ہونے میں کچھ شک نہیں، جو اس کتاب کو مانتے ہیں اور اُس کی ہدایتوں پر چلتے ہیں، جن میں سے سب سے بڑا حکم خدا پر ایمان لانا اور نماز کا ادا کرنا اور خیرات کا دینا ہے - اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو لوگ اِس کتاب کو مانتے ہیں وہی اِس کتاب سے ہدایت پائینگے، اور جو نہیں مانتے وہ ہدایت نہیں پا سکتے گو کہ فی نفسہ سب کے لئے ہدایت ہو، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً ایک دوا جو فی نفسہ کسی مرض سے شفا دینے والی ہے تو وہ فی نفسہ تو اُس مرض کے سب مریضوں کے لئے شفا ہے الا شفا وہی پائینگے جو اُس کا استعمال کرینگے، اسی طرح قرآن بھی سب کے لئے ہدایت ہے، مگر ہدایت وہی پائینگے جو پرہیزگار ہیں یعنی وہ جو اُس کی ہدایتوں پر چلتے ہیں *

اگر یہ معنی تسلیم کئے جاویں تو "ھدی" کا لفظ بدل ہے ضمیر مجرور سے جو "فیه" میں ہے اور جار مجرور ثابتٌ یا کائنٌ سے متعلق ہو کر لا نفی جنس کی خبر ہے یعنی "لا ریب فی کونه ھادیاً للمتقین" جس کے معنی یہ ہوئے کہ پرہیزگاروں کے لئے قرآن کے ہادی ہونے میں کچھ شک نہیں *

﴿۳﴾ (غیب) اُسے کہتے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو، مگر یہاں اُس ذات پاک سے مراد ہے جو باوجود ہونے کے نہ آنکھ سے اور نہ کسی اور حواس سے محسوس ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے، اور بجز اس کے کہ عقل یہ کہتی ہے کہ ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتی، اُس تفسیر میں جو عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب ہے یہ لکھا ہے "ویقال الغیب ھو اللہ" پس معنی یہ ہوئے کہ پرہیزگار وہ ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں *

﴿۸﴾ (انّ الّذین کفروا) جو لوگ کفر میں پڑے ہیں اُن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے۔ "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" مگر کسی مفسّر نے اُس کے حقیقی معنی مراد نہیں لئے، کیونکہ نہ کسی انسان کے دل پر اور نہ کان پر سچ مچ کی مُہر لگی ہوئی ہے، اور نہ کسی کی آنکھوں پر سچ مچ پردہ پڑا ہوا ہے، بلکہ سچ بات کے نہ سمجھنے اور حق بات کے نہ سُننے اور ٹھیک بات پر نہ غور کرنے کو بطور استعارہ دلوں پر اور کانوں پر مُہر کر دینے اور آنکھوں پر پردہ

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶﴾	خواہ اُن کو ڈراؤ خواہ نہ ڈراؤ اُن کو سب برابر ہے وہ ایمان نہیں لانے کے ﴿۵﴾ مہر کر دی ہے اللہ نے اُن کے دلوں پر، اور اُن کے کانوں پر، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۶﴾

ڈالنے سے بیان کیا ہے*

بلا تشبیہ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے کہ ایک ناصح شفیق کسی کو افعال ذمیمہ چھوڑنے اور اخلاق حمیدہ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہو، مگر وہ شخص اس کی نصیحت پر کان نہ دھرتا ہو، اور ایک شخص فصیح و بلیغ اس حالت کو دیکھ کر کہے کہ "بد ذاتوں نا اہلوں کو تم نصیحت کرو یا نہ کرو وہ کبھی نہیں مانینگے، اُن کے دل پتھر کے ہیں اور آنکھیں اندھی اور کان بہرے، خدا نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے"، پس جس محاورہ میں انسان اس طرح بات چیت کرتے ہیں اُسی انسانی محاورہ پر خدا نے بھی کلام کیا ہے*

(مسئلہ جبر و اختیار) اِن آیتوں سے یا اور آیتوں سے جو اُس کی مثل ہیں جبر و اختیار کے مسئلہ پر بحث کرنا قرآن مجید کے سیاق کلام کے منافی ہے، قرآن مجید کی کسی آیت سے نہ انسان کے اپنے افعال میں مجبور ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے نہ مختار ہونے پر، نہ بین الجبر والاختیار ہونے پر، مگر افسوس ہے کہ علمائے متقدمین نے اس پر بحث کی ہے، اور غلطی سے اُس کو ایک ایسا مسئلہ سمجھا ہے جو مسائل اسلام میں داخل ہے، اور جو وحی یا قرآن سے ثابت ہے۔ اور پھر آپس میں مختلف رائیں قرار دی ہیں، ایک گروہ انسان کے اپنے افعال میں مجبور ہونے کا قائل ہے، دوسرا گروہ مختار ہونے کا، اور تیسرا بین الجبر والاختیار کا، جو بالفعل مذہب اہلسنت و جماعت کا ہے*

انسان اپنے افعال میں مجبور ہو یا مختار یا بین الجبر والاختیار یہ ایک جدا مسئلہ ہے، جو انسان کی فطرت کی تحقیقات پر منحصر ہے، اور اُس کی فطرت پر مباحثہ کرنے کے بعد جو ثابت ہو، ہو، ہمارا مقصد اس مقام پر صرف اس قدر کہنا ہے کہ قرآن مجید سے ان باتوں میں سے کسی پر استدلال کرنا، اور اس کو ایک مسئلہ اسلام منزل من اللہ سمجھنا غلطی ہے۔ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے جا بجا بندوں کے افعال کو، بلکہ ہر ایک چیز کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، جو کام بندوں سے ہوتے ہیں اُن کی نسبت فرماتا ہے، کہ ہم نے کیا، یا جو چیزیں کہ اور اسباب سے پیدا ہوتی ہیں، اُن اسباب کو بیچ میں سے نکال کر فرماتا ہے، کہ ہم نے کیا، ہم نے مینہ برسایا، ہم نے درخت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑦	اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور اخیر دن پر ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے ⑦

اُگائے، ہم نے دریا بہائے، ہم نے سمندر میں جہاز تیرائے، ہم نے اُڑتے جانور ہوا میں تھمائے، پس اس طرز کلام سے واسطوں کا درحقیقت درمیان میں نہ ہونا یا اُس شے کا اُن افعال میں مجبور یا مختار ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی عظمت و شان اور اپنے علۃ العلل یعنی تمام چیزوں کی اخیر علت یا خالق ہونے کا بندوں پر اظہار مقصود ہوتا ہے، اور اس لئے اس قسم کے کلام سے انسان کا اپنے افعال میں مجبور یا مختار ہونے کا استنباط و استدلال کرنا صحیح نہیں ہوسکتا، بلکہ ایسا کرنا داخل تفسیر القول بما لا یرضی قائلہ کے ہے، کیونکہ اس کلام سے اِس بات کی حقیقت کا بیان کرنا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار یا بین الجبر والاختیار مقصود ہی نہیں ہے ✦

خدا اپنے تئیں علۃ العلل جمیع کائنات کا بتاتا ہے، پس اگر تمام حوادث و افعال کو جو عالم میں تمام مخلوقات، انسان، حیوان، عناصر، قویٰ وغیرہ سے ہوتے ہیں اپنی طرف نسبت کرے، اور ہر چیز کی نسبت یہ کہے کہ ہم نے کیا، تو یہ نسبت صحیح و درست ہوگی۔ علاوہ اس کے مصری اور یونانی حکما کا یہ خیال تھا کہ دو چیزیں ازلی اور ابدی ہیں، ایک خدا، اور ایک مادہ، خدا نے اُس قدیم اور ازلی مادہ سے تمام دنیا کو بنایا اور رچایا ہے، اور ایک گروہ زردشتیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ دو مقابل کے وجود ہیں، ایک یزدان یعنی خدا، دوسرا اہرمن یعنی شیطان، نیک کام خدا کرتا ہے اور بد کام شیطان، اور یہ مذہب اُس ریگستان میں بھی پھیل گیا تھا جہاں اِن غلطیوں کا اصلاح کرنے والا پیدا ہوا تھا، خدا تعالیٰ کو قرآن مجید میں اُن دونوں عقیدوں کا مٹانا اور اپنی ذات واحد کو خالق جمیع کائنات بتانا اور اپنے تئیں وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ جتانا مقصود تھا ✦

پس سب سے عمدہ طریقہ اس باریک مسئلہ کے سمجھانے کا یہی تھا کہ تمام افعال کو اُن کے تمام واسطوں کو دور کر کر خاص اپنی طرف منسوب کرے، اور کبھی اِن واسطوں کی طرف، تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ علۃ العلل صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک ہے، اور جو واسطے ہم کو دکھائی دیتے ہیں، بلاشبہ وہ واسطے ہیں، مگر علۃ العلل اُن سب کی وہی ایک ذات وحدہٗ لاشریک ہے، بس جس کلام کا یہ موضوع ہو اُس سے اِس مطلب کو نکالنا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار یا بین الجبر والاختیار اُس کلام کو غیر ما وضع لہٗ میں استعمال کرنا ہے۔ ہاں یہ ایک تمدنی اور طبعی اور عقلی مسئلہ ہے

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ⑧ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	دھوکا دیتے ہیں اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، حالانکہ وہ بجز اپنے آپ کے اور کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور سمجھتے نہیں ⑨ ان کے دلوں میں بیماری ہے

جس پر انسان کی خلقت کے لحاظ سے بحث اور غور ہو سکتی ہے جس کو ہم مختصراً بیان کرتے ہیں ❖

ف دو طرح پر انسان اپنے افعال میں مجبور ہے

اُن علما اور حکما نے جنہوں نے انسانی فطرت پر غور کی ہے، دو طرح پر انسان کو اپنے افعال میں مجبور پایا ہے، ایک امور خارجیہ کے سبب سے جب کہ قومی و ملکی و تمدنی امور کی اُلفت و مؤانست کا، اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کا اُس پر ایسا قوی اثر ہوتا ہے کہ وہ انہی افعال کو مستحسن سمجھتا ہے، اور اُنہی کے کرنے پر اُس کا دل اس کو مجبور کر دیتا ہے گو یہ مجبوری اکثر اُس کی سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ بظاہر اُس پر کسی کا جبر نہیں ہوتا، مگر درحقیقت انہی قومی و ملکی و تمدنی اور بچپن سے کسی امر کی ممارست و تربیت و صحبت کا اثر رفتہ رفتہ بے معلوم اُس میں ایسا سرایت کر جاتا ہے کہ جس سے اُن افعال کے کرنے پر جن کو وہ کرتا ہے مجبور رہتا ہے، اور جن باتوں کو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے کرتا ہوں۔ درحقیقت وہ اُسی قوی اثر کے سبب سے مجبوری کرتا ہے ❖

دوسری قسم کی مجبوری اپنے افعال میں خود انسان کو اپنی خلقت کے سبب سے ہوتی ہے، ہم تمام دنیا کی چیزوں میں اُن کی ایک فطرت پاتے ہیں جس کے برخلاف ہرگز نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معدنی چیزیں ہوا میں نہیں اُڑتی پھرتیں، پانی ہوا کے اوپر نہیں رہتا، مچھلی زمین پر زندہ نہیں رہتی، درندے جانوروں سے درندگی، پرندے جانوروں سے پرواز، آبی جانوروں سے شناوری، کبھی زائل نہیں ہوتی، پس وہ سب ان افعال کے سرزد ہونے میں جو اُن سے منسوب ہیں بمقتضائے اپنی خلقت کے مجبور ہیں ❖

اسی طرح ہم انسانوں میں بھی دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے افعال میں بمقتضائے اپنی فطرت کے مجبور ہیں، جس کی آنکھ خدا نے ایسی بنائی ہے جس سے دُور کی چیز دکھائی دیتی ہے، تو وہ دُور کی چیز دیکھنے میں مجبور ہے۔ اسی طرح انسانوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ جو افعال ظاہری و باطنی اُن سے سرزد ہوتے ہیں، وہ اُن میں مجبور محض ہیں، اگر بالفرض ایک نہایت رحمدل نیک طبیعت شخص کے اعضا، دل و دماغ کی بناوٹ، ایک نہایت شقی القلب بیرحم بدذات آدمی کی سی ہوتی، تو اُس سے بھی وہی افعال صادر ہوتے جو اُس بدذات سے ہوتے ہیں۔ اگر ایک بیوقوف آدمی کے اعضا کی بناوٹ ایک عقلمند آدمی کے اعضا کی بناوٹ سے تبدیل ہو سکے، تو اس عقلمند سے اُس بیوقوف کیسے افعال اور اُس بیوقوف سے اس عقلمند کیسے افعال سرزد ہونے لگینگے۔ غرضکہ علم تشریح ابدان سے

ف کسر اول و سکون لام و بعضے بفتح لام و مشدد۔ [illegible]

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا	پھر خدا نے اُن کی بیماری کو بڑھا دیا

ثابت ہوگیا ہے کہ جس قسم کی بناوٹ انسان کی ہوتی ہے اُسی کے مناسب افعال خواہ نخواہ اُس سے سرزد ہوتے ہیں، نہایت بیرحم سفاک قاتلوں کی کھوپری میں ایک خاص قسم کی بناوٹ ہے، اور تحقیقات سے ثابت ہُوا ہے کہ ہر قاتل وسفاک کی کھوپری اُسی بناوٹ کی ہوتی ہے، پس جس کی کھوپری اُس بناوٹ کی ہوگی، وہ ضرور سفاک قاتل بیرحم ہوگا، اور جو بیرحم سفاک قاتل ہوگا اُس کی کھوپری اُسی بناوٹ کی ہوگی، پس اُن افعال میں جو خلقت انسانی سے علاقہ رکھتے ہیں انسان مجبور ہے، اور یہ ایسی بدیہی باتیں ہیں جن سے کوئی بھی جب کہ وہ اُس علم میں واقفیت حاصل کرے انکار نہیں کرسکتا ✦

اس کو اور صاف طرح سے غور کرو جس کو ہر کوئی سمجھ سکے، بعض لوگ ایسے ہیں جن کا حافظہ بہت قوی ہے، بعضے ایسے ہیں جن کو کوئی بات یاد نہیں رہتی، بعضے ایسے ہیں جن کے قوٰے قوی ہیں، بعضے نہایت ضعیف القوٰے ہیں، بعضے ایسے ہیں کہ کسی کام کو ایسا عمدہ کرتے ہیں کہ اوروں سے باوصف کوشش کے ایسا نہیں ہوسکتا، کسی کا ہاتھ خوشنویسی کے لائق ہوتا ہے، کسی کا مصوری کے، کسی کا دماغ علم ادب کے مناسب ہوتا ہے، کسی کا ریاضی کے، کسی کی بناوٹ کسی خاص امر کے لیے ایسی مناسب ہوتی ہے کہ اُس کی مثل دوسرا نہیں ہوسکتا، پس یہ تمام تفاوت انسانوں میں فطرت کے باعث سے ہیں، اور جو افعال کہ اُس فطرت پر مبنی ہیں اُن کے صادر ہونے میں وہ مجبور ہیں ✦

باایںہمہ ہم انسانوں میں ایک اور چیز بھی پاتے ہیں جو نیک و بد میں تمیز کرسکتی ہے، یا ایک بات کو دوسری بات پر ترجیح دے سکتی ہے۔ یہ قوت بھی کبھی بلکہ اکثر قومی و مُلکی وتمدنی امور کی اُلف وموانست سے، اور بچپن سے کسی امر کی ممارست وتربیت وصحبت کے اثر سے مُوثر ہوجاتی ہے، اور اُس قوت کی ایسی حالت کو تمام اہل مذاہب کانشنس یعنی نورِ ایمان ونورِ دھرم سے تعبیر کرتے ہیں، مگر درحقیقت وہ قابل اعتماد اور لائق اطمینان کے نہیں ہے، کیونکہ اس کا دوست وغیر دوست دونوں قسم کے اثروں سے مُوثر ہونا، اور مخالف اثروں سے ایک ہی نتیجہ حاصل ہونا ممکن ہے، ایک مسلمان کے لئے کسی بُت کو سجدہ کرنا جس قدر اُس کے نورِ ایمان کے برخلاف ہے ویسا ہی ایک بُت پرست کے نورِ دھرم کے موافق ہے، پس ایک شے دو مخالف نتیجے پیدا کرتی ہے ✦

مگر اس کے سوا ایک اور قوت بھی انسان میں پائی جاتی ہے جو اُن تمام اثروں پر غالب ہوجاتی ہے اور جس کو میں نورِ قلب یا نورِ فطرت کہتا ہوں۔ ہمارے پاس بہت سے لوگوں کی نسبت تاریخی شہادت موجود ہے جنہوں نے بچپن سے ایک خاص قوم کی رسم وعادات میں تربیت پائی، اور اُنہی مُلکی وتمدنی باتوں کے سوا اور کوئی خیال اُن کے دل میں نہیں گذرا۔ اور زمانہ دراز تک اُسی قومی ومُلکی وتمدنی امور

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ﴿۹﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾	اور اُن کے لئے دُکھ دینے والا عذاب ہے، اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے ﴿۹﴾ اور جب اُن سے کہا جاوے کہ مت بگاڑ ڈالو دنیا میں تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم سنوارنے والے ہیں ﴿۱۰﴾ ہاں وہی ہیں بگاڑنے والے پر سمجھتے نہیں ﴿۱۱﴾

کی اِلف و موانست میں رہے، اور ایک ہی سی صحبت پائی، اور ایک ہی سی تربیت ہوئی، اور پھر خود اُنھوں نے اپنی سوچ سمجھ اور غور و فکر سے جس کو الہام کہنا چاہئیے اُن تمام بندشوں کو توڑا، اور اُن کے عیبوں کو جانا، اور اپنے تئیں اُس سے آزاد کیا، اور اور لوگوں کے آزاد کرنے میں کوشش کی ٭

یہ قوت فکری کم و بیش تمام انسانوں میں فطری ہے، اور ہر شخص خود اپنے حال پر فکر کر سمجھ سکتا ہے کہ وہ اُس کے کام میں لانے پر قادر ہے، اور یہی وہ قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کرتی ہے، اور اصلی سچ کو پرکھ لیتی ہے، اور انسان کو اپنی حالت کی اصلاح پر متوجہ کرتی ہے، اور تمام بوجھوں کو جو انسان پر بسبب اُس کے ملکی و تمدنی و آبائی رسم و رواج کی الف و موانست سے ہوتے ہیں اُن کو اُٹھا دیتی ہے، اسی قوت کو زندہ رکھنے اور کام میں لانے کی، اور اس بوجھ یعنی ملکی و تمدنی و آبائی رسم و رواج کی الف و موانست کے اُٹھانے کی جا بجا قرآن میں ہدایت ہوئی ہے، اور یہی قوت ہے جس کے باعث انسان مکلف ہوا ہے، اور دیگر حیوانات سے افضل کہا گیا ہے ٭

یہ سچ ہے کہ یہ قوت بھی انسانوں میں بمقتضائے اُن کی خلقت کے قوی اور ضعیف ہے، مگر معدوم نہیں، اور جن میں معدوم ہے وہ مکلف نہیں، بلکہ مرفوع القلم ہے کبھی یہ قوت پند و نصیحت اور سمجھانے بجھانے اور دلیلوں اور نشانیوں کے بتانے اور صحبت کے اثر سے تحریک میں آجاتی ہے، جیسے کہ اُن لوگوں کا حال ہوتا ہے جو سچی راہ بتانے والوں کی ہدایتوں کو سمجھ کر اور یقین کر کر پیروی کرتے ہیں، بشرطیکہ اُس پیروی کی اور کوئی ایسی وجہ نہ ہو جس نے انسان کو خفیہ خفیہ اپنے افعال پر مجبور کر دیا ہو، اور اُس نے اُس فطری قوت کو بغیر کام میں لائے اُس خفیہ مجبوری سے وہ پیروی نہ کی ہو۔ اور کبھی وہ قوت فطری ایسی قوی ہوتی ہے کہ خود بخود اُس میں سے وہ روشنی اُٹھتی ہے، اور حق و باطل میں فرق دکھاتی ہے، اور ملکی و تمدنی و آبائی رسم و رواج کی الف و موانست کے بوجھ کو اُٹھا دیتی ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو شرع کی زبان میں پیغمبر اور تمدنی اصطلاح میں رفارمر کہلاتے ہیں ٭

یہی قوت تھی جس نے ایک جوان کے دل کو خود اپنی روشنی سے روشن کر دیا، جو "اور کلدانیان" میں رہتا تھا، اور جس کا نام ابراہیم تھا، بچپن سے اُس نے اپنے پیارے باپ کی گود میں پرورش پائی،

قوت انسانی کا مکلف اشرف مخلوقات ہونا

ف وہ فطرت کا قوی و ضعیف ہونا

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿۱۲﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿۱۳﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۴﴾

اور جب اُن سے کہیں کہ تم اُسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم اُس طرح ایمان لاویں جس طرح بیوقوف ایمان لائے ہیں، ہاں وہی ہیں بیوقوف پر جانتے نہیں ﴿۱۲﴾ اور جب وہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں، اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھی ہیں، ہم تو اُن سے بجز ٹھٹھا کرنے کے اور کچھ نہیں کرتے ﴿۱۳﴾ اللہ اُن سے ٹھٹھا کرتا ہے، اور اُن کو اُنکی گمراہی میں بہکاتے ہوئے ڈالے رکھتا ہے ﴿۱۴﴾

بجز بتوں کے اُس کی آنکھ نے کچھ نہیں دیکھا، اور بجز بتوں کی پرستش کے نغموں کے اُس کے کانوں نے کچھ نہیں سُنا، اور پھر سمجھا تو یہ سمجھا کہ ہائے میرا پیارا باپ اور میری پیاری قوم بڑی گمراہی میں ہے۔ یہ سوچ کر گھبرایا اور چاروں طرف دیکھنے لگا کہ پھر سچ کیا ہے؟ چاند کو روشن دیکھ کر خیال کیا کہ شاید یہ سچ ہو سورج کو چمکتا دیکھ کر سوچا کہ شاید یہ سچ ہو۔ مگر اُس نورِ فطرت نے بتایا کہ یہ سب جھوٹ ہے، اُس نے سب سے مُنہ موڑا اور سچی بات پکار اُٹھا کہ "إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ" ✢

ایک یتیم بن ماں باپ کے بچے کا حال سنو، جس نے نہ اپنی ماں کے کنار عاطفت کا لطف اُٹھایا نہ اپنے باپ کی محبت کا مزہ چکھا، ایک ریگستان کے ملک میں پیدا ہُوا، اور اپنے گرد بجز اونٹ چرانے والوں کے غول کے کچھ نہ دیکھا، اور بجز لات ومنات وعزےٰ کو پکارنے کی آواز کے کچھ نہ سُنا، مگر خود کبھی نہ بھٹکا، اور کہا تو یہ کہا، کہ "أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ" پس یہ تمام روشنیاں اُس نورِ فطرت کی خود آپ ہی آپ روشن ہوئی تھیں، اور جنہوں نے نہ صرف اُن کو بلکہ تمام جہان کو منور کردیا ✢

﴿۱۲﴾ (وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ) اِن آیتوں میں اُس گفتگو کا اشارہ ہے جو منافق اور کافر آپس میں کرتے تھے، یعنی کافر سمجھتے تھے کہ منافقوں کا اِس طرح ظاہر میں اپنے تئیں مسلمان جتانا فساد ڈالنا ہے، تو وہ اُن سے کہتے تھے کہ تم فساد مت ڈالو، اور اپنے تئیں مسلمان مت جتلاؤ، یا جس طرح اور لوگ سچ مچ مسلمان ہوگئے ہیں تم بھی ہو جاؤ، تو وہ اُن کو جواب دیتے تھے کہ ہمارا ظاہر میں مسلمانوں میں ملا رہنا فساد کی بات نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے، نہ ہم اور بیوقوفوں کی طرح ایمان لاسکتے ہیں، خدا تعالےٰ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۵﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿۱۶﴾	یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دیکر گمراہی کو خریدا ہے، پھر اُن کی تجارت نے کچھ فائدہ نہ دیا، اور نہ اُنہوں نے ہدایت پائی ﴿۱۵﴾ اُن کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی شخص نے آگ جلائی، پھر جب اُس آگ نے جو کچھ کہ اُس کے اردگرد ہے اُس کو روشن کیا تو اللہ نے روشنی دیکھنے والوں کی روشنی چھین لی اور اُن کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے ﴿۱۶﴾

نے اُن منافقوں کی ان دونوں باتوں کی بُرائی بتلائی، اور ان آیتوں سے اگلی آیت میں اس طرح کی گفتگو کا سبب فرمایا، کہ اُس طرح کی گفتگو کا سبب یہ تھا۔ کہ منافق جب مسلمانوں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب کافروں میں جاتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے اپنے تئیں مسلمان بتلا کر ٹھٹھا کرتے ہیں، ہم تو درحقیقت تمہارے ہی ساتھی ہیں، کافر تو منافقوں کو اِس لئے مفسد بتاتے تھے کہ وہ کافروں کو دھوکے میں ڈالتے تھے، اور خدا نے اُن کو اس لئے مفسد بتایا کہ مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے، منافق سچے مسلمانوں کو بیوقوف بتاتے تھے، مگر خدا نے اُنہیں کو بیوقوف بتایا ✦

﴿۱۴﴾ (اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ) اِس لفظ سے یہ بحث کرنی کہ خدا کی شان سے ٹھٹھا کرنا کیونکر ہو سکتا ہے، ٹھٹھے کی بات ہی، لوگوں میں بڑی غلطی ہے جو قرآن مجید کے ہر ایک لفظ کے (قطع نظر کر کر انسانی محاورہ سے) حقیقی و لغوی معنی لینے چاہتے ہیں، قرآن مجید جیسا کہ ہم یقین کرتے ہیں بیشک خدا کا کلام ہے، مگر وہ انسانوں کی زبان میں اور انسانوں کے محاورہ بات چیت میں بولا گیا ہے، پس جس طرح کہ ایک انسان دوسرے انسان سے بات کرتا ہے، اور اپنی گفتگو میں مجاز و استعارہ کنایہ کا استعمال کرتا ہے، اور بعضی دفعہ عام مشہوریات کو بطور استدلال کے لاتا ہے، اور کبھی مخاطب کی وسعت علم و عقل و فہم کے مطابق طرز کلام اختیار کرتا ہے، کبھی محال امر کو محال بات پر تعلیق کرتا ہے، کبھی مزاحاً کوئی بات کہتا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی سمجھنا چاہئے، اور اُنہی اصولوں پر اُس کے معنی قرار دینے لازم ہیں۔ کبھی کبھی آپس میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہم کو کیا چڑاتا ہے، ہم ہی اُسکو چڑاتے ہیں حالانکہ وہ اُس کو کچھ نہیں چڑاتے، بلکہ اُسی کے چڑانے کو اپنا چڑانا تعبیر کرتے ہیں، اور اس سے مقصود صرف اُس شخص کی بیوقوفی کا جتلانا ہوتا ہے۔ اسی طرح کافروں کی بیوقوفی جتلانے کو اس مقام پر خدا نے فرمایا کہ کافر مسلمانوں سے کیا ٹھٹھا کرتے ہیں، خدا اُن سے ٹھٹھا کرتا ہے، جو اُن کو ایسی حالت میں چھوڑ رکھا ہے، پس کہ کافروں کا مسلمانوں سے ٹھٹھا کرنا ہی خدا کا کافروں سے ٹھٹھا کرنا ہے ✦

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷﴾ اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَ اللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۸﴾ یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ

گونگے ہیں بہرے ہیں اندھے ہیں پھر وہ (راہ پر) نہیں پلٹنے کے ﴿۱۷﴾ یا اُن کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے موسلادھار مینہ کا برسنا جس میں اندھیری اور کڑک اور چمک ہے، بجلی کی کڑک سے موت کے ڈر کے مارے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہیں، حالانکہ خدا کافروں کو گھیرے ہوئے ہے ﴿۱۸﴾ بجلی اُنکی بینائی اُچک لیتی ہوئی لگتی ہے، جب اُن کو روشنی معلوم ہوتی ہے تو اُس میں چلتے ہیں،

﴿۱۶﴾ (مَثَلُهُمْ) میں آگ جلانے والا یا موسلادھار مینہ، مشبہ بہٖ نہیں ہیں، بلکہ منافقوں کی حالت کو اُن لوگوں کی حالت سے تشبیہ دی ہے جنہوں نے آگ جلانے والے کی روشنی دیکھی اور پھر اندھیرے میں پڑ گئے [رات کو رستہ چلنے والے جلتی ہوئی آگ دیکھ کر رستہ پہچانتے اور قافلہ کے لوگوں کا پڑا ہونا خیال کرتے تھے اور جب آگ بجھ جاتی تھی تو اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے حیران کھڑے رہجاتے تھے] یا جنہوں نے بجلی کی خوفناک چمک میں رستہ دیکھا اور پھر اندھیرے میں کھڑے رہ گئے، یہ دونوں تشبیہیں منافقوں کے حال کے مطابق تھیں کہ اسلام کی روشنی سے کچھ کچھ راہ پر آتے تھے اور پھر گمراہی کے اندھیرے میں ٹکراتے رہ جاتے تھے +

﴿۱۹﴾ (یَكَادُ الْبَرْقُ) اِن آیتوں میں خدا تعالےٰ نے فطرت انسانی کی وہ حالت بیان فرمائی ہے جو ایسے موقعہ پر مینہ اور کڑک وچمک میں خوف سے ہوجاتی ہے، اور تھوڑا سا رستہ بھی دکھائی دیجاتا ہے اور اس ظاہری تمثیل سے اُس تھوڑی سی ہدایت اور زیادہ تر گمراہی کی تمثیل سمجھائی ہے جو منافقوں کے حال کے مناسب تھی، اور آخر کو اپنی قدرت کے قانون اور اپنے وجود کے آثار اور اپنی حکمت کاملہ کی نشانیوں سے اپنے ہونے پر استدلال کیا ہے۔ تمام قرآن میں جس عمدگی وخوبی سے نوامیس قدرت سے خدا تعالےٰ نے اپنے وجود پر استدلال کیا ہے درحقیقت نہایت پیارا اور دل میں اثر کرنے والا بے مثل اور بے نظیر ہے، اور یہ ایسا عمدہ طریقہ استدلال کا ہے جو عالم اور جاہل سب کی سمجھ میں آتا ہے +

﴿۲۱﴾ (مِمَّا نَزَّلْنَا) سے مراد قرآن ہے، جو نبی پر بذریعہ وحی کے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، پس اس مقام پر جب تک کہ وحی ونبوت کی حقیقت نہ بیان ہو اُس وقت تک اس آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا +

وحی تو وہی ہوتی ہے جو خدا سے پیغمبر کو دیجاتی ہے، مگر اگلے مفسروں نے اُس کا بیان کہ

وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۱۹) الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۰) وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا

اور جب اُن پر اندھیرا چھاجاتا ہے تو کھڑے رہجاتے ہیں، اور اگر خدا چاہے تو اُن کی سماعت اور بینائی لیجاوے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اے لوگو اپنے پروردگار کی بندگی کرو جس نے تم کو اور جو تم سے پہلے تھے اُن کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار ہو (۱۹) (خدا وہ ہے) جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو ڈیرہ† اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل اُگائے، پھر اللہ کی برابر کسی کو مت کرو، اور [یہ سب باتیں] تم جانتے ہو (۲۰) اور اگر تم شک میں پڑے ہو اُس چیز میں جو ہم نے نازل کی ہے

† البناء مصدر سمی به المبنی بیتا کان قبة او خباء او طرافا وابنیة العرب اخبتهم ومنه بنی علی امرئته لانهم کانوا اذ تزوجوا ضربوا علیها خباء احدیدًا (کشاف و بیضاوی)

وہ کیونکر دیجاتی ہے ٹھیک طور پر نہیں کیا، اُنہوں نے خدا و رسُول کو دنیا کے بادشاہ اور وزیر کی مانند اور وحی کو بادشاہ کے کلام یا حکم یا پیغام کی مانند سمجھا ہے، اور جبرئیل کو ایک مجسم فرشتہ بادشاہ وزیر میں ایلچی پیغام لیجانے والا قرار دیا ہے ❖

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں ارقام فرماتے ہیں کہ آسمان پر جبرئیل خدا کا کلام سُن کر آنحضرت پر اُترتے تھے اور وہ پیغام کہدیتے تھے۔ پھر اس تقریر پر اُن کو یہ مشکل پیش آئی کہ خدا کے کلام میں تو حروف اور آواز نہیں ہے، پھر جبرئیل نے وہ کیونکر سُنا ہوگا، پھر اُس کا جواب یہ دیا ہے کہ ممکن ہے کہ خدا تعالٰے نے جبرئیل میں ایسی سماعت پیدا کی ہو جو خدا کا کلام سُن لیتا ہو، پھر اُس میں قدرت رکھی ہو کہ وہ عبارت میں اُس کی تعبیر کرسکے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خدا نے لوح محفوظ میں اسی ترتیب سے قرآن پیدا کردیا ہو، اور جبرئیل نے اس کو پڑھ کر یاد کرلیا ہو۔ یا یہ ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز جسم دار میں سے خاص طرح کی آوازیں ٹھیر ٹھیر کر نکالی ہوں اور جبرئیل نے بھی اُسی کے ساتھ آواز ملائی ہو، پھر اللہ تعالٰے نے جبرئیل کو بتا دیا ہو کہ یہی وہ عبارت ہے، جو ہمارے کلام قدیم کو پورا ادا کردیتی ہے ❖

یہ تقریریں ہمارے علمائے قدیم کی اُسی قسم کی تقریریں ہیں جن پر آج لوگ ہنستے ہیں، اور

عَلٰی عَبْدِنَا	اپنے بندے پر

قرآن مجید اور مذہب اسلام کو مثل اس تقریر کے لغو سمجھتے ہیں - امام صاحب نے اس بات پر غور نہیں فرمایا ہے ، کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت ہی میں ایسی سماعت یا لوح محفوظ میں سے پڑھنے کی قدرت یا جس جسم میں سے وہ اونچی نیچی آوازیں نکلتی تھیں - اُن سے کلام سمجھ لینے کی طاقت کیوں نہیں پیدا کی جو خدا کا کلام سُن لیتے اور سمجھ لیتے تاکہ اس تکلیف کی کہ جبرئیل سُنیں پھر اُس کی عبارت بنائیں پھر آنحضرت کو آکر سُنائیں حاجت نہ رہتی - اِس کی بھی تشریح امام صاحب نے نہیں فرمائی کہ اُن اونچی نیچی آوازوں سے آواز ملا لینے کے بعد جبرئیل کو خدا نے کیونکر بتایا کہ یہ وہی عبارت ہے ، آیا اُنہی اونچی نیچی آوازوں سے ، اُن سے تو جاننا محال تھا کیونکہ دور لازم آتا ہے ، پھر اور کسی طرح بتایا ہوگا ، مگر پہلے ہی اسی طرح بتا دیا ہوتا ، ولاشک ان ہذہ ھفوات لیس لھا فی الاسلام نصیب " نبوت کو بھی علماء متقدمین نے ایک عہدہ سمجھا ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے یا جس کو منتخب کرتا ہے دیدیتا ہے ، جیسے بادشاہ اپنے بندوں میں سے کسی کو وزیر کسی کو دیوان ، کسی کو بخشی کر دیتا ہے ، اور وہ کسی منصب کو لیکر وہ کام شروع کرتا ہے ، اور مبعوث ہونے کے ٹھیک یہی معنی اُنہوں نے سمجھے ہیں ✦

مگر میری سمجھ یہ نہیں ہے ، میں نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتا ہوں - نبی گو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں کیوں نہ ہو ، نبی ہوتا ہے ، النبیّ نبیّ ولو کان فی بطن امّہ ، جب پیدا ہوتا ہے تو نبی ہی پیدا ہوتا ہے ، جب مرتا ہے تو نبی ہی مرتا ہے ✦

نبی کا لفظ یہودیوں میں زیادہ تر مستعمل تھا ، وہ اُس کو لفظ نباء سے مشتق کرتے تھے ، جس کے معنی خبر دینے کے ہیں - وہ اس بات کے قائل تھے کہ انبیاء مثل نجومیوں کے دنیا کی باتوں میں سے غیب کی بات یا آیندہ ہونے والی باتیں بتا دیتے ہیں ، شاید اتنا فرق سمجھتے ہوں کہ نجومی ستاروں کے حساب یا شیطانوں کے اسرار بتاتے تھے ، اور انبیاء ربانی کرشمہ سے ، پس جو شخص کوئی پیشینگوئی نہیں کرتا تھا ، اُس کو نبی یا پیغمبر نہیں کہتے تھے ، مگر اسلام میں اور مسلمانوں میں یہ خیال نہیں ہے ، وہ اُن سب کو جن پر خدا نے وحی نازل کی ہے نبی جانتے ہیں ، اور پیغمبر مانتے ہیں ، گو کہ اُس نے کوئی بھی پیشینگوئی نہ کی ہو ، بلکہ مذہب اسلام تو یہ بتاتا ہے کہ " لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ اِلَّا ھُوَ " یہی سبب ہے کہ قرآن مجید میں ہر ایک صاحب وحی کو نبی یا پیغمبر کہا گیا ہے جن میں سے اکثر کو جیسے داؤد و سلیمان کو یہودی نبی نہیں کہتے ✦

بہر حال اس لفظی بحث کو جانے دو ، نبوت درحقیقت ایک فطری چیز ہے جو انبیا میں مقتضاے ان کی فطرت کے مثل دیگر قواے انسانی کے ہوتی ہے جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے وہ نبی ہوتا ہے

ف نبوت فطری چیز ہے

ف ہر صاحب وحی نبی ہے

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ	تو تم لاؤ اُس کی مانند کوئی سورت

اور جو نبی ہوتا ہے اُس میں وہ قوت ہوتی ہے، جس طرح کہ تمام ملکات انسانی اس کی ترکیب اعضا، دل و دماغ و خلقت کی مناسبت سے علاقہ رکھتے ہیں، اسی طرح ملکۂ نبوت بھی اُس سے علاقہ رکھتا ہے، یہ بات کچھ ملکۂ نبوت ہی پر موقوف نہیں ہے، ہزاروں قسم کے جو ملکات انسانی ہیں بعضی قسم کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں ازروے خلقت و فطرت کے ایسا قوی ہوتا ہے کہ وہ اسی کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے، لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے، اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضاے اُس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے، وہ پیغمبر کہلاتا ہے۔ اور جس طرح کہ اور قواے انسانی بمناسبت اس کے اعضا کے قوی ہوتے جاتے ہیں اسی طرح یہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے، اور جب اپنی پوری قوت پر پہنچ جاتا ہے، تو اُس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کا مقتضی ہوتا ہے، جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں +

ف بعثت کے معنی

خدا اور پیغمبر میں بجز اُس ملکۂ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا، اُس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیات ربانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے، اُس کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا پاس پیغام لیجاتا ہے اور خدا کا پیغام لیکر آتا ہے، وہ خود ہی وہ مجسّم چیز ہوتا ہے جس میں سے خدا کے کلام کی آوازیں نکلتی ہیں، وہ خود ہی وہ کان ہوتا ہے، جو خدا کے بیحرف و بےصوت کلام کو سُنتا ہے، خود اُسی کے دل سے فوّارہ کی مانند وحی اُٹھتی ہے، اور خود اُسی پر نازل ہوتی ہے، اُس کا عکس اُس کے دل پر پڑتا ہے، جس کو وہ خود ہی الہام کہتا ہے، اُس کو کوئی نہیں بلواتا، بلکہ وہ خود بولتا ہے اور خود ہی کہتا ہے" وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ " +

ف خدا اور پیغمبر میں بجز ملکۂ نبوت کے کوئی اور واسطہ نہیں

جو حالات و واردات ایسے دل پر گذرتے ہیں، وہ بھی بمقتضاے فطرت انسانی اور سب کے سب قانون فطرت کے پابند ہوتے ہیں، وہ خود اپنا کلام نفسی ان ظاہری کانوں سے اسی طرح پر سُنتا ہے جیسے کوئی دوسرا شخص اس سے کہہ رہا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ان ظاہری آنکھوں سے اس طرح پر دیکھتا ہے۔ جیسے دوسرا شخص اُس کے سامنے کھڑا ہوا ہے +

ان واقعات کے بتلانے کو اگرچہ یہ قول یاد آتا ہے کہ "قدرایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی" مگر بطور تمثیل کے گو وہ کیسی ہی کم رتبہ ہو اس کا ثبوت دیتے ہیں، ہزاروں شخص ہیں جنہوں نے مجنون کی حالت دیکھی ہوگی، وہ بغیر بولنے والے کے اپنے کانوں سے آوازیں سُنتے ہیں، تنہا ہوتے ہیں مگر اپنی آنکھوں

ف وحی کی تمثیل

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۱﴾	اور خدا کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بُلا لو اگر تم سچے ہو ﴿۲۱﴾

سے اپنے پاس کسی کو کھڑا ہُوا باتیں کرتا ہُوا دیکھتے ہیں، وہ سب اُنہی کے خیالات ہیں جو سب طرف سے بے خبر ہو کر ایک طرف مصروف اور اُس میں مستغرق ہیں، اور باتیں سُنتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں، پس ایسے دل کو جو فطرت کی رُو سے تمام چیزوں سے بے تعلق، اور روحانی تربیت پر مصروف اور اُس میں مستغرق ہو، ایسی واردات کا پیش آنا کچھ بھی خلاف فطرت انسانی نہیں ہے، ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ پہلا مجنون ہے اور پچھلا پیغمبر، گو کہ کافر پچھلے کو بھی مجنون بتاتے تھے +

پس وحی وہ چیز ہے جسکو قلب نبوت پر بسبب اُسی فطرت نبوت کے مُبدء فیاض[۵۱] نے نقش کیا ہے۔ وہی انتقاش قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے بغیر ظاہری کانوں کے سُنائی دیتا ہے، اور کبھی وہی نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، مگر بجز اپنے آپکے نہ وہاں کوئی آواز ہے نہ بولنے والا، خدا نے بہت سی جگہ قرآن میں جبرئیل کا نام لیا ہے، مگر سورۂ بقر میں اُس کی ماہیت بتا دی ہے، جہاں فرمایا ہے کہ "جبرئیل نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے"[۵۲] دل پر اُتارنے والی، یا دل میں ڈالنے والی، وُہی چیز ہوتی ہے جو خود انسان کی فطرت میں ہو، نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اُسکی خلقت سے جس کے دل پر ڈالی گئی ہے جُدا گانہ ہو، اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُسی ملکۂ نبوت[۵۳] کا جو خدا نے انبیاء میں پیدا کیا ہے جبرئیل نام ہے۔ یہی مطلب قرآن کی بہت سی آیتوں سے پایا جاتا ہے جیسے کہ سورۂ قیامۃ میں فرمایا ہے کہ "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ" یعنی ہمارا ذمہ ہے وحی کو تیرے دل میں اکٹھا کر دینے اور اُس کے پڑھ دینے کا "فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ" پھر جب ہم اُس کو پڑھ چکیں تو اُس پڑھنے کی پیروی کر "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" پھر ہمارا ذمہ ہے اُس کا مطلب بتانا، اِن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے، وہی پڑھتا ہے، وہی مطلب بتاتا ہے، اور یہ سب کام اُسی فطری قوت نبوت کے ہیں جو خدا تعالےٰ نے مثل دیگر قواے انسانی کے انبیا میں بمقتضاے اُن کی فطرت کے پیدا کی ہے، اور وہی قوت ناموسِ اکبر[۵۴] ہے، اور وہی قوت جبرئیل پیغامبر +

خدا نے خود جبرئیل کی ماہیت بتادی ہے

---

۵۱ آغاز کرنے والا۔ فیض رساں۔ مراد اس سے حق تعالےٰ ہوتی ہے + احمد ماہا

۵۲ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرۃ ۹۱) ۔

۵۳ عصمت۔ تدبیر۔ سیاست۔ ملائکہ۔ احکام الٰہی۔ جبرئیل۔ مانگ۔ صدا۔ پیہانی۔ قاعدہ ۔ احمد ماہا

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (۲۲) وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ

پھر اگر تم نہ کر سکے اور نہ کر سکو گے تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو تیار ہے کافروں کے لئے (۲۲) اور بشارت دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کئے ہیں کہ اُن کے لئے جنتیں ہیں

سورۂ نجم سے استدلال

اسی طرح خدا تعالٰے سورۂ والنجم میں فرماتا ہے " وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی " یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتا۔ مگر یہ تو وہ بات ہے جو اُس کے دل میں ڈالی گئی ہے " عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْ مِرَّۃٍ " اُس کو سکھایا ہے بڑی قوت والے صاحب دانش نے " فَاسْتَوٰی وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی " پھر ٹھیرا اور وہ بہت بلند کنارہ پر تھا۔ " ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی " پھر پاس ہوا اور ادھر کھڑا ہوا " فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی " پھر دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہگیا " فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی " پھر اپنے بندہ کے دل میں ڈالی وہ بات جو ڈالی۔ یہ تمام مشاہدہ اگر انہی ظاہری آنکھوں سے تھا، تو وہ عکس خود اپنے دل کی تجلیات ربانی کا تھا، جو بمقتضائے فطرت انسانی و فطرت نبوت دکھائی دیتا تھا، اور درمیان[1] بجز ملکۂ نبوت کے جس کو جبرئیل کہو، یا اور کچھ، کچھ نہ تھا ❊

نبی اور اُمت کی مثال میں علمائے سلف سے اختلاف

علمائے اسلام نے انبیاء اور عام انسانوں میں بجز اس کے کہ اُن کو ایک عُہدہ ملگیا ہے، جو ممکن تھا کہ اُن میں سے بھی کسی کو ملجاتا، اور کچھ فرق نہیں سمجھا، اور اسی لئے اشاعرہ و ماتریدیہ نے نبی اور اُمت کی مثال سلطان و رعیت کی سمجھی ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ مثال ٹھیک نہیں ہے، نبی اور اُمت کی مثال راعی و غنم کیسی ہے، گو نبی و اُمت انسانیت میں شریک ہیں، جیسے کہ راعی و غنم حیوانیت میں، مگر نبی و اُمت میں فطرت نبوت کی ایسی ہی فصل[2] ہے، جیسے کہ راعی و غنم میں ناطقیت کی ❊

قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا بھی بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ وہ بمقتضائے اُسی فطرت کے نازل ہوا ہے، ہم بمقتضائے فطرت انسانی یہ بات دیکھتے ہیں، کہ تمام ملکات انسانی کسی محرک یعنی کسی امر کے پیش آنے پر اپنا کام کرتے ہیں، اسی طرح ملکہ نبوت بھی جبھی اپنا کام کرتا ہے جب کہ کوئی امر پیش آتا ہے۔ ہمارے دل میں سینکڑوں مضمون ہوتے ہیں، سینکڑوں نصیحتیں ہوتی ہیں، اشعار یاد ہوتے ہیں، دوستوں کی صورتیں، اور مکانوں کی باغوں اور جنگلوں کی تصویریں دماغ میں موجود ہوتی ہیں، مگر جب تک اُن پر متوجہ ہونے کا کوئی سبب نہ ہو وہ سب بے معلوم رہتی ہیں، یہی حال

[1] بتسحات ثلاثہ۔ وقت وصول سے در ذہن و صدرت کردن کار سے کہ متمکن گردد بطبعیت کسے ❊ احمد بابا

[2] پردہ۔ روک۔ جو نوع کو ممیز دے اس کے مشارکات جنسی سے جیسے لفظ ناطق کہ اسکی سبب انسان دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے ❊ احمد بابا

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ	جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،

ملکہ نبوت کا ہے، نبی مع اپنے ملکہ نبوت کے موجود ہوتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے، دنیوی باتیں جن کو نبوت سے کچھ تعلق نہیں ہیں اسی طرح پر کرتا ہے، جس طرح کہ اور تمام انسان کرتے ہیں، مگر جب کوئی ایسا امر پیش ہوتا ہے جو اُس ملکہ نبوت کی تحریک کا باعث ہو، اُس وقت وہ ملکہ نبوت اپنا کام کرتا ہے، اسی باریک دقیقہ کی طرف خدا نے اشارہ کرنے کو اپنے نبی کی زبان سے یہ کہوایا کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُکُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" اور خود آنحضرت نے فرمایا کہ "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرۡتُکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنۡ اَمۡرِ دِیۡنِکُمۡ فَخُذُوۡا بِهٖ وَاِذَا اَمَرۡتُکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنۡ رَّاۡیٍ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" (رواہ مسلم) یعنی میں بھی تو انسان ہی ہوں جب تم کو تمہارے دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اُس کو مان لو اور جب میں کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو بیشک میں بھی انسان ہوں ❖

[فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ] ہم نے شروع تفسیر میں سورۃ کے لفظ کی تحقیق میں بتایا تھا، کہ جہاں قرآن میں لفظ سورۃ کا آیا ہے اُس سے کوئی سورۃ جو سورتوں کے نام سے مشہور ہیں مراد نہیں ہے، بلکہ کوئی حصہ قرآن کا مراد ہے ❖

جو لوگ کہ قرآن پر خدا کی وحی سے ہونے میں شبہ کرتے تھے اُن کا شبہ مٹانے کو خدا نے اُن سے فرمایا کہ اگر تم اُس کو خدا سے نہیں سمجھتے تو تم بھی اُس کی مانند لاؤ ❖

یہ مضمون کئی طرح پر قرآن میں آیا ہے، اس مقام پر تو یہ فرمایا ہے کہ قرآن کے کسی ٹکڑے یا حصہ کی مانند تم بھی لاؤ ❖

اسی طرح سورہ یونس[1] میں فرمایا ہے کہ "کیا کافر قرآن کو کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہے تو تو اُن سے کہہ کہ اُس کے ٹکڑے یا حصہ کی مانند تم بھی بنا لاؤ" ❖

اور سورۂ ہود[2] میں فرمایا ہے کہ "کیا کافر قرآن کو کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہے تو تو اُن سے کہہ کہ اُس کے دس ہی ٹکڑوں یا حصوں کی مانند تم بھی یوں ہی بنا لاؤ" ❖

اور سورہ اسرے میں[3] فرمایا ہے کہ "تو کہدے کہ اگر جن و انس اس بات پر جمع ہوں کہ اس

---

[1] اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (یونس - آیت ۳۹) ❖

[2] اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (هود - آیت ۱۶) ❖

[3] قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ کَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِیۡرًا (اسرے - آیت ۹۰) ❖

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ	جبّ دفعہ اُن کو وہاں چکھنے کو پھل ملے تو کہیں یہ وہی ہے جو پہلے ہم کو ملا تھا ،

قرآن کی مانند بنا لاویں تو اُس کی مانند نہ بنا لا سکینگے ” ✦

اور سورہ قصص[۱] میں فرمایا ہے کہ ” تو اُن سے کہدے کہ خدا کے پاس سے کوئی کتاب لاؤ جو توریت و قرآن سے زیادہ ہدایت کرنے والی ہو ” ✦

ان سب آیتوں پر غور کرنے کے بعد اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ قرآن کی مانند سے کیا مُراد ہے ، ہمارے تمام علما و مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن نہایت اعلےٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر واقع ہؤا ہے ، اور اُس زمانہ میں اہل عرب کو فصاحت و بلاغت کا بڑا ہی دعوےٰ تھا ، پس خدا نے قرآن کے من اللہ ثابت کرنے کو یہ معجزہ قرآن میں رکھا کہ ویسا فصیح کلام کوئی بشر نہیں کہہ سکتا ” اور نہیں کہہ سکا ، پس اُنہوں نے قرآن کی مانند سے فصاحت و بلاغت میں مانند ہونا مراد لیا ہے ✦

مگر میری سمجھ میں اِن آیتوں کا یہ مطلب نہیں ہے ، اِس میں کچھ شک نہیں ہے کہ قرآن مجید نہایت اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر واقع ہے اور جو کہ وہ ایسی وحی ہے ، جو پیغمبر کے قلب نبوت پر ، نہ بطور معنی و مضمون کے بلکہ بلفظہٖ ڈالی گئی تھی ، جس کے سبب سے ہم اُس کو وحی متلو یا قرآن یا کلام خدا کہتے اور یقین کرتے ہیں ، اِس لئے ضرور تھا کہ وہ ایسے اعلےٰ درجہ فصاحت پر ہو ، جو بے مثل و بے نظیر ہو ، مگر یہ بات کہ اُس کی مثل کوئی نہیں کہہ سکا یا کہہ سکتا ، اُس کے من اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی ۔ کسی کلام کی نظیر نہ ہونا اِس بات کی تو بلاشبہ دلیل ہے ، کہ اُس کی مانند کوئی دوسرا کلام موجود نہیں ہے ، مگر اسکی دلیل نہیں ہے ، کہ وہ خدا کی طرف سے ہے ، بہت سے کلام انسانوں کے دنیا میں ایسے موجود ہیں ، کہ اُن کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہؤا ، مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے ، نہ اِن آیتوں میں کوئی ایسا اشارہ ہے جس سے فصاحت و بلاغت میں معارضہ چاہا گیا ہو ، بلکہ صاف پایا جاتا ہے ، کہ جو ہدایت قرآن سے ہوتی ہے اُس میں معارضہ چاہا گیا ہے ، کہ اگر قرآن کے خدا سے ہونے میں شبہ ہے ، تو کوئی ایک سورۃ یا دس سورتیں یا کوئی کتاب مثل قرآن کے بنا لاؤ ۔ جو ایسی ہادی ہو ۔ سورہ قصص میں آنحضرت کو صاف حکم دیا گیا ہے کہ تو کافروں سے کہدے کہ کوئی کتاب جو توریت و قرآن سے زیادہ ہدایت کرنے والی ہو اُسے لاؤ ”

معارضہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے نہیں بلکہ ہدایت کے لحاظ سے چاہا گیا ہے

توریت کی عبارت فصیح نہیں ہے ، بلکہ عام طور کی عبارت ہے ، اِس لئے کہ علاوہ قومی دستورات و تاریخانہ مضامین کے جو اُس کے جامع نے اُس میں شامل کئے ہیں ، جس قدر مضامین وحی کے اُس

---

[۱] قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ✦

(قصص آیت ۴۹)

وَاُوْتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا	کیونکہ ایک ہی سے (پھل) لائے جاوینگے،

میں ہیں، ان کا اتفاق بھی بلفظہٖ شاید بجز احکام عشرہ توریت کے جنکو حضرت موسٰی نے پہاڑ میں بیٹھ کر پتھر کی تختیوں پر کھود دیا تھا، پایا نہیں جاتا، پس ظاہر ہے کہ قرآن گو کیسا ہی فصیح ہو، مگر جو معارضہ ہے، وہ اُس کی فصاحت و بلاغت یا اُس کی عبارت کے بے نظیر ہونے پر نہیں ہے، بلکہ اُس کے بے مثل ہادی ہونے میں ہے، جو بالتصریح سورہ قصص کی آیت میں بیان ہوا ہے، ہاں اُس کی فصاحت و بلاغت اُس کے بے نظیر ہادی ہونے کو زیادہ تر روشن و مستحکم کرتی ہے +

ان آیتوں کے مخاطب اہل عرب تھے، پس جب قرآن نازل ہوا تو اُس وقت جو عرب کا حال تھا اُس کو ذرا اس طرح پر خیال میں لانا چاہیئے کہ اُس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے جم جاوے۔ وہ تمام قوم ایک لٹیری، چور، و قزاق، خانہ بدوش قوم تھی جو مثل کنجروں کے اپنا ڈیرہ گدھوں و خچروں پر لادے پڑی پھرتی تھی، غیر قوموں نے "سارسین" جو لفظ "سارقین" کا محرف ہے خطاب دیا تھا، بغض و عداوت و کینہ جو بدترین خصائص انسانی سے ہیں اُن کے رگ و ریشہ میں پڑا ہوا تھا یہاں تک کہ وہاں کے جانور بھی کینہ میں ضرب المثل ہیں (شتر کینہ) خونریزی، بیرحمی، قتل اولاد، اُن میں ایسے درجہ پر تھی جس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی، کنواری اور بیاہی عورتیں زنا کو اپنا فخر سمجھتی تھیں، جس طرح مرد کسی نامی عورت یا مشہور خاندان کی عورت سے زنا کرنا فخریہ اپنی قوم میں بیان کرتا تھا، اسی طرح عورتیں کسی نامی یا مشہور خاندانی مرد سے زنا کرنا فخریہ بیان کرتی تھیں، قوم کی قوم جاہل و اُمّی تھی، بجز شراب خواری و بُت پرستی کے کچھ کام نہ تھا، اور قوموں سے ایسے کونے میں پڑی ہوئی تھیں کہ کچھ روشنی تعلیم و تربیت کی اُن تک نہیں پہنچی تھی، اُسی قوم میں کا ایک شخص جس نے چالیس برس اپنی عمر کے انہی کے ساتھ صرف کئے تھے، ربانی روشنی سے جو خدا نے بمقتضائے فطرت اُس میں رکھی تھی منوّر ہوا، اور روحانی تربیت کے حقائق و دقایق ایسے الفاظ میں جو عالم اور حکیم اور فلسفی اور نیچرلسٹ[1] و دہریہ سے لیکر عام جاہلوں، بدوؤں، صحرا نشینوں، کی ہدایت کے لئے بھی یکساں مفید تھے علانیہ بیان کئے، جو ممکن نہ تھا کہ بغیر اس کے کہ وہ خدا کی طرف سے ہوں بیان کئے جا سکتے، فطرت کے قاعدہ کے مطابق ممکن نہ تھا کہ بغیر اُس فطرت نبوت کے جو خدا اپنے انبیاء میں ودیعت کرتا ہے ایسی قوم کے کسی شخص کے اس طرح کے خیالات اور اقوال و نصائح ہوں، جیسے کہ قرآن میں ہیں، یا ایسی تاریک و خراب حالت کی قوم کا کوئی شخص بغیر اُس نور کے جو خدا نے اُس کو دیا ایسی ہدایتیں بتاوے جیسی کہ قرآن میں ہیں، یہ بجز خدا سے

[1] علم طبعیات کا عالم +

وَلَهُمۡ فِيهَآ أَزۡوَٰجٞ مُّطَهَّرَةٞۖ	اور وہاں اُن کے لئے پاکیزہ عورتیں ہیں،
وَهُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿۲۳﴾	اور وہ ہمیشہ وہاں رہینگے ﴿۲۳﴾

ہونے کے اور کسی طرح ہو ہی نہیں سکتیں، اسی امر کی نسبت خدا نے فرمایا کہ اگر تم کو اس کے خدا سے ہونے میں شک ہے تو فَأۡتُواْ بِسُورَةٖ مِّن مِّثۡلِهِۦ ✤

﴿۲۲﴾ [فَإِن لَّمۡ تَفۡعَلُواْ] اور پھر فرمایا کہ اگر تم نہ کرسکے اور پھر بطور یقین کے فرمایا کہ نہ کر سکو گے [کیونکہ ایسی قوم کے ایسے خیالات ہونے جیسے کہ قرآن میں ہیں ممکن ہی نہ تھے] تو اُس کو خدا کی طرف سے سمجھ لو اور عذاب سے بچو ✤

بہشت و دوزخ بالفعل مخلوق و موجود نہیں

اِن آیتوں میں خدا تعالیٰ نے جنت و نار یا دوزخ و بہشت کا ذکر کیا ہے، جنت و نار کی نسبت لفظ "أُعِدَّتۡ" جس کے معنی تیار یا آمادہ کے ہیں چار جگہ قرآن مجید میں آیا ہے اوّل تو اسی آیت میں ہے "أُعِدَّتۡ لِلۡكَٰفِرِينَ" اور پھر سورۂ آل عمران میں ہے "وَٱتَّقُواْ ٱلنَّارَ ٱلَّتِيٓ أُعِدَّتۡ لِلۡكَٰفِرِينَ" اور پھر اُسی سورت میں جنّت کی نسبت دوسری جگہ ہے "أُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِينَ" اور پھر سورۂ حدید میں ہے "أُعِدَّتۡ لِلَّذِينَ ءَامَنُواْ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ" اور اس لفظ پر علمائے اسلام نے استدلال کر کر یہ عقیدہ قائم کیا ہے کہ "اَلۡجَنَّةُ وَالنَّارُ مَخۡلُوقَتَانِ" یعنی بہشت اور دوزخ دونوں پیدا ہو چکی ہیں، یعنی بالفعل موجود ہیں۔ مگر غور کرنے سے پایا جاتا ہے کہ اِن آیتوں سے یا "أُعِدَّتۡ" کے لفظ سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ✤

یقینی باتوں کا بیان بصیغۂ ماضی

تمام قرآن کا طرز بیان اس طرح پر ہے کہ آیندہ کی باتوں کو جو یقینی ہونے والی ہیں ماضی کے صیغوں سے بیان کیا جاتا ہے، جو اُن کے قطعی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح ان آیتوں میں جو باتیں ہونے والی ہیں اُن کو بطور ہو چکی، یعنی ماضی کے صیغہ سے بیان کیا ہے، مثلاً پہلی آیت میں فرمایا ہے "بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جو تیار ہے کافروں کے لئے" آدمیوں پر ایندھن کا اطلاق اُس وقت ہو سکتا ہے جب وہ آگ بھڑکانے کے لئے آگ میں ڈالے جاوینگے، اور اُن علمائے اسلام کے نزدیک اگر یہ ہوگا تو قیامت میں حساب و کتاب کے بعد ہوگا، پس اس وقت نہ کوئی آدمی جہنم کی آگ کا ایندھن ہے، اور نہ کوئی ایسی آگ موجود ہے جس کا ایندھن آدمی ہوں، ممکن ہے کہ کہا جاوے کہ ایسا ہوگا، پس اگر ہوگا تو بالفعل موجود ہونا قائم نہ رہا ✤

دوسری آیت میں بہشتیوں کی نسبت پھل کا ملنا اور ایک سے پھل کا ملنا اور اُن کا کہنا کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ملا تھا، سب ماضی کے صیغوں سے بیان ہوا ہے، حالانکہ اگر یہ ہوگا تو قیامت

ﮯ دلیل لانا۔ گواہی چاہنا ✤



إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا	اللہ کچھ شرماتا نہیں ایک مچھر کی یا اس سے بھی بڑھ کر مثل کہنے میں ،

کے بعد ہوگا ، جب لوگ حساب کتاب دیکر بہشت میں جاوینگے ، علاوہ اس کے اگر کسی کام کا بدلا یا کسی جرم کی سزا یقینی ہو تو اس کہنے سے کہ اگر تم یہ بات کرو گے تو اس کا یہ صلہ اور یہ جرم کرو گے تو اُس کی یہ سزا تمہارے لئے طیار ہے ، یہ لازم نہیں آتا کہ وہ صلہ یا ذریعہ سزا بالفعل موجود بھی ہو ، بلکہ اس طرز کلام کا صرف یہ مفاد ہے کہ وہ بدلا یا سزا ملنی یقینی ہے ۔پس یہ مسئلہ کہ بہشت اور دوزخ دونوں بالفعل مخلوق و موجود ہیں قرآن سے ثابت نہیں ❊

بہشت کی ماہیت

جنت یا بہشت کی ماہیت جو خود خدا تعالےٰ نے بتلائی ہے وہ تو یہ ہے " فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ[1] " یعنی کوئی نہیں جانتا کہ کیا اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) چھپا رکھی گئی ہے اُس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے ❊

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی ، جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابو ہریرہ کی سند پر بیان کیا ہے وہ یہ ہے " قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَىٰ قَلْبِ بَشَرٍ " یعنی اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ طیار کی ہے مَیں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہے اور نہ کسی کان نے سُنی ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اُس کا خیال گذرا ہے ۔پس اگر حقیقت بہشت کے یہی باغ اور نہریں اور موتی کے اور چاندی سونے کی اینٹوں کے مکان اور دودھ و شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوبصورت عورتیں اور لونڈے ہوں ، تو یہ تو قرآن کی آیت اور خدا کے فرمودے کے بالکل مخالف ہے ، کیونکہ اِن چیزوں کو تو انسان جان سکتا ہے ، اور اگر فرض کیا جاوے کہ ویسی عمدہ چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں اور نہ کانوں نے سُنیں تو بھی " وَلَا خَطَرَ عَلَىٰ قَلْبِ بَشَرٍ " سے خارج نہیں ہوسکتیں ، عمدہ ہونا ایک اضافی صفت ہے اور جب کہ اُن سب چیزوں کا نمونہ دنیا میں موجود ہے ، تو اُس کی صفت اضافی کو جہاں تک کہ ترقی دیتے جاؤ انسان کے دل میں اُس کا خیال گذر سکتا ہے ، حالانکہ بہشت کی ایسی حقیقت بیان ہوئی ہے کہ " لَا خَطَرَ عَلَىٰ قَلْبِ بَشَرٍ " پس بہشت کی جو یہ تمام چیزیں بیان ہوئی ہیں درحقیقت بہشت میں جو " قُرَّةِ أَعْيُنٍ " ہوگا اُس کے سمجھانے کو بقدر طاقت بشری تمثیلیں ہیں ، نہ بہشت کی حقیقتیں ❊

انسان مطابق اپنی فطرت کے اُنہی چیزوں کو سمجھ سکتا ہے اور اُنہی کا خیال اُس کے دل[2]

[1] سورۃ السجدہ - آیت ۱۷ ❊

[2] پر

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ	پھر جو ایمان لائے ہیں جانتے ہیں کہ سچ مچ وہ خدا کی کہی ہوئی ہے،

آسکتا ہے، جو اُس نے دیکھی یا چھوئی یا چکھی یا سونگھی یا قوت سامعہ سے محسوس کی ہوں، اور بہشت کی جو "قُرَّةِ اَعْيُنٍ" یعنی راحت یا لذت ہے، اُس کو نہ انسان نے دیکھا ہے، نہ چھوا ہے، نہ چکھا ہے، نہ سونگھا ہے، نہ قوت سامعہ نے اُس کا حس کیا ہے، پس فطرت انسانی کے مطابق انسان کو اُس کا بتلانا ناممکن ہے، اِس کے سوا ایک اور مشکل درپیش ہے، کہ جو کچھ انسان کو بتایا جاتا ہے، وہ اُن الفاظ سے تعبیر ہوتا ہے جو انسان کی بول چال میں ہیں، اور جو چیز کہ انسان نے نہ دیکھی نہ چھوئی نہ چکھی نہ سونگھی نہ قوت سامعہ سے حس کی، اُس کے لئے کوئی لفظ انسان کی زبان میں نہیں ہوتا، اور اس لئے اُس کا تعبیر کرنا گو کہ خدا ہی تعبیر کرنا چاہے محالات سے ہے۔ اس کے سوا ایک اور سخت مشکل یہ ہے، کہ کوئی انسان اُن کیفیات کو بھی جو اس دنیا میں ہیں تعبیر نہیں کرسکتا، کوئی شخص کھٹاس، مٹھاس، درد، دُکھ، رنج و راحت، کی کچھ بھی کیفیت نہیں بتا سکتا، یا اُس کے لئے دوسرا لفظ بدل دیتا ہے، یا کوئی مشابہت اور نظیر اُس کی لاتا ہے جو وہ بھی مثل پہلی کے محتاج بیان ہوتی ہے، پس بہشت کی کیفیت یا لذت کا جس کو "قرۃ اعین" سے تعبیر کیا ہے، بیان کرنا گو کہ خدا ہی اُس کا بیان کرنا چاہے محال سے بھی بڑھ کر محال ہے ✦

مگر جب کہ انسان کو ایک بات کے کرنے کو اور ایک بات کے نہ کرنے کو کہا جاتا ہے، تو بالطبع انسان اُس کی منفعت اور مضرت کے جاننے کا خواہاں ہوتا ہے، اور بغیر جانے اُس کے کرنے یا نہ کرنے پر راغب یا متنفر نہیں ہوتا، اس واسطے ہر ایک پیغمبر کو بلکہ ہر ایک رفارمر یعنی مصلح کو اُس منفعت و مضرت کا کسی تمثیل یا تشبیہ سے بتانا پڑتا ہے ✦

"قرۃ اعین" کی ماہیت یا حقیقت یا کیفیت یا اصلیت کا بتانا تو محالات سے ہے اس لئے انبیاء نے اُن راحتوں اور لذتوں یا رنج اور تکلیفوں کو جو انسان کے خیال میں ایسی ہیں جو اُن سے زیادہ نہیں ہوسکتیں، بطور جزا و سزا اُن افعال کے بیان کیا ہے، اور غرض اُن سے بعینہ وہی اشیا نہیں ہیں، بلکہ جو رنج و راحت، لذت و کلفت، اُن سے حاصل ہوتی ہے اُس کیفیت کو "قُرَّةِ اَعْيُنٍ" سے تشبیہاً بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، گو وہ تشبیہ کیسی ہی ادنے اور ناچیز ہو ✦

موسے نے اُس "قُرَّةِ اَعْيُنٍ" کو اولاد پیدا ہونے مینہ برسنے رزق کے فراخ ہونے، دشمنوں پر غلبہ پانے، اور اُس کلفت کو اولاد کے مرنے، قحط پڑنے، وبا پھیلنے، شکست کھانے، کی کیفیت کی تشبیہ میں بیان کیا ہے۔ یہ تشبیہیں اگرچہ بنی اسرائیل کے دل پر

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾	اور جو کفر میں پڑے ہیں کہتے ہیں کہ ایسی مثل کہنے سے خدا نے کیا ارادہ کیا ہے، بہتوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے، اور بہتوں کو اس سے ہدایت کرتا ہے، اور بجز بدکاروں کے کسی کو اس سے گمراہ نہیں کرتا ﴿۲۴﴾

بہت مؤثر تھیں، مگر درحقیقت ایسی نہ تھیں کہ جو تمام انسانوں کی طبیعت پر حاوی ہوں، محمد مصطفےٰ صلعم نے اُس کو ایسی تشبیہوں میں بیان کیا ہے، کہ تمام انسانوں کی طبیعتوں پر حاوی ہیں، اور کل انسانوں کی خلقت اور جبلت کے نہایت ہی مناسب ہیں ❖

تمام انسانوں کی خواہ وہ سرد ملک کے رہنے والے ہوں خواہ گرم ملک کے، مکان کی آراستگی، مکان کی خوبی، باغ کی خوشنمائی، بہتے پانی کی دلربائی، میووں کی تر و تازگی، سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے، اس کے سوا حسن یعنی خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی ہے، خصوصاً جب کہ وہ انسان میں ہو، اور اُس سے بھی زیادہ جب کہ عورت میں ہو، پس بہشت کی "قرۃ اعین" کو اُن فطری راحتوں کی کیفیات کی تشبیہ میں، اور دوزخ کے مصائب کو آگ میں جلنے، اور لہو پیپ پلائے جانے، اور تھوہر کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے، تاکہ انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ، بڑی سے بڑی راحت و لذت، یا سخت سے سخت عذاب وہاں موجود ہے، اور درحقیقت جو لذت و راحت یا رنج و کلفت وہاں ہے، اُن کو اس سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے، یہ تو صرف ایک اعلےٰ راحت و احتظاظ یا رنج و کلفت کا خیال پیدا کرنے کو اُس پیرایہ میں جس میں انسان اعلےٰ سے اعلےٰ احتظاظ و رنج کو خیال کر سکتا تھا بیان کیا ہے ❖

یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے، اُس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ میں سرسبز و شاداب درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت، چاندی کے کنگن پہنے ہوئے، جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں۔ شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونہ میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونہ میں کچھ، ایسا بیہودہ پن ہے، جس پر تعجب ہوتا ہے، اگر بہشت یہی ہو، تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اُس سے ہزار درجہ بہتر ہیں ❖

علمائے اسلام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے بسبب اپنی رقت قلبی اور توجہ الی اللہ اور خوف و رجا کے غلبہ کے، جو آدمی کے دل پر زیادہ اثر کرنے سے ایسے درجہ پر پہنچا دیتا ہے کہ اصل حقیقت کے

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۵﴾	جو اللہ کے عہد کو پکا کر کے توڑتے ہیں، اور جس چیز کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے، اُس کو کاٹتے ہیں، اور دنیا میں فساد ڈالتے ہیں، وہی لوگ ٹوٹے میں پڑے ہیں ﴿۲۵﴾

بیان کرنے کی جرأت نہیں رہتی) یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو امر الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے، اُسی کو تسلیم کرلیں، اور اُس کی حقیقت اور اُس کے مقصد کو خدا کے علم پر چھوڑ دیں، اس واسطے وہ بزرگ تمام اُن باتوں کو تسلیم کرتے ہیں، جن کو کوئی بھی نہیں مان سکتا، اور وہ باتیں جیسی کہ عقل اور اصلی مقصد بانئے مذہب کے برخلاف ہیں، ویسی ہی مذہب کی سچائی اور بزرگی اور تقدس کے مخالف ہیں +

اِس امر کے ثبوت کے لئے کہ بانئے مذہب کا اِن چیزوں کے بیان کرنے سے صرف اعلےٰ درجہ کی راحت کا بقدر فہم انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا، نہ واقعی اُن چیزوں کا دوزخ و بہشت میں موجود ہونا، ایک حدیث کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو ترمذی نے بریدہؓ[1] سے روایت کی ہے اُس میں بیان ہے کہ "ایک شخص نے آنحضرت سے پوچھا کہ بہشت میں گھوڑا بھی ہوگا آپ نے فرمایا کہ تو سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر جہاں چاہیگا اُڑتا پھرے گا، پھر ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت وہاں اونٹ بھی ہوگا، آپ نے فرمایا کہ وہاں جو کچھ چاہو گے سب کچھ ہوگا، پس اس جواب سے مقصود یہ نہیں ہے کہ درحقیقت بہشت میں گھوڑے اور اونٹ موجود ہونگے، بلکہ صرف اُن لوگوں کے خیال ہیں، اُس اعلےٰ درجہ کی راحت کے خیال کا پیدا کرنا ہے، جو اُن کے خیال اور اُن کی عقل و فہم و طبیعت کے مطابق اعلےٰ درجہ کی ہوسکتی تھی، اسی کی مانند اور بہت سی مثیں ہیں، اور اگر اُن سب کو صحیح بھی مان لیا جاوے، تب بھی کسی کا مقصود اُن اشیاء کا بعینہ بہشت میں موجود ہونا نہیں ہے، بجز اس کے کہ جہاں تک انسان کی عقل و طبیعت کے موافق اعلےٰ درجہ کی راحت کا خیال پیدا ہو سکے وہ پیدا ہو +

حکمائے الٰہی اور انبیائے ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ حکماء صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کر سکتے ہیں جن کا دل و دماغ تربیت پا چکا ہے، برخلاف اِس کے انبیاء تمام کافۂ انام کو تربیت کرتے ہیں، جن کا بہت بڑا حصّہ قریب کل کے محض نا تربیت یافتہ

[1] عن بریدۃ ان رجلا قال یا رسول اللّٰہ هل فی الجنۃ من خیل قال ان اللّٰہ ادخلک الجنۃ فلا تشاء ان تحمل فیها علی فرس من یاقوتۃ حمراء یطیر بک فی الجنۃ حیث شئت الا فعلت وسالہ رجل فقال یا رسول اللّٰہ هل فی الجنۃ من ابل قال فلم یقل لہ ما قال لصاحبہ فقال ان یدخلک اللّٰہ الجنۃ یکن لک فیها ما اشتهت نفسک ولذت عینک ۔ رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ،

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ	کیونکر تم نہیں مانتے اللہ کو حالانکہ تم مردہ (یعنی کچھ نہ تھے [۵]) پھر تم کو زندہ (یعنی موجود اور مشہور و معروف) کیا، پھر تم کو ماریگا،

جاہل وحشی جنگلی بدوی بےعقل و بددماغ ہوتا ہے، اور اسی لئے انبیاء کو یہ مشکل پیش آتی ہے، کہ اُن حقائق و معارف کو، جن کو تربیت یافتہ عقل بھی مناسب غور و فکر و تامل سے سمجھ سکتی ہے، ایسے الفاظ میں بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑمغز دونوں برابر فائدہ اُٹھا دیں قرآن مجید میں جو بےمثل چیز ہے وہ یہی ہے کہ اُس کا طرز بیان ہر ایک مذاق اور دماغ کے موافق ہے، اور باوجود اس قدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انہی آیات کی نسبت دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے، کہ وعدہ و وعید دوزخ و بہشت کے، جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں اُن سے بعینہ وہی اشیا مقصود نہیں، بلکہ اُس کا بیان کرنا صرف اعلےٰ درجہ کی خوشی و راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے، اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی نعیم جنت کی، اور ایک ترغیب اوامر کے بجالانے، اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے، اور ایک کوڑمغز مُلا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے، کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملینگی، شرابیں پیئنگے میوے کھاوینگے، دودھ و شہد کی ندیوں میں نہاوینگے، اور جو دل چاہیگا وہ مزے اُڑاوینگے اور اس لغو بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے، اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچا تھا اُسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے، اور کافۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے، پس جس شخص نے ان حقائق قرآن مجید پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کی، اُس نے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا، اور اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم رہا ؂

سله [۵] قال القفال وهو كقوله تعالىٰ هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئا مذكورا فبين سبحانه وتعالىٰ ان الانسان كان لاشيء يذكر فجعله سميعا بصيرا ومجازه من قولهم فلان ميت الذكر وهذا امر ميت وهذه سلعة ميتة اذا لم يكن لها طالب ولا ذاكر قال المخبل السعدي

واحييت لى ذكرى وما كنت خاملا

ولكن بعض الذكر انبه من بعض

فكذا معنى الآية وكنتم امواتا اى خاملين ولا ذكر لكم لانكم لم تكونوا شيئا فاحياكم اى جعلكم خلقا سميعا بصيرا (تفسیر کبیر)

كنتم امواتا خاملى الذكر فاحياكم بالظهور

والعرب تسمى كل خامل ميتا وكل مشهور حيا (تفسیر مجمع البیان)

ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٦﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا	پھر جلاویگا، پھر اُس کے پاس جاؤ گے ﴿٢٦﴾ اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے سب کچھ جو زمین میں ہے،

(متشابہاً) جو مطلب قرآن مجید کا ہم نے بیان کیا ہے اُس کے مطابق ہم کو نہ کچھ "ثمرہ" کے لفظ پر بحث کرنی ضرور ہے اور نہ "متشابہاً" کے لفظ پر، کیونکہ اس لفظ سے پھل کی عمدگی پر اُسی مقصود سے زیادہ تعجب دلانا ہے، مگر تعجب یہ ہے کہ بعض ہمارے علمائے اسلام نے بھی "متشابہاً" کی تفسیر میں ثمر سے درختوں کے میوے مراد نہیں لئے، بیضاوی[1] میں لکھا ہے کہ "اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ جو لذت دنیا میں خدا کی معرفت اور اُس کی طاعت میں حاصل تھی تو جنت میں وہ لذت بڑھ کر ہوگی اس لئے ان الفاظ سے کہ "یہ وہی ہے جو ہم کو پہلے ملا تھا" ثواب مراد ہو سکتا ہے اور "ایک ہی سی ہونے سے" بزرگی اور علوّ مدارج میں ایک سا ہونا، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ کافروں کے حق میں کہا گیا ہے کہ چکھو جو تم جانتے تھے۔

تفسیر کشف الاسرار میں[2] بھی لکھا ہے کہ جنت و نار کی جو چیزیں بیان ہوئی ہیں وہ سب تمثیلیں ہیں نہ حقیقتیں تاکہ جو چیز ہمارے پاس ہے اُس سے اُس چیز کا جو ہم سے پوشیدہ ہے کچھ خیال ہو۔

﴿٢٣﴾ [إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي] تمام مفسرین اس آیت کی نسبت لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں مکھی و مکڑی و چیونٹی کا ذکر کیا ہے، اس پر کافر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ ایسی حقیر چیزوں کا ذکر کرنا خدا کی شان کے لائق نہیں ہے، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ، مچھر یا اُس سے زیادہ حقیر چیز کی مثل کہنے میں خدا شرماتا نہیں، مگر اس صورت میں اس آیت کو پہلی و پچھلی آیتوں سے کچھ تعلق نہیں رہتا، بلکہ اس آیت سے اس بات پر اشارہ پایا جاتا ہے کہ، اوپر کی آیتوں میں جو بیان جنّت و نار کا ہوا ہے، وہ صرف بطور ایک حقیر مثل کے ہے، مگر اللہ حقیر سے حقیر

[1] وان للآیۃ محملا آخر وھو ان مستلذات اھل الجنۃ فی مقابلۃ ما رزقوا فی الدنیا من المعارف والطاعات متفاوتۃ فی اللذۃ بحسب تفاوتھا فیحتمل ان یکون المراد من ھذا الذی رزقنا انہ ثوابہ ومن تشابھھما تماثلھما فی الشرف والمزیۃ وعلو الطبقۃ فیکون ھذا فی الوعد نظیر قولہ ذوقوا ما کنتم تعملون فی الوعید (بیضاوی)

[2] واعلم ان اللہ تعالیٰ خاطبنا بالامثال لندلنا علی الحاضر عندہ بالغائب عندنا فالاسماء متفقۃ للدلالۃ والمعانی مختلفۃ ولولا ذلک لما بقی فی النار شیء من شجرۃ الزقوم و السلاسل وعدد ذلک لما کانت تاکلہ النار وما فی الجنۃ من مرسھا وانھارھا کذلک ھو مثل فقط (بعضہ کشف الاسرار)

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۷﴾	پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو اُس کو ٹھیک سات آسمان کر دئیے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے ﴿۲۷﴾

مثل کہنے میں بھی نہیں شرماتا، جو سعید ہیں وہ اُس کا مقصد سمجھتے ہیں اور ہدایت پاتے ہیں، اور جو شقی ہیں وہ اُس کے مقصود پر غور نہیں کرتے۔ بلکہ حقارت سے دیکھتے ہیں، اور گمراہ ہوتے ہیں ✣

[عَهْدَ اللّٰهِ] عہد آپس میں دو شخصوں کے ایک قول ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ اُس کی رعایت رکھی جاوے اور پورا کیا جاوے، اور ایجاب و قبول سے وہ موثق ہو جاتا ہے، کبھی یہ عہد بذریعہ قول کے ہوتا ہے اور کبھی بغیر قول کے، مثلاً یہ عہد کرنا کہ میں دس من گیہوں دونگا ایک قولی عہد ہے، مگر من کی مقدار بھی جو مروج ہو، ایک عہد ہے بغیر قول کے، جو اُس قولی عہد کے ضمن میں داخل ہے، پس عہد بالقول اور بالحال دونوں طرح پر ہوتا ہے، خدا کا عہد جو مخلوق سے ہے، یا مخلوق کا عہد جو خدا سے ہے، وہ قولی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اُس کی ذات لفظوں کے بولنے اور آواز کے نکلنے سے جو انسان سے متعلق ہے بری ہے، پس خدا کا قول وہ انسانی فطرت ہے، جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے (اُس کی قدرت کی نشانیاں جو دنیا میں اور خود انسان میں ہیں) اور جو عقل و تمیز انسان میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اُن کے سمجھنے کی موجود ہے، اس کے خدا ہونے پر موثق عہد ہے، جس کا دونوں طرف سے ایجاب و قبول ہوا ہے خود انسان کی فطرت اور جو قوائے محرک اور قوت مانع یا معتدل کرنے والی اُن قوائے کی اُس میں رکھی ہے وہ ٹھیک اُس کے دین یا شریعت کے بجا لانے کا جو عین فطرت ہے پکا عہد ہے، پس جو لوگ اُس عہد کو توڑتے ہیں وہی بدکار ہیں، اور وہی اُن مثلوں سے گمراہ ہوتے ہیں ✣

﴿۲۶﴾ اِس آیت میں تین لفظ غور کرنے کے قابل تھے۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا۔ فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ۔ اس آیت کا ترجمہ اِس طرح پر کیا ہے کہ پہلے دو لفظوں کا حل اُس سے ہو جاتا ہے، پچھلے لفظ پر ہم وہاں بحث کرینگے جہاں بعث و نشر کی حقیقت بیان کرینگے، یہ مسئلہ اس قابل ہے کہ ایک مناسب مقام پر پوری تقریر اس پر لکھی جاوے[1] ✣

﴿۲۷﴾ (سَبْعَ سَمٰوٰتٍ) سات کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ سات سے زیادہ آسمان نہ ہوں، بلکہ اُس زمانہ کے لوگ جو بلحاظ سبع سیارات یہ سمجھتے تھے کہ آسمان سات ہیں، انہی لوگوں کے خیال کے مطابق سات کا لفظ اطلاق ہوا ہے، یہ کچھ میری ہی رائے نہیں ہے بلکہ

[1] بعث و نشر کی بحث سورہ اعراف آیت ۲۰۳ کی گئی ہے ✣ احمد بابا

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا

اگلے مفسروںؒ کی بھی یہی رائے ہے +

"سمٰوات" جمع ہے سما کی جس کے معنی اونچے کے ہیں، یہ لفظ عرب کی زبان میں اور یہودیوں کی زبان میں اُس زمانہ سے بولا جاتا ہے، جب کہ یونانی علم ہیئت کا وجود بھی نہ تھا، قرآن مجید میں بھی اس لفظ کا اطلاق اُسی محاورہ میں ہوا ہے جو اُس زمانہ میں تھا، مگر قرآن مجید کے نازل ہونے کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بالتخصیص مسلمانوں میں یونانی علم ہیئت کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ یونانیوں نے آسمان کو ایک جسم شفاف صلب کُرَوِی الشکل مُقعّر و مُحدّب کا محیط زمین کے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں تسلیم کیا تھا، یونانی مسئلے مسلمانوں میں بہت رائج ہو گئے تھے اور سب (الّا شاذ و نادر) بطور سچے مسئلوں کے تسلیم کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ قرآن کے بیانات کو بھی اُن کے مطابق کیا جاتا تھا، البتہ علمائے علم کلام نے یونانیوں کے چند مسائل میں ترمیم اور بعض میں اختلاف کیا تھا، جن کو وہ صریح مذہب کے برخلاف سمجھتے تھے، اور اُس کے سوا باقی مسائل کو بطور سچ کے تسلیم کرتے تھے۔ آسمانوں کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا، جس میں علمائے اسلام نے کچھ تھوڑی ترمیم کی تھی، اور اُس کے جسم کروی محیط ارض کے ہونے اور ستاروں کے اُس میں جڑے ہوئے ہونے اور آسمانوں کے زمین کے گرد چکر کھانے کو ویسا ہی تسلیم کیا تھا، جیسا کہ یونانیوں نے بیان کیا تھا۔ اس لئے تفسیروں میں اور مذہبی کتابوں میں آسمان کے وہی معنی یا اُس کے قریب قریب مروج ہو گئے جو یونانی حکیموں نے بیان کئے تھے، اور بہت بڑی غلطی یہ پڑ گئی کہ لفظ تو لیا قرآن کا اور اُس کے معنی لئے یونانی حکیموں کے، اور رفتہ رفتہ وہ معنی ذہن میں ایسے راسخ ہو گئے کہ اُن کا انکار کرنا گویا قرآن کا انکار کرنا ٹھیر گیا، مگر ایسا سمجھنا بناءِ فاسد علی الفاسد ہے +

اِس لئے میں ان معنوں سے جو اکثر مفسرین سمجھتے ہیں، انکار کرتا ہوں، اور مَیں کہتا ہوں کہ جن جن چیزوں پر قرآن مجید میں سما، یا سمٰوات کا اطلاق آیا ہے، وہی معنی سماء و سمٰوات کے ہم قرار دینگے، نہ وہ معنی جو علمائے اسلام نے یونانی حکیموں کی پیروی سے قرار دئے ہیں +

قرآن مجید میں جس کا بیان اُس کے ہر ایک موقعہ پر آویگا، اُس وسعت پر بھی سما کا اطلاق ہوا ہے، جو ہر شخص اپنے سر کے اوپر دیکھتا ہے اور اُس نیلی نیلی چیز پر بھی ہوا ہے جو گنبدی چھت کے مانند ہر شخص کو اُس کے سر کے اوپر دکھائی دیتی ہے۔ اور اُن چمکنے چمکنے جسموں پر بھی ہوا ہے

ك۱ فان قال قائل فھل بدل التنصیص علی سبع سمٰوات علی نفی العدد الزائد قلنا الحق ان تخصیص العدد بالذکر لا یدل علی نفی الزائد (تفسیر کبیر) +

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ	کہ میں زمین میں

جن کو ہم ستارے یا کواکب کہتے ہیں۔ بادلوں پر بھی ہوا ہے جو مینہ برساتے ہیں، مگر قرآن نے آسمان کے وہ معنی جو یونانی حکیموں نے بیان کئے ہیں کہیں نہیں بتلائے، اِس لئے ہم اُن سے انکار کرتے ہیں، اور جو معنی قرآن نے بتائے ہیں اُنہی معنوں میں سے کوئی معنی سماء کے لفظ کے سمجھتے ہیں ✦

اِس مقام پر سماء کے لفظ سے وہ وسعت مُراد ہے جو ہر شخص اپنے سر کے اوپر دیکھتا ہے، پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا اُس وسعت کی طرف متوجہ ہُوا جو انسان کے سر پر بلند دکھائی دیتی ہے اور ٹھیک اُس کو سات بلندیاں کر دیں، سات سیارۂ کواکب کو ہر کوئی جانتا تھا، عرب کے بدوی بھی اُن سے بخوبی واقف تھے، وہ ستارے اوپر تلے دکھائی دیتے ہیں، یعنی ایک سب سے نیچا، دوسرا اُس سے اُونچا، اور تیسرا اُس سے اونچا، اور علیٰ ہٰذا القیاس، اور اُن کواکب کے سبب جو بطور روشن نشانوں کے اُس وسعت مرتفع میں دکھائی دیتے ہیں، اُس وسعت کے ساتھ جدا جدا حصّے یا درجے یا طبقے ہو جاتے ہیں، پس اسی کی نسبت خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ اُس کو ٹھیک سات آسمان کر دیئے ✦

یہ معنی جو ہم نے بیان کئے اگرچہ لوگوں کو ایک نئی بات معلوم ہوتی ہوگی، مگر یہی معنی بعض معتبر مفسروں نے بھی سمجھے ہیں، تفسیر[ل۱] بیضاوی میں لکھا ہے کہ "سماء سے یا اجرامِ عُلوی (جن میں کواکب بھی داخل ہیں) مراد ہیں یا اوپر کی طرفیں"، پس انہی مجمل لفظوں کی یہ تفصیل ہے جو ہم نے بیان کی ہے ✦

(۲۸) [وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ] اس آیت سے وہ ذکر شروع ہُوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے، تمام مفسرین اس کو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہُوا، تعالیٰ شانہٗ عمّا یقولون ✦

"ملک" کے معنی ایلچی یا پیغامچی کے ہیں، عبرانی، یونانی، اور فارسی، میں جو لفظ ملک کے لئے ہے اُن سب کے معنی بھی ایلچی کے ہیں۔ جو خدا کا پیغام نبیوں کو پہنچاتا ہے، توریت میں بعض جگہ عام ایلچی کے لئے بھی بولا گیا ہے، اور بعض جگہ مذہبی پیشواؤں اور ابر، اور ہوا، اور وبا کے لئے، مگر فرشتوں کے وجود کی نسبت لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں۔ انسان کی یہ ایک طبعی بات ہے کہ جب کسی ایسی مخلوق کا ذکر ہو جس کو وہ نہیں جانتا، تو خواہ نخواہ اُس کے دل میں اُس مخلوق کے ایک جسمانی جسم متحیز کا جس کے رہنے کی کوئی جگہ بھی ہو خیال جاتا ہے

[ل۱] والمراد بالسّماء ھٰذہ الاجرام العلویہ او جھات العلو (بیضاوی) ✦

خلیفۃً	ایک خلیفہ بنانے والا ہوں

پھر اُن کے اوصاف پر خیال کرتے کرتے اُن کی ایک صُورت جو اُن اوصاف کی مقتضی ہوتی ہے، اُس کے خیال میں قرار پاتی ہے، اور پھر وہ اس بات کو تو بھول جاتا ہے کہ مَیں اُس مخلوق کو نہیں جانتا، نہ مَیں نے اُس کو کبھی دیکھا ہے اور یوں جاننے لگتا ہے، کہ وہ مخلوق وہی ہے جو میرے خیال میں ہے، اور جب وہ خیال لوگوں میں نسل درنسل چلا آتا ہے، تو ایسا مستحکم ہو جاتا ہے کہ گویا اُس میں شک وشبہ مطلق ہے ہی نہیں، یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوُا ہے۔ اُن کو نوری سمجھ کر گورا گورا سفید برف کا رنگ، نوری شمع کی مانند با ہیں، بلور کیسی پنڈلیاں، ہیرے کیسے پاؤں، ایک خوبصُورت انسان کی شکل، مگر نہ مرد نہ عورت تصوّر کیا ہے، آسمان اُن کے رہنے کی جگہ قرار دی ہے، آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کے لئے اُن کے پر لگائے ہیں، کسی کو شان دار، اور کسی کو غصہ ور وغضبناک، کسی کو کم شان کا، کسی کو صور پھونکتا، کسی کو آتشیں کوڑے سے مینہ برساتا، خیال کیا ہے، بعض اقوام نے جو زیادہ غور وفکر کی ہے، تو اُن کے لئے نہ جسم مانا ہے، اور نہ اُن کا متحیّز ہونا تسلیم کیا ہے، اور اس لئے فرشتوں کی نسبت انسانوں کے دو فرقے ہو گئے ہیں، ایک وہ جو فرشتوں کے وجود اور اُن کے متحیّز ہونے دونوں باتوں کے قائل ہیں، اور ایک وہ کہ اُن کے متحیّز ہونے کے قائل نہیں، بعض بُت پرست سمجھتے تھے کہ فرشتے سعد اور نحس کواکب کی روحیں ہیں، مجوسی اور بعض بت پرستوں کا یہ خیال تھا کہ عالم کی ترکیب نور وظلمت سے ہے، اور نور وظلمت دونوں موجود حقیقتیں ہیں، مگر آپس میں مختلف، اور ایک دوسرے کی ضد، نور کے بھی بال بچے پیدا ہوتے ہیں، اور ظلمت کے بھی بال بچے پیدا ہوتے ہیں، مگر نہ اس طرح جیسے کہ انسان اور حیوان جنتے جناتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے حکیم سے حکمت اور روشن چیز سے روشنی، اور احمق سے حماقت، نور کی اولاد تو فرشتے ہیں، اور ظلمت کی اولاد شیطان، حکماء عقول ہی پر جن کو اُنھوں نے تسلیم کیا ہے۔ فرشتہ کا اطلاق کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فرشتے حقیقتِ موجودہ غیر متحیّزہ ہیں اور اُن کی حقیقت نفوس انسانی کی حقیقت سے زیادہ تر قوی ہے، اور انسان کی بہ نسبت اُن کو علم بھی زیادہ ہے، اُن میں سے کچھ تو آسمانوں سے اس قسم کا علاقہ رکھتے ہیں، جیسے کہ ہمارے بدن سے ہماری روح، اور کچھ بجز استغراق کے ذات باری میں کسی چیز سے علاقہ نہیں رکھتے، اور وہی ملائکہ مقربین ہیں، اور بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ ان کے سوا دو قسمیں اور ہیں، اور وہ زمین کے فرشتہ ہیں اور دنیا کے امورات کو درست کرتے ہیں، جو نیک کام کرنے والے ہیں وہ تو فرشتے ہیں اور جو بدکام کرنے والے ہیں وہ شیطان ہیں ۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۤءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ	بولے کیا تو اُس میں ایسے کو خلیفہ کریگا جو اُس میں فساد کرے اور خون بہا دے، اور ہم تو تیری تعریف جپتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں،

یہودی فرشتوں کو آدمی کی صورت پر مجسّم مانتے تھے، اور اُن کو اجسام حقیقی سمجھتے تھے، البتہ اُن کے جسم کے مادہ کو مثل انسان کے جسم کے مادہ کے نہیں مانتے تھے، بلکہ یہ کہتے تھے کہ اُن کا جسم مادۂ غلیظ سے مرکب نہیں ہے، وہ اپنے تئیں انسانوں کو دکھلا بھی دیتے ہیں، اُن سے بات چیت بھی کرتے ہیں، اُن کے ساتھ کھانا بھی کھاتے ہیں، اور غائب بھی ہو جاتے ہیں، پھر کوئی اُن کو نہیں دیکھ سکتا، اُن کے کھانا کھانے کے باب میں کہتے ہیں، کہ ظاہر میں کھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر انسانوں کی خوراک نہیں کھاتے، بلکہ اُن کا کھانا اور ہی کچھ ہے، یہودیوں میں جو ایک صدوقی فرقہ تھا وہ فرشتوں کا قائل نہ تھا، عیسائیوں کا بھی یہی خیال تھا، کہ فرشتے جسم رکھتے ہیں، اور مقدس ہیں، انجیل میں حضرت عیسےٰ کو فرشتوں سے برتر کہا گیا ہے، اور بہشتیوں کی نسبت کہا ہے کہ وہ فرشتوں کی مانند ہونگے ◆

عرب کے بُت پرست فرشتوں کو ایک مجسّم اور متحیّز چیز سمجھتے تھے، اور جانتے تھے کہ وہ کھاتے پیتے نہیں، اور نہ کچھ بشری ضرورت اُن کو ہے، وہ آسمانوں پر رہتے ہیں اور زمین پر آتے جاتے ہیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان بھی فرشتوں کو زمین پر رہتے چلتے پھرتے دیکھ سکتا ہے، اسی خیال سے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کرتے تھے، کہ اگر وہ پیغمبر ہیں تو اُن کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں ہیں، عام مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے جو عرب کے بُت پرستوں کا تھا، وہ فرشتوں کو ہوا کی مانند لطیف اجسام سمجھتے ہیں، اور مختلف شکلوں میں بنجانے کی اُن میں قدرت جانتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ وہ آسمانوں پر رہتے ہیں اور پردار ہیں کہ اُڑ کر زمین پر اُترتے ہیں، اور زمین پر سے اُڑ کر آسمان پر چلے جاتے ہیں اور چیلوں کی طرح آسمان اور زمین کے بیچ میں منڈلاتے ہیں، غرضکہ تمام اقوام میں فرشتوں کی نسبت انسانی نقائص سے پاک ہونے کا اور ایک اعلےٰ تقدس کا خیال تھا، اسی خیال کی وجہ سے نیک اور اچھے آدمی کو بھی مجازاً فرشتہ کہتے تھے، جیسے کہ حضرت یوسف کو زلیخا کی سہیلیوں نے کہا ” مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ “ ◆

مَیں کہتا ہوں کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوق کا ایک سلسلہ ہم دیکھتے ہیں اُسی طرح

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا	کہا میں جانتا ہوں وہ کچھ جو تم نہیں جانتے ﴿۲۸﴾ اور (اللہ نے) آدم کو سارے کے سارے نام سکھا دیئے،

انسان سے برتر مخلوق ہونے سے انکار کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، شاید کہ ہو، گو وہ کیسی ہی عجیب اور ناقابل یقین ہو۔ مگر ایسی خلقت کے درحقیقت موجود ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس بات کا ثبوت کہ ایسی خلقت ہے، نہیں ہے، قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ برخلاف اُس کے پایا جاتا ہے، خدا فرماتا ہے "وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ" یعنی کافروں نے کہا کیوں نہیں بھیجا پیغمبر کے ساتھ فرشتہ، اور اگر ہم فرشتہ بھیجتے تو بات پوری ہو جاتی اور ڈھیل میں نہ ڈالے جاتے، اور اگر ہم فرشتہ ہی پیغمبر کرتے تو اُس کو آدمی ہی بناتے اور بلاشبہ اُن کو ایسے ہی شبہ میں ڈالتے جیسے کہ اب شبہ میں پڑے ہیں۔ اس آیت سے پایا جاتا ہے کہ فرشتے نہ کوئی جسم رکھتے ہیں، اور نہ دکھائی دیسکتے ہیں، اُن کا ظہور بلا شمول مخلوق موجود کے نہیں ہو سکتا "لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا" قید احترازی نہیں ہے، اس جگہ انسان بحث میں تھا، اِس لئے "لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا" فرمایا ورنہ اُس سے مراد عام موجود مخلوق ہے ۔

ان باریک باتوں پر غور کرنے سے اور اس بات کے سمجھنے سے کہ خدا تعالےٰ جو اپنے جاہ و جلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے تو جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے اُن کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا، بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور اُن قوےٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں۔ ملک یا ملائکہ کہا ہے، جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے، پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی قوت نمو، برق کی قوت جذب و دفع، غرضکہ تمام قوےٰ جن سے مخلوقات موجود ہوئی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں، وہی ملائک و ملائکہ ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، انسان ایک مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا ہے، اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذرّیات ہیں، جو ہر ایک قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں، اور وہی انسان کے فرشتے اور اُن کی ذرّیات، اور وہی انسان کے شیطان اور اُس کی ذرّیات ہیں ۔

بعض اکابر اہل اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں، اور امام محی الدین ابن عربی نے

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۹)	پھر اُن کو (یعنی آدم یا انسان کو) فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا کہ مجھ کو ان کے نام (یعنی وہ حقائق و معارف جو اُن میں ہیں) بتاؤ اگر تم سچے ہو (۲۹)

فصوص الحکم میں یہی مسلک اختیار کیا ہے، شیخ عارف باللہ موید الدین ابن محمود المعروف بالجندی نے، جو مریدان خاص شیخ صدر الدین قونوی، مرید امام محی الدین ابن عربی سے ہیں، شرح فصوص الحکم میں فرشتوں کی نسبت بہت بڑی بحث لکھی ہے[۱] شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصطلاح میں تمام عالم کو مجموع

[۱] قال الشیخ رضی اللہ عنہ فی فصوص الحکم "وکانت الملٰئکۃ من بعض قوی تلک الصورۃ التی ھی صورۃ العالم المعبر عنہ فی اصطلاح القوم بالانسان الکبیر" قال الشیخ مؤید الدین ابن محمود الجندی الذی اخذ الطریق من الشیخ صدر الدین قونوی وھو عن الشیخ محی الدین ابن العربی صاحب الفصوص "اعلم ان الملٰئکۃ ھی ارواح القوی القائمۃ بالصور الحسیۃ والارواح النفسیۃ والعقلیۃ القدسیۃ وتسمیتھا ملٰئکۃ لکونھا روابط ووصلات بین الاحکام الربانیۃ والامدادات الالٰھیۃ الی العوالم الجسمانیۃ فان الملک فی اللغۃ ھو القوۃ والشدۃ فلما قویت ھذہ الارواح بالانوار الربانی وتاییدات واشتدت بھا وقویت بالوسائل الربانیۃ والاسماء الالٰھیۃ ایضاً علی ایقاع احکامھا وآثارھا وایصال انوارھا واظھارھا سمیت ملٰئکۃ وھم منقسمون الی علوی روحانی وسفلی طبیعی عنصری ومثالی ونورانی ثم منھم المھیمون ومنھم المسخرون ومنھم المرادۃ من الاعمال والاقوال والانفاس الصافون والحافون والعالون الی آخر ما قال" +

قال الشیخ نعم "فکانت الملٰئکۃ کالقوی الروحانیۃ والحسیۃ التی فی نشأۃ الانسان وکل قوۃ منھا محجوبۃ بنفسھا لا تری افضل من ذاتھا" قال الشارح "القوی الحسیۃ التی فی نشأۃ الانسان ھی التی متعلقاتھا المحسوسات کالابصار والسماع والشم والذوق واللمس وما تحت ھذہ الکلمات من الانواع والتخصصات واما القوی الروحانیۃ فکالمتخیلۃ والمفکرۃ والحافظۃ والذاکرۃ والعاقلۃ والناطقۃ وھذہ القوی الکلیات وتخصصاتھا فی حیطۃ الروح النفسانی ومنشاءھا ومجاری تصرفاتھا واحکامھا وآثارھا الدماغ وکالقوی الطبیعیۃ مثل الجاذبۃ والماسکۃ والھاضمۃ والغاذیۃ والمنمیۃ والمربیۃ والمصورۃ وتخصیصاتھا راجعۃ الی الروح الطبیعی وکالحلم والعلم والوقار والغناء والسخاء والعدالۃ والسیاسۃ والنجدۃ والریاسۃ وغیرھا مما تحتھا من التخصصات والانواع المماثلۃ والمشاکلۃ والمباینۃ والمنافرۃ عائدۃ الی الروح الحیوانی والنفسانی وکانت ھذہ القوی مبثوثۃ فی اقطار نشأۃ الانسان ولکن لکل حس وصنف ونوع من ھذہ القوی محلاً خصصابھا ھو محل ظھور احکامھا وآثارھا ومساقط حقائقھا واسرارھا ولکن حکم جمعیۃ الانسان سار فی الکل بالکل فلذلک العالم الذی ھو الانسان الکبیر فی زعمھم کانت ھذہ القوی امھاتھا وجزئیاتھا وانواعھا وتخصصاتھا منتشرۃ ومبثوثۃ فی فضاء السمٰوات والارضین وما فیھما وما فوقھما من العوالم وتعینات ھذہ القوی والارواح فی کل حال بما یناسبہ ویوافقہ علی الوجہ الذی یلائمہ وبطائفہ وبھا ملاک الامر النازل من حضرات الربوبیۃ +

بولے تو ہی برگزیدہ ہے، تو نے جو کچھ ہم کو سکھایا ہے اُس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے ﴿۳۰﴾	قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۰﴾

من حیث المجموع انسان کبیر کہتے ہیں، اور انسان کو انسان صغیر، مقصود اُن کا اس اصطلاح سے یہ ہے کہ انسان عالم کی ایک فرد ہے، اور جس قدر قوئے انسان میں ہیں وہ جزئیات ہیں، اور جو اُس کے کلیات ہیں وہ انسان کبیر ہے، اور فرماتے ہیں کہ اُس عالم یعنی انسان کبیر کے جو قوئے ہیں اُنہی میں بعض کا نام ملائک ہے +

شیخ رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں کہ وہ قوئے جن کو ملائک کہتے ہیں انسان کبیر یعنی عالم کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے قوی ہیں، شارح کہتے ہیں کہ دیکھنا اور سُننا اور سونگھنا اور چکھنا اور چھونا جو انسان میں ہے، وہ سب اُنہی قوائے ملکوتی حسّیہ کے ماتحت ہیں اور قوت متخیلہ اور متفکرہ اور حافظہ اور ذاکرہ اور عاقلہ و ناطقہ اُنہی قوائے ملکوتی روحانیہ کے تابع ہیں، اور جاذبہ اور ماسکہ اور ہاضمہ اور غاذیہ اور منمیہ اور مربیہ اور مصورہ اُنہی قوائے ملکوتی طبیعیہ میں داخل ہیں، اور حلم اور علم اور وقار اور سمجھ اور شجاعت اور عدالت اور سیاست اور ریاست اُنہی قوائے ملکوتی حیوانیہ میں شامل ہیں، اور یہ تمام قوئے آسمان و زمین اور اُن کی فضا میں پھیلے ہوئے ہیں +

پس شیخ اور اُن کے متبع بھی ملائکہ کا اطلاق صرف قوائے عالم پر کرتے ہیں، ہمارے استنباط اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے استنباط میں صرف اتنا فرق ہے، کہ شیخ کے نزدیک تمام قوائے جو اجسام مرئیہ و غیر مرئیہ اور اشیائے محسوسہ و غیر محسوسہ میں ہیں وہ جزئیات ہیں اور جو اُن کے کلیات ہیں وہ ملائک ہیں، اور یہ جزئیات اُن کے ذرّیات، شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکاشفہ سے ان جزئیات کے کلّیات کو جانا ہوگا، مگر جو کہ ہم کو وہ مکاشفہ حاصل نہیں ہے، اِس لئے ہم اُنہیں قوئے کو جن کو شیخ اور اُن کے متبع ذرّیات ملائکہ قرار دیتے ہیں ملائکہ کہتے ہیں، مطلب ایک ہے صرف لفظوں یا جاننے نہ جاننے کا پھیر ہے +

شیطان کی نسبت[۱] تو قیصری شرح فصوص میں نہایت صاف صاف وہی بات لکھی ہے

---

[۱] فی القیصری شرح الفصوص فی ذیل بیان ابلیس "فابلیس هو قوة الوهمیة الکلیة التی فی العالم الکبیر والقوی الوهمیة التی فی الاشخاص الانسانیة والحیوانیة افرادها المعارضها مع العقل الهادی طریق الحق ونبه بطریان النفس المنطبعة هی الامارة بالسوء والرجیم من جنودها وتحت حکمها لانها من قواها هی اولی بذلك کما قال تعالی ونعلم ما توسوس به نفسه وقال ان النفس لامارة بالسوء وقال علیه السلام اعداء عدوك نفسك التی بین جنبیك وقال علیه السلام الشیطان یجری من بنی آدم مجری الدم وهذا شان النفس" +

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ	کہا اے آدم اُن کے (یعنی فرشتوں کے) نام (یعنی اُن کے حقائق ومعارف) اِن کو (یعنی فرشتوں کو) بتادے،

جو ہم نے کہی ہے،" اُس میں لکھا ہے کہ "بعضوں نے یہ بات کہی ہے کہ انسان کبیر یعنی عالم میں جو قوت وہمیہ کلیہ ہے وہی ابلیس ہے، اور ہر ایک انسان میں جو قوت وہمیہ ہے وہی ابلیس کی ذریات ہیں، مگر شارح کہتا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے، وہم نہیں، بلکہ نفس امّارہ جو انسان میں ہے وہی ذرّیات ابلیس ہے، خدا نے بھی فرمایا ہے " کہ جو وسوسے دل میں آتے ہیں اُن کو ہم جانتے ہیں،" اور فرمایا ہے کہ نفس ہی بُرائی کرنے کو کہتا ہے " آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ " سب دشمنوں سے زیادہ دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے پہلووں میں ہے " اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ " شیطان انسان میں خون کی طرح چلتا ہے، اور ٹھیک یہ حالت نفس کی ہے " غرضکہ تمام محققین اِس بات کے قائل ہیں۔ کہ انہی قوائے کو جو انسان میں ہیں اور جن کو نفس امّارہ یا قوائے بہیمیہ تعبیر کرتے ہیں یہی شیطان ہے ÷

اگر فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علٰحدہ وجود رکھتے ہیں جیسے کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ تو بھی یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہ مباحثہ خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا؟ کیونکہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کرسکتے، بلکہ اُس کے حکم کو بجا لاتے ہیں، خدا نے فرمایا ہے " وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ۙ لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ وَهُمۡ بِاَمۡرِهٖ يَعۡمَلُوۡنَ [a]" یعنی کافروں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بیٹی بنالئے ہیں حالانکہ وہ اُس سے پاک ہے بلکہ (جن کو وہ بیٹا بیٹی کہتے ہیں وہ) معزز بندے (یعنی عمدہ مخلوق) ہیں۔ خدا کے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے اور جو وہ کہتا ہے وہی وہ کرتے ہیں، اِس آیت سے فرشتوں کو مجال مباحثہ خدا سے نہیں معلوم ہوتی، پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا اُٹھایا تھا ÷

اصل یہ ہے کہ اِن آیتوں میں خدا تعالٰی نے انسان کی فطرت کو اور اُس کے جذبات کو تبلایا ہے، اور جو قوائے بہیمیہ اُس میں ہیں اُن کی بُرائی یا اُن کی دشمنی سے اُس کو آگاہ کرتا ہے، مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والوں کے فہم سے بہت دور تھا، اس لئے خدا نے انسانی فطرت کی زبان حال سے، آدم وشیطان کے قصے یا خدا اور فرشتوں کے مباحثہ کے طور پر اس فطرت کو بیان کیا ہے، تاکہ ہر کوئی خواہ اُس کو فطرت

[a] سورۂ انبیاء (آیت ۲۶ و ۲۷) ÷

فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	پھر جب آدم نے اُن کے (یعنی فرشتوں کے) نام اُن کو (یعنی فرشتوں کو) بتا دیئے (خدا نے) کہا کہ میں نہ تم کو کہتا تھا کہ میں آسمانوں کی اور زمین کی چھپی باتوں کو جانتا ہوں ،

کا راز سمجھے ، خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ ، خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا ، اصلی مقصد حاصل کرنے سے محروم نہ رہے ، اِس طرح پر عام و خاص سمجھدار و ناسمجھ عالم و جاہل کا یکساں قرآن مجید سے مقصد پانا درحقیقت بہت بڑا معجزہ قرآن کا ہے ۔ توریت میں لکھا ہے کہ " خدا نے فرشتوں سے کہا کہ " آؤ ہم آدمی کو اپنی صورت پر بناویں " یہ مضمون مسلمان مفسروں کے دل میں تھا ، اور وہ اُس کو مثل یہودیوں کے ایسا ہی سمجھ لیے تھے جیسے کہ ایک آدمی سے ایک آدمی بات کرتا ہے " اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ " کو بھی اُنھوں نے ویسا ہی سمجھا ، اور آدم و شیطان کا قصہ بنا لیا ورنہ صرف انسان کی فطرت کا زبان حال سے بیان ہے ❖

اِس طرح مخلوق کی زبان حال سے سوال و جواب میں مطالب کا بیان اور جگہ بھی قرآن مجید میں آیا ہے ، خدا نے زمین کی زبان حال سے حکایۃً فرمایا کہ " جب ہم نے [۱] آسمان و زمین سے کہا کہ تم دونوں خواہ نخواہ حاضر ہو دونوں نے کہا کہ ہم دونوں بخوشی حاضر ہیں ۔ اور جہنم کی نسبت فرمایا [۲] کہ جس دن ہم جہنم کو کہینگے کہ تو بھر گئی ؟ تو وہ کہیگی کہ ہے اس سے زیادہ اور بھی ؟ پس ان آیتوں میں خدا تعالےٰ نے ایسی چیزوں کی زبان حال سے جو گویا نہیں ہیں ، سوال و جواب کے طور پر اُن کی فطرت کو جس طرح کہ انسان کے خیال میں آسکتی ہے بیان کیا ہے ❖

قصہ یا حکایت کئی طرح پر بیان کی جاتی ہے ، اور وہ بیان بالکل سچ ہوتا ہے ، کبھی ایک واقع کا بیان کیا جاتا ہے جو درحقیقت واقع ہو چکا ہے ، مثلاً زید نے عمرو سے تکرار کی اور آخرکار زید نے عمرو کو مار ڈالا ، پس اِس واقعہ کا بیان کرنا ایک ایسے قصہ اور واقعہ کا بیان کرنا ہے جو واقع ہو چکا ہے ، اور وہ بیان بالکل سچ ہے ، اور کبھی اُن واقعات کا بیان کیا جاتا ہے جو انسان خواب میں دیکھتا ہے ، جس میں عجیب واقعات پیش آتے ہیں ، اُن واقعات کا بیان کرنا بھی باوجود یکہ اُن میں سے ایک بھی بجز خیال کے ظاہر میں واقع نہیں ہوا ، بالکل سچا بیان ہے ، بشرطیکہ صراحۃً یا اشارۃً یا کنایۃً یا قرینہ سے یا کسی کلام ماسبق سے یا طرز کلام سے پایا جاوے ، کہ یہ بیان اُن واقعات کا ہے جو خواب میں دیکھے ہیں ۔ اور کبھی کسی کی حالت سے

[۱] ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین (سورہ حم سجدہ آیت ۱۰)

[۲] یوم نقول لجھنم ھل امتلئت وتقول ھل من مزید (سورہ ق آیت ۲۹) ❖

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ	اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اُس کو بھی جانتا ہوں ﴿۳۱﴾ اور جب ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اُنہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے،

جو امور مترشح ہوتے ہیں، اُس حالت کو بطور ایک متکلم کے قرار دیکر اُس کی زبان سے قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بیان اگر خلاف اُس حالت کے ہو جس کو بطور متکلم کے قرار دیا ہے تو وہ قصہ جھوٹا ہے، اور قرآن مجید میں اس قسم کا کوئی قصہ نہیں ہے، اور اگر وہ حالت اُس چیز میں فرض کر لی گئی ہے، اور اُس حالت مفروضہ کو متکلم قرار دیکر قصہ بیان کیا گیا ہے، تو وہ صرف ایک شاعرانہ مضمون ہے، اور اگر وہ حالت واقعی اور صحیح ہے، اور بیان بھی اُس حالت کے مطابق ہے، تو وہ بیان بالکل سچ اور درست ہے، کیونکہ اُس بیان کا منشا، یہ نہیں ہوتا، کہ زمین بولی تھی اور آسمان پکارا تھا اور دوزخ چلائی تھی، بلکہ کسی فائدہ کے لئے صرف اُس حالت کی کیفیت کا اظہار مطلوب ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تمام حکایتیں جو کسی کی زبان حال سے تعبیر کی گئی ہیں سب ایسی ہی ہیں اور اس لئے بالکل سچ ہیں *

امثال کا بھی یہی حال ہے کہ کبھی ایسی بات کی مثال دیجاتی ہے جو درحقیقت واقع ہو چکی ہے، اور کبھی ایک ایسی بات کی مثال دیجاتی ہے جو صرف فرضی ہے، اور کبھی واقع نہیں ہوئی، مگر اُس کی مثال دینی نہ غلط ہوتی ہے نہ جھوٹ، قرآن مجید، جو انسان کی زبان ہیں، اور انسان کے محاورۂ بول چال میں، نازل ہوا ہے، اور جس میں بہت سی ایسی بھی باتیں ہیں جو ہمارے تجربہ و مشاہدہ سے بالاتر ہیں، اِس لئے اُن مطالب کو طرح طرح کی مثالوں اور حکایتوں سے بیان کیا ہے، قرآن مجید پر غور کرتے وقت اُن چیزوں کا خیال نہ رکھنا، اور تمام تمثیلوں اور حکایتوں کو یوں قرار دینا، کہ یہ یوں ہی واقع ہو چکی ہیں، تفسیر القرآن بما لا یرضیٰ قائلہ میں داخل ہے، صاحب تفسیر کشف الاسرار نے اسی آیت کی بحث میں جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں اسی مطلب کی طرف اپنی تفسیر میں اشارہ کیا ہے *

سلہ قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك" المعنی ان اللہ تعالیٰ اخبرنا فی کتابہ العزیز بما یحب ان یسمع بہ من الاخبار من اول العالم الی اخرہ ولما لم یکن لنا الی علمہ ما اراد ان نعلمہ سبیل الا بضرب الامثال والامثال منقسم الی قسمین احدہما یفرضہ المتکلم وان لم یکن وقع فی الوجود والآخر قد کان فی الوجود وجری فالاولیٰ ان نضرب الامثال ما وقع فی الوجود لنعلم من ذلك مثلا لا بحرد الحکایہ عما وقع۔ فہذا الکتاب یشتمل علی الامثال التی یحتاج

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾	انکار کیا اور تکبر کیا، اور وہ کافروں میں سے تھا ﴿۳۲﴾

(وعلّم اٰدم الاسماء) "علّم" کے لفظ سے علمائے محققین نے پڑھانا یا سکھانا یعنی تعلیم کرنا مراد نہیں لیا ہے، بلکہ انسان میں اُن قوتوں کا مخلوق کرنا مراد لیا، جن سے انسان تمام چیزوں کو جانتا اور سمجھتا اور خیال کرتا اور سوچتا اور نئی باتیں ظاہر کرتا اور چند باتوں کے ملانے سے ایک نتیجہ نکالتا ہے[۱] بیضاوی میں لکھا ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں، کہ "اللہ تعالیٰ نے آدم کو مختلف اجزا اور متبائن قوتوں سے پیدا کیا تھا، جو طرح طرح کے معقولات اور محسوسات اور متخیلات اور متوہمات کے جاننے کے لائق تھیں، اور حقائق اشیا اور اُن کے خواص اور اُن کے اسماء اور علوم کے اصول اور صنائع کے قواعد اور اُن کے آلات کی کیفیت اُس کے دل میں ڈالی تھی"، بس جو چیزیں کہ فطرت انسانی میں ہیں اُنہیں کو خدا تعالیٰ نے تعلیم کرنے کو لفظ سے تعبیر کیا ہے ❊

"آدم" کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے، جس کو عوام الناس اور مسجد کے مُلّا باوا آدم کہتے ہیں، بلکہ اُس سے نوع انسانی مراد ہے، جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاستار میں لکھا ہے "وما المقصود بآدم آدم وحده" اور خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے "لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ"، پس "کُمْ" کا خطاب کل انسانوں کی طرف ہے اور آدم سے بنی آدم یعنی نوع انسان مراد ہیں ❊

"اسماء" کے لفظ کے معنی اکثر مفسرین نے وہ سمجھے ہیں جس کو ہم نام کہتے ہیں، جیسے گھوڑا گدھا ٹٹو یا کلو بھو بدھو، مگر یہ ٹھیک نہیں ہے بیضاوی نے اسماء کی تفسیر میں اس کے اشتقاقی معنی[۲] مراد لئے ہیں، پس "علّم اٰدم الاسماء" سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب چیزوں کے نام بتا دئے تھے جو درحقیقت اُس وقت خارج میں موجود بھی نہ تھیں، بلکہ جو قوی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) الی علمها الانسان من دلائله اعلی احرمرجعها الی الله سبحانه - والمراد بالامثال ما السمر بالامثال فی النفوس من الهامات ولهذا قال لقد ضربنا للناس فی هذا القرآن من کل مثل فافهم ❊ (تفسیر کشف الاسرار) ❊

[۱] والمعنی انه تعالیٰ خلقه من اجزاء مختلفة وقوی متباینة مستعدا لادراک انواع المدرکات من المعقولات والمحسوسات والمتخیلات والموهومات والهمه معرفة ذوات الاشیاء وخواصها واسمائها واصول العلوم وقوانین الصناعة وکیفیة آلاتها (بیضاوی) ❊

[۲] والاسم باعتبار الاشتقاق ما یکون علامة للشیٔ ودلیلا یرفعه الی الذهن من الالفاظ والصفات والافعال (بیضاوی)

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۳)	اور ہم نے آدم سے کہا کہ بس تو اپنے جوڑے سمیت جنّت میں اور اُس میں سے دل بھر کر کھاؤ جہاں سے چاہو اور اُس درخت کے پاس مت جاؤ، نہیں تو ظالموں میں ہو گے (۳۳)

اُس میں پیدا کئے ہیں، اور جن کے سبب اُس کا ذہن ایک نشان یا دلیل سے دوسری طرف منتقل ہوتا ہے، اور نتیجہ پیدا کرتا ہے، اُس کو اسماء کے لفظ سے بیان کیا ہے، اور چونکہ یہ قوٰے ایسے تھے جن سے انسان تمام چیزوں، محسوسات و معقولات کو جان سکتا ہے، اسی لئے ،، کلّھا ،، کے لفظ سے اُس کی تاکید کی ہے، جس سے اس بات کا اشارہ ہے کہ تمام چیزوں کے جاننے کا مادہ انسان میں ودیعت کیا گیا ہے، ان قوٰے کو جو اسماء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اُس میں بڑا دقیقہ یہ ہے، کہ انسان کسی چیز کی حقیقت و ماہیت کو نہیں جانتا، جو کچھ وہ جانتا ہے وہ صرف اسماء ہی اسماء ہیں، پس ،، عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ،، کہنا بالکل انسان کی فطرت کے مطابق اور اُس کے بیان کے نہایت ہی مناسب ہے ✦

تفسیر کشف الاسرار[1] میں اس سے بھی زیادہ وضاحت اور عمدگی سے بیان کیا ہے کہ ہر شے کا علم بالقوہ جو انسان کی فطرت میں ہے اُسی کو ،، عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ ،، سے تعبیر کیا ہے پس آیت کے معنی یہ ہوئے، کہ خدا تعالےٰ نے انسان میں ایسے قوٰے پیدا کئے ہیں، جن سے ہر ایک چیز کو سمجھ سکتا ہے، اور دلیل سے نتیجہ کو حاصل کر سکتا ہے۔ ،، عَرَضَهُمْ ،، میں جو ضمیر جمع مذکر کی ہے اُس کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے، اِس لئے تمام مفسّرین نے اسماء کے لفظ سے جو ضمناً اُس کے سمیات سمجھ میں آتے ہیں، اُس طرف اس ضمیر کو راجع کیا ہے، پھر یہ مشکل پیش آئی ہے کہ اُس کے لئے ضمیر مؤنث کا ہونا چاہئے تھا، نہ ضمیر جمع مذکر کا۔ اس کا حل صاحب تفسیر بیضاوی نے یہ کیا ہے، کہ مسمیات میں ذوی العقول وغیر ذوی العقول سب شامل تھے، اس لئے تغلیباً ضمیر جمع مذکر کی جو ذوی العقول کے لئے مخصوص ہے لائی گئی ہے ✦

[1] فاعلم ان اللہ جلّ اسمہ اوجد فی آدم ما یحتاج الیہ من کون حاملة علیٰ ما ھو علیه من القوہ الناطقه وھداھا بنور العقل واشھدہ بذلك النور ما یجب لکل مسمی من اسم وقد علمت ان کل مسطوق به اسم معلم علی الاجمل معروھذا العلم فی جبله در تبه موجود لا یزول فھو علم کل شئ بالقوہ وکانه بو راد احدث فلا جه صار کل سئ بالفعل، علم الانسان مالم یعلم، نظھر من ھذا العلم فی کل زمن وقوم بحسب ما اراد اللہ (تفسیر کشف الاسرار) ✦

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ	پھر شیطان نے ان کو اُس سے ڈگمگا دیا پھر اُن دونوں کو اس سے جس میں وہ تھے نکلوایا،

مگر میرے نزدیک ،، ھُم ،، کی ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہے جو ضمناً لفظ آدم سے سمجھے جاتے ہیں، ہم نے ابھی بتایا ہے کہ آدم سے شخص خاص مراد نہیں ہے، بلکہ انسان مُراد ہے، اور اس مقام پر افراد انسانی کا موجود ہونا بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے، بلکہ صرف اُس کی فطرت کا بیان کرنا تسلیم ہُوا ہے، اور اس لئے ضمیر جمع مذکر غائب کا اُس کے لئے لانا بالکل صحیح تھا، گویا خدا تعالیٰ نے تمام چیزوں کے جاننے کی قوت انسان میں اور اُس کی ذرّیات میں ودیعت کر کر مثلاً فرشتوں سے کہا کہ تم سب باتیں تو کیا بتاؤ گے انسان ہی میں جو کچھ ودیعت کیا گیا ہے اُسی کو بتلا دو، جب وہ عاجز آئے تو خدا نے انسان سے کہا کہ تو اُن حقائق و معارف کو جو فرشتوں میں ہے بتلا دے اس آیت میں جو ،، ھم ،، کی ضمیر ہے وہ انسان کی طرف راجع ہے اور ،، انبئھم ،، اور ،، اسمائھم ،، میں جو ،، ھم ،، کی ضمیر ہے وہ فرشتوں کی طرف راجع ہے ✦

اِس قصہ میں جو سجدہ کا لفظ آیا ہے اُس کے معنی زمین پر سر ٹیکنے کے نہیں ہیں، بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری یا تذلّل کے ہیں، سجدہ کے لفظ کو ان معنوں میں مستعمل ہونے کے ثبوت میں بیضاوی نے دو شعر نقل کئے ہیں، پہلا شعر یہ ہے :-

بِجَمْعٍ تَضِلُّ الْبُلْقُ فِيْ حَجَرَاتِهِ ‏ ‏ تَرَى الْاُكْمَ فِيْهِ سُجَّدًا لِلْحَوَافِرِ

یہ شعر زید الخیل الطائی کا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے، کہ ٹیلے و جنگل اُس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کو سجدہ کرتے ہیں، یعنی ٹاپوں کے نیچے ذلیل ہوتے ہیں، اور روندے جاتے ہیں ✦ دوسرا شعر یہ ہے :-

فَقُلْنَ لَهَا وَهْمًا اَسْجَا حِطَامُهُ ‏ ‏ وَقُلْنَ لَهُ اَسْجِدْ لِلَيْلٰى فَاَسْجَدَا

یہ شعر حمید ابن ثور الہلالی کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے، کہ کیسا ہی وحشی و شریر اونٹ لیلیٰ کے سامنے لیجاویں اور لیلیٰ کی سہیلیاں اُس کو کہیں کہ لیلیٰ کو سجدہ کر تو وہ سجدہ کرتا ہے، یعنی گردن ڈالکر تابعداری کرتا ہے ✦

تین لفظ اِس قصہ میں اور ہیں، جنت، شجر، ھبوط، علمائے اسلام نے اُس کے بیان میں عجیب باتیں کی ہیں، جو لوگ کہ صرف لفظوں ہی پر چلتے ہیں اُنہوں نے تو جنت کو ایک خیالی بہشت عالم بالا پر مان لیا، اور درخت سے بھی سچ مچ کا کوئی درخت (گیہوں کا یا انگور کا یا انجیر کا) اور ،، ھبوط ،، سے عالم بالا سے زمین پر گرنا ✦

توریت میں بھی یہ قصہ نہایت عمدگی و لطافت سے بیان کیا گیا ہے، اُس میں جنت سے ایک باغ کا دنیا میں آدم کے لئے لگانا، اور اُس میں دو درختوں کا ہونا، جن کے کھانے سے آدم کو منع کیا تھا، ایک درخت، علم خیر و شر، اور دوسرا، درخت حیات، بیان ہُوا ہے۔ یہودی اور عیسائیوں

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ	اور ہم نے اُن کو کہا کہ اِس میں سے اُترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو،

نے بھی توریت کے بیان لطیف کو نہایت ابتر و خراب طرح پر بیان کیا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں، کہ درحقیقت خدا نے عدن میں ایک باغ اُگایا تھا، اور اُس میں سچ مچ کے دو درخت تھے، ایک کی یہ تاثیر تھی کہ اُس کے کھانے سے علم خیر و شر آجاتا ہے، جیسے سقمونیا کے کھانے سے دست آجاتے ہیں، اور دوسرے کا پھل امرت پھل ہے، جس کے کھانے سے آدمی کبھی نہیں مرتا پس بہت سے علمائے اسلام نے جن کو اس قسم کے قصص میں یہودیوں کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، اُن کی پیروی کی، اُنہوں نے کہا کہ یہ جنت زمین پر تھی اور ،، ھبوط ،، سے اُنہوں نے جنت سے باہر نکال دینے کے لئے معنی لئے، معتزلہ نے اُس کی جگہ بھی بتادی کہ فلسطین میں یا فارس و کرمان کے بیچ میں تھی، اور بعضوں نے کہا کہ سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی بھی زمین ہی پر تھا +

مگر ہم ان معنوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے، ہم شروع ہی سے اس قصہ کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے، بلکہ صرف انسانی فطرت کا اُس فطرت کی زبان حال سے بیان قرار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اُس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہے۔ جب تک کہ وہ مکلف کسی امر و نہی کا نہ تھا، وَلِلّٰهِ دَرُّ مَنْ قَالَ ؎

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم۔ سرگرداں شدیم +

اور اس کا شجر ممنوعہ کے پاس جانا، اس کا پھل کھانا، اُس کی فطرت کی اُس حالت کا بیان ہے، جب کہ وہ اوامر و نواہی کا مکلف ہوا، اور ھبوط سے اُس کی فطرت کی اُس حالت کا تبدیل ہونا مراد ہے، جب کہ وہ غیر مکلف سے مکلف ہوا، ہبوط[2] کے لفظ کا استعمال صرف انتقالِ مکان ہی پر مختص نہیں ہے +

اِس بات کا ذکر کہ خدا نے کس چیز سے آدم کو یا تمام زمین پر چلنے والے جانداروں کو پیدا کیا، متعدد لفظوں سے قرآن میں آیا ہے، ایک جگہ فرمایا ہے ،، اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ،، ایک جگہ فرمایا

---

[1] قال ابو القاسم البلخی و ابو مسلم الاصفہانی ہذہ الجنۃ فی الارض و حمل الاہباط علی الانتقال من بقعۃ الی بقعۃ کما فی قولہ تعالیٰ اِهْبِطُوْا مِصْرًا (تفسیر کبیر۔ سورہ بقر آیت ۳۵) +
وقال المعتزلۃ انہا بستان کان بارض فلسطین او بین فارس و کرمان خلقہ اللہ تعالیٰ امتحانا لآدم (حاشیہ بیضاوی برحاشیہ)
قال القاضی ان سدرۃ المنتہیٰ فی الارض سمیت بہا لان علم الملئکۃ ینتہی الیہا (مرقاۃ) +

[2] ھبط ثمن السلعۃ ھبوطًا، نقص و ھبطہ اللّٰہ ھبطا (قاموس) +

اور تم کو زمین میں ایک مدت تک ٹھیرنا اور کمانا ہے (۳۴)	وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۳۴)

ہے "خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ" اور ایک جگہ فرمایا ہے "من صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ" ایک جگہ فرمایا ہے "هُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا" ایک جگہ فرمایا ہے "خلق كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ" ایک جگہ فرمایا ہے "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" تراب" کے معنی مٹی کے ہیں" طین" کے معنی گارے کے ہیں" صلصال" کے معنی ریتلے گارے کے ہیں، اور "حماء مسنون" اُس بدبو کیچڑ کو کہتے ہیں جو پانی کے نیچے بیٹھی ہوئی ہوتی ہے" الما" کا لفظ تین جگہ آیا ہے" خلق کل دابہ من الماء" اور" جعلنا من الماء کل شیء حی" ان دونوں مقام میں جو لفظ" ماء" ہے، اُس سے تو نطفہ مراد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ دابہ کے پہلے جو لفظ "کل" ہے اُس میں تمام دابہ جو زمین پر چلتے ہیں، داخل ہیں، چنانچہ خود قرآن میں اُس کی تفصیل بیان فرمائی ہے کہ "منهم من يمشي على بطنه ومنهم من يمشي على رجلين ومنهم من يمشي على اربع" اور بہت سے دابہ ایسے ہیں جو نطفے سے پیدا نہیں ہوتے اور" من الماء بشرا" میں جو لفظ" ماء" ہے اُس سے بھی نطفہ مراد نہیں ہوسکتا، اِس لئے کہ یہاں بیان انسان کی اول خلقت کا ہے، اور خلقتِ اول انسان کی نطفہ سے نہیں ہوسکتی، بلکہ اُس سے دریا یا سمندر کا پانی مراد ہے، اور دلیل اُس کی یہ ہے کہ اسی آیت کے اوپر خدا نے فرمایا ہے" هُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا" اس کے بعد فرماتا ہے" وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا" پس" الماء" میں جو الف لام ہے وہ صاف اُسی پانی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کا اوپر بیان ہے[۱] بیضاوی نے بھی بطور قول مرجح اسی بات کو اختیار کیا ہے اور پانی سے وہی پانی مراد لیا ہے، پس اِن تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام چیزوں کی ترکیب کیمیاوی سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اُس سے انسان مخلوق ہوا ہے۔

دو چیزوں کا آپس میں مرکب ہونا دو طرح پر ہوتا ہے، ایک اس طرح پر کہ ظاہر میں اُن دونوں کے اجسام مل گئے اور دیر کے بعد پھر جدا ہو گئے، مثلاً ہم ایک بوتل میں پانی اور نہایت باریک ریت ڈالیں اور بوتل کو خوب ہلاویں تو ریت اور پانی بالکل ملجاویگا، مگر جب تھوڑی دیر رکھ دیں تو ریت الگ اور پانی الگ ہو جاویگا۔ یا ہم مٹی میں پانی ڈال کر اُس کو گارا بنادیں تو مٹی اور پانی ملجاویگا، مگر جب رہنے دیں تو پانی ہوا ہو کر نکل جاویگا، اور نری مٹی رہجاویگی، اس طرح پر دو چیزوں کا مرکب ہونا

---

[۱] خلق من الماء بشرا يعني الذي خمر به طينة آدم او جعله جزءا من مادة البشر لتجتمع وتسلسل وتقبل الاشكال والهيات بسهولة (بیضاوی)۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ
كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے چند کلمے سیکھے
پھر (خدا نے) اُس کو معاف کیا،

درحقیقت حقیقی ترکیب نہیں ہے +

اور ترکیب کیمیاوی یہ ہے کہ دو چیزیں آپس میں اس طرح پر ملیں کہ از خود جُدا نہ ہو سکیں، بلکہ وہ دونوں ملکر ایک تیسری چیز بن جاوے - پس، تُراب، اور، طین، اور، صلصال، اور، حماٍ مسنون، اور، ماء، کی ترکیبِ کیمیاوی سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اُس سے انسان پیدا ہُوا ہے، وہ چیز غالباً وہ ہے جو سطحِ آب پر جمع ہو جاتی ہے، اور نہ وہ مٹی ہوتی ہے، نہ ریت، نہ گارا، نہ کیچڑ، بلکہ اُن سب کی ترکیبِ کیمیاوی سے ایک اور ہی چیز بنجاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُسی سے تمام جاندار، انسان و حیوان، مخلوق ہوئے ہیں، اور یہی بات قرآن سے پائی جاتی ہے +

قرآن مجید میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ آیا ہے، سورۂ بقر، سورۂ آل عمران، سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ طٰہٰ، سورۂ ص، میں، کسی جگہ کوئی مضمون بیان ہُوا ہے، کسی جگہ کوئی، کسی جگہ اجمال ہے، کسی جگہ تفصیل، کسی جگہ ایک مضمون کو کسی لفظ سے ظاہر کیا ہے، دوسری جگہ کسی لفظ سے، مگر سب کا نتیجہ یا مقصد متحد ہے، ہم حاشیہ[۵۹] پر ان آٹھوں جگہ کی

[۵۹] واذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خليفة قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انی اعلم مالا تعلمون (سورۂ بقر) انی خالق بشرا من طين (ص) من تراب (آل عمران) من صلصال من حماٍ مسنون (الحجر) وعلم آدم الاسماء كلها ثم عرضهم علی الملئكة فقال انبئونی باسماء هؤلاء ان كنتم صدقين قالوا سبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم - قال يآدم انبئهم باسمائهم فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لكم انی اعلم غيب السموات والارض واعلم ما تبدون

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ مَیں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں بولے کیا تو اُس میں ایسے کو خلیفہ کریگا جو اُس میں فساد کرے اور خون بہاوے اور ہم تو تیری تعریف چپنے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں کہا میں جانتا ہوں وہ کچھ جو تم نہیں جانتے - مَیں پیدا کرنیوالا ہوں ایک آدمی کلے مٹی ریتیلے گارے، بدبو کیچڑ سے اللہ نے آدم کو سب نام سکھا دئیے پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھکو ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو - بولے تو ہی برگزیدہ ہے تو نے جو کچھ ہم کو سکھایا ہے اُس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے، بیشک تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے - کہا اے آدم اِن کے نام اُن کو بتادے پھر جب آدم نے اُن کے نام اُن کو بتا دئیے خدا نے کہا کہ مَیں نہ تم کو کہتا تھا کہ میں آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہوں، اور جو تم ظاہر کرتے ہو، اور جو

بیشک وہی معاف کرنیوالا بڑا مہربان ہے ﴿۳۵﴾	إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۳۵﴾

آیتوں کو اس طرح پر جمع کرتے ہیں، جس میں تمام مضمون اور الفاظ ایک جگہ سلسلہ وار جمع ہو جاویں اور اُس کے مقابل میں اُن کا ترجمہ بھی اُسی سلسلہ سے لکھتے ہیں تاکہ کل قصہ اُنہی الفاظ میں جو قرآن میں آئے ہیں ایک جگہ ہو جاوے، اور پھر اپنی سمجھ کے موافق جو ہم نے قرآن کا مطلب سمجھا ہے اُسی قصہ کو

بقیہ حاشیہ

وما كنتم تكتمون (بقر) ولقد خلقناكم
ثم صورناكم ثم قلنا للملئكة اسجدوا
لآدم (سورۂ اعراف) فاذا سويته
ونفخت فيه من روحي فقعوا له سٰجدين
(الحجر) فسجد الملئكة كلهم اجمعون
(الحجر) الا ابليس لم يكن من السٰجدين
(اعراف) كان من الجن ففسق عن امر
ربه (الكهف) ابى ان يكون من السٰجدين
(الحجر) واستكبر وكان من الكٰفرين (بقر)
قال يا ابليس ما لك الا تكون مع السٰجدين
(الحجر) ما منعك ان تسجد لما خلقت
بيدي استكبرت ام كنت من العالين
(ص) ما منعك الا تسجد اذ امرتك
(اعراف) قال ءاسجد لمن خلقت طينا
(بنی اسرائیل) لم اكن لاسجد لبشر خلقته
من صلصال من حمأ مسنون (الحجر)
انا خير منه خلقتني من نار وخلقته
من طين (اعراف) قال فاهبط منها فما
يكون لك ان تتكبر فيها، فاخرج منها
مذءوما مدحورا (اعراف) فانك
رجيم وان عليك اللعنة الى يوم الدين
(الحجر) انك من الصٰغرين قال انظرني
الى يوم يبعثون قال انك من المنظرين
(اعراف)

چھپاتے ہو اُس کو بھی جانتا ہوں۔ بیشک ہم نے تم کو
پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا
کہ آدم کو سجدہ کرو۔ جب میں اُس کو ٹھیک کر چکوں اور اُس میں
اپنی روح پھونک دوں، تو تم اُس کو سجدہ کرتے ہوئے
جُھک پڑو۔ پھر سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر شیطان نے
نہیں کیا۔ وہ سجدہ کرنیوالوں میں نہ تھا، وہ جنّ میں سے
تھا، پس نافرمانی کی اُس نے اپنے پروردگار کی سجدہ
کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کیا، اور تکبر کیا
اور وہ کافروں میں سے تھا۔ خدا نے کہا اے ابلیس کیوں
تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا، کس چیز نے تجھ کو
منع کیا کہ نہ سجدہ کرے اُس کو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے
بنایا تکبر کیا تو نے یا تو بڑوں میں ہے کس بات نے تجھ کو روکا
کہ میرے حکم کرنے پر بھی تو سجدہ نہ کرے۔ ابلیس نے کہا کہ کیا
میں ایسے کو سجدہ کروں جسے تو نے گارے سے پیدا کیا
ہے، میں ایسا نہیں ہوں کہ اُس آدمی کو سجدہ کروں جسے
تو نے سڑی مٹی سے بنایا ہے، میں اُس سے بہتر ہوں،
مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے، اور اُس کو تو نے
ریتلے گارے اور بدبو کیچڑ سے بنایا ہے۔ میں اُس سے
بہتر ہوں مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُس کو گارے سے۔ خدا نے
کہا دور ہو یہاں سے تجھ کو نہیں چاہیے تھا کہ یہاں تکبر کرتا یہاں سے ذلیل و خوار
ہو کر نکل۔ بیشک تو مردود ہے اور بیشک تجھ پر قیامت تک لعنت
رہیگی۔ بیشک تو ذلیلوں میں سے ہے ابلیس نے کہا کہ قیامت تک
[illegible] ہونے کی [illegible] کہ تجھ کو مہلت

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا	ہم نے اُن کو کہا اس میں سے تم سب اُترو،

بیان کرتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے بخوبی دونوں بیانوں کا مقابلہ کر سکیں ✦

اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں، ایک خدا، دوسرے فرشتے، (یعنی قوائے ملکوتی) تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم، (یعنی انسان جو مجموعہ اُن قواے کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں) مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان

بقیہ حاشیہ

الی یوم الوقت المعلوم قال رب بما اغویتنی لازین لهم فی الارض (الحجر) فبعزتک لاغوینهم اجمعین (ص) لاقعدن لهم صراطک المستقیم ثم لآتینهم من بین ایدیهم ومن خلفهم وعن ایمانهم وعن شمائلهم ولا تجد اکثرهم شاکرین (اعراف) قال ارایتک هذا الذی کرمت علی لئن اخرتن الی یوم القیمة لاحتنکن ذریته الا قلیلا (بنی اسرائیل) الا عبادک منهم المخلصین قال هذا صراط علی مستقیم (الحجر) قال فالحق والحق اقول (ص) لمن تبعک منهم لاملان جهنم (اعراف) منک وممن تبعک منهم اجمعین (ص) اذهب فمن تبعک منهم فان جهنم جزاؤکم جزاء موفورا واستفزز من استطعت منهم بصوتک واجلب علیهم بخیلک ورجلک وشارکهم فی الاموال والاولاد وعدهم وما یعدهم الشیطان الا غرورا (بنی اسرائیل) ان عبادی لیس لک علیهم سلطان الا من اتبعک من الغاوین (الحجر) وکفی

دیگئی وقت معین تک ابلیس نے کہا کہ اے پروردگار مجھ کو تیرے بہکانے ہی کی قسم کہ میں دنیا میں بُری باتوں کو اُنہیں اچھی کر دکھاؤنگا اور قسم ہے تیری عزت کی اُن سب کو بہکاؤنگا اور اُن کے لئے تیرے سیدھے رستہ کی راہ ماری کرنے کو گھات میں بیٹھونگا۔ پھر اُن کے آگے سے اور اُن کے پیچھے سے اور اُن کو داہنے سے اور اُن کے بائیں سے اُن پر آن پڑونگا اور تو اُن میں سے بہتوں کو شکر گذار نہ پاویگا، ابلیس نے کہا کہ مجھ سا کہ کیوں اُس شخص کو مجھ پر بزرگی دی ہے اگر تو نے مجھے قیامت تک کی مہلت دی تو اُس شخص کی اولاد کو بجز چند کی جڑ پیڑ سے اکھاڑ دونگا بجز تیرے خالص بندوں کے جو اُن میں ہوں خدا نے کہا کہ خالص بندہ ہونا ہی میرے تک پہنچنے کا سیدھا رستہ ہے خدا نے کہا کہ سچ بات یہ ہے اور سچ ہی کہتا ہوں جو لوگ اُن میں سے تیری پیروی کرینگے، بیشک بھر دونگا جہنم کو تجھ سے اور ان سب سے جنہوں نے اُن میں سے تیری پیروی کی جا پھر جو کوئی اُن میں سے تیری پیروی کریگا تو بیشک جہنم تمہاری سزا ہوگی پوری سزا، بہکا اُن میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے اور چڑھا اُن پر اپنے سوار و پیدل لیکر اور حصہ بانٹ لے اُن کے مال میں اور اولاد میں اور اُن سے وعدہ کر لے اور کوئی وعدہ اُن سے شیطان نہیں کرتے کا مگر دھوکے کے بے شک میرے بندوں پر تجھ کو کچھ غلبہ نہیں ہے بجز اُن گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی اور اسے پیغمبر تیرا خدا اُن کی کارسازی کے

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ	جب میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہنچے پھر جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے

کی فطرت کا بیان کرتا ہے، خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے، گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کر فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے کو ہوں، مگر وہی میرا نائب ہونے کے لائق ہے، جب میں اُس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اُس کو سجدہ کرنا، اس مقام پر

تفسیر

بربك وكلا (بنی اسرائیل)، وقلنا (بقر)
یا آدم اسکن انت وزوجك الجنة فکلا
(اعراف) منها رغدا (بقر) حیث شئتما و
لا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظلمین
(اعراف) فقلنا یا آدم ان هذا عدو لك
ولزوجك فلا یخرجنکما من الجنة
فتشقی ان لك الا تجوع فیها ولا تعری
وانك لا تظمؤ فیها ولا تضحی (طہ)
فوسوس لهما الشیطن لیبدی لهما
ما ووری عنهما من سواتهما (اعراف) قال
یا آدم هل ادلك علی شجرة الخلد وملك
لا یبلی (طہ)، وقال ما نهکما ربکما عن هذه
الشجرة الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخلدین
وقاسمهما انی لکما لمن النصحین فدلهما بغرور
فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سواتهما وطفقا
یخصفان علیهما من ورق الجنة (اعراف)
وناداهما ربهما الم انهکما عن تلکما الشجرة
واقل لکما ان الشیطن لکما عدو مبین (اعراف)
فازلهما الشیطن عنها فاخرجهما مما
کانا فیه وقلنا اهبطوا بعضکم لبعض
عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع
الی حین (بقر) قال فیها تحیون

لئے کافی ہے خدا نے کہا اے آدم تو اور تیرا جوڑا جنت میں رہو
اور کھاؤ اس میں سے پیٹ بھر کر جہاں سے تم چاہو اور
اس درخت کے پاس مت جاؤ، اگر جاؤ گے تو ظالموں میں سے
ہو گے۔ خدا نے کہا اے آدم یہ ابلیس بیشک تیرا اور
تیرے جوڑے کا دشمن ہے، پھر تم کو جنت سے نہ نکالدے
کہ تم بدبخت ہو جاؤ، یہاں تو تم نہ بھوکے ہو گے نہ
ننگے، نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ میں
جلو گے +

پھر وسوسے میں ڈالدیا اُن کو شیطان نے تاکہ جو پوشیدہ رہا ہے
اُن میں تھیں اُن کو ظاہر کرے۔ شیطان نے کہا اے
آدم کیا بتلادوں میں تجھ کو ہمیشہ رہنے کا درخت اور پرانی
نہ ہونے والی سلطنت، اور کہا کہ خدا نے تم کو بجز اس
کے اور کسی لئے اس درخت سے منع نہیں کیا، کہ تم فرشتے
ہو جاؤ گے یا ہمیشہ رہو گے، اور ان سے قسم کھا کر
کہا کہ بے شبہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں، پھر اُن کو دھوکے
میں ڈالدیا، پھر جب اُنہوں نے اُس درخت کو چکھا تو اُن دونو
کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور اُنہوں نے جنت کے درخت کے
پتوں سے اُن کو چھپانا شروع کیا خدا نے اُن دونوں کو للکارا
کہ کیا میں نے تم کو اس درخت کے کھانے سے منع نہیں کیا
تھا اور تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا علانیہ دشمن ہے پس اُن کو
شیطان نے اُس سے ڈگمگادیا اور جس میں تھے اُس میں سے
نکال دیا خدا نے کہا اترو تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو اور
تمہارے لئے ایک مدت تک زمین میں رہنا اور رہنے کی جگہ ہے اس میں تم جیو گے

اُن پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے (۳۶)	فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۶)

جب میں اُس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اُس کو سجدہ کرنا ، اِس مقام پر مخاطبین کو اس بات کا کہ اُس مخلوق میں قواے بہیمیہ ہونگے عالم قرار دیا گیا ہے - اور مقتضاے فطرت اُن قواے کے ، اُنھوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کریگا جو زمین پر فساد مچاوے ، اور خون بہا دے ، اور قواے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی ، کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں ✤

پچھلا فقرہ قواے کی فطرت کو بھی بتاتا ہے ، جو قواے جس کام کے لئے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں ، کہ وہی اُن کی تسبیح اور تقدیس ہے ، قوت نامیہ - اِنما ، اور قوت ناطقہ ، نطق ، قوت احراق ، حرق ، قوت سیالہ ، سیلان ، قوت جامدہ ، انجماد ، کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی ، انسان باوجودیکہ قواے متضادہ ملکوتیہ و بہیمیہ سے مرکب ہے ، مگر اُس میں ایسی قدرت ہے کہ ایک قوت پر دوسری قوت کو غلبہ دے سکتا ہے ، اور جس قوت سے چاہے کام لے سکتا ہے ، غیر معلوم چیزوں کو جان جاتا ہے ، عالم کے اجزا میں ترکیب دیکر ایک نئی چیز ایجاد کر لیتا ہے ، اور عالم کے تبدل میں ایک بڑی مداخلت رکھتا ہے ، اور بیشک خدا کا نائب کہلانے کا مستحق ہے ✤

انسان کی فطرت کا مخاطبین پر فطرتی تفوق ظاہر کرنے کو ، تمام کمالات نفسانی و روحانی

تفسیر [illegible] تفسیر		
	وفیہا تموتون ومنہا تخرجون (اعراف)	اُس میں مرو گے اُس میں سے اُٹھو گے نافرمانی کی آدم نے
	وعصیٰ آدم ربہ فغوی (طٰہٰ)	اپنے پروردگار کی اور بہک گیا - پھر آدم کے دل میں
	فتلقیٰ آدم من ربہ کلمات	ڈالیں اُس کے پروردگار نے چند باتیں پھر اُس کو خدا
	فتاب علیہ انہ ہو التواب الرحیم (بقر)	نے معاف کیا وہ بیشک بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے
	قال ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا	آدم اور اُس کی جورو نے کہا کہ اے پروردگار ہمارے ہم نے
	وترحمنا لنکونن من الخسرین (اعراف)	اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشیگا اور نہ مہربانی کریگا تو
	ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ	بیشک ہم نقصان والوں میں ہونگے - پھر اُس کے پروردگار نے
	وہدیٰ (طٰہٰ) قلنا اہبطوا	اُس کو پسند کیا اور اُس کو معاف کیا اور سیدھی راہ بتائی خدا نے
	منہا جمیعا فاما یأتینکم منی ہدی	کہا کہ تم سب یہاں سے دور ہو - پھر میرے پاس سے تمہارے
	فمن تبع ہدای فلا خوف علیہم ولا ہم	پاس ہدایت پہنچیگی - پھر جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کریگا
	یحزنون (بقر) فلا یضل ولا یشقیٰ (طٰہٰ)	تو اُس پر کچھ خوف نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہوگا اور نہ وہ بہکیگا اور نہ بدبخت ہوگا ✤

اور جن لوگوں نے نہ مانا اور میری نشانیوں کو جھٹلایا وہ آگ میں پڑنے والے لوگ ہیں وہ اُسی میں ہمیشہ رہینگے (۳۷)	وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۷)

وحقائق و معارف کو انسان کی فطرت میں ودیعت کرکر، جس کو تعلیم اسماء سے تعبیر کیا ہے، انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا، کہ جو حقائق و معارف ان میں ہیں اُن کو بتاؤ، قوائے بہیمیہ کی فطرت میں اُس کا علم نہ تھا، بس گویا وہ بولے کہ ہم تو اُن کمالات کو نہیں جانتے، ہم تو اُتنا ہی جانتے ہیں، جتنا تو نے بتایا ہے، یعنی جس محدود فطرت پر پیدا کیا ہے اُس کے سوا کچھ نہیں کرسکتے، مگر انسان کی زبان حال نے جس کی فطرت میں ادراک کلیات وجزئیات تھا، مخاطبین کی حقیقت کو بتا دیا، اور گویا مخاطبین نے زک پائی، اب خدا اپنی قدرت و کمال کے اظہار کے لئے انسانی محاورہ کے موافق جیسے کہ انسان کسی کو زک دیکر دُہراتا ہے فرماتا ہے، کہ کیوں میں نہ کہتا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے *

اس کے بعد خدا تعالےٰ نے اُن قوائے متضادہ کی جن سے انسان مرکب ہے اس طرح پر فطرت بتائی ہے، کہ قوائے ملکوتی اطاعت پذیر و فرمانبردار رہنے کی قابلیت رکھتے ہیں، اِلّا قوائے بہیمیہ نہایت سرکش اور نافرمانبردار ہیں، اُنہی کو قابو میں لانا اور فرمانبردار کرنا انسان کا انسان ہونا ہے *

اُن کے سرکش ہونے کو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا ہے کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا، کہیں یوں فرمایا ہے کہ اُس نے اپنے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا، کہیں فرمایا ہے کہ اُس کافر نے غرور کیا اور کہا کہ کیا میں ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جو سڑی مٹی سے بنی ہے میں تو اُس سے افضل ہوں وہ تو مٹی کا پُتلا ہے، اور میں آگ کا پوت ہوں۔ قوائے بہیمیہ کو جن کا مبدا حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے آگ سے مخلوق ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک اُن کی فطرت کا بتلانا ہے، پھر جو فطرتی تضاد اُن دو قسم کے قوائے میں ہے، اُس کے اظہار کے لئے قوائے بہیمیہ کو بطور ایک سخت دشمن کے قرار دیا ہے، اور اُس کی زبان حال سے اُس کی فطرت بیان کی ہے، کہ میں ہمیشہ جب تک انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک اُس کی اولاد رہیگی، اُس کو بہکاتا اور راہ راست پر سے بھٹکاتا رہونگا۔ یہ الفاظ کہ میں انسان کو دائیں بائیں آگے پیچھے غرضکہ ہر چہار طرف سے گھیرونگا، صاف صاف اُن قوائے بہیمیہ کی فطرت کا اظہار کرتے ہیں جو انسان میں ہے، اور ہر ذی عقل و ہوش غور کرنے پر خود اپنے میں یہ سب باتیں پاتا ہے، اور جان سکتا ہے کہ کس طرح اُن قوائے بہیمیہ نے

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ	اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کو یاد کرو جو مَیں نے تم کو بخشی ہیں اور مجھ سے اقرار پورا کرو مَیں تم سے اقرار پورا کرونگا اور پھر مجھی سے ڈرو۔

چاروں طرف سے اُن کو گھیر رکھا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
بازمیگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پھر خدا تعالےٰ نیک آدمیوں کی خطرت کو، اور اُس دشمن کے فریب میں آنے والوں، اور نہ آنے والوں کے فطری نتیجہ کو بتایا ہے، اور فرماتا ہے کہ تو جتنی چاہے دشمنی کر، اور جس طرح چاہے اپنے لشکر سے اُن پر چڑھائی کر، مگر نیک آدمیوں پر تیرا کچھ قابو نہ ہوگا، وہی بھٹکینگے جو تیرے یعنی قوائے بہیمیہ کے تابع ہونے والے ہیں، اور دونو کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ پہلے بہشت میں چین کرینگے اور پچھلے دوزخ میں بھرے جاوینگے ؛

اس کے بعد خدا تعالےٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصّوں کو بتایا ہے پہلے حصہ کو یعنی جب کہ انسان غیر مکلف اور تمام قیود سے مبّرا ہوتا ہے بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میووں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے، اور جب دوسرا حصّہ اُس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے، تو اُس کے قدیم دشمن کو پھر بُلایا ہے، جس نے اُس کو بہکا کر درخت ممنوعہ کو کھلایا ہے ؛

یہ وہ حصّہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ اُس کو رشد ہوتا ہے، اور عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھاکر مکلف اور اپنے تمام افعال و اقوال و حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے، زندگی کے ضروری سامان کے لئے خود محنت کرتا ہے، اور نیک و بد کو خود سمجھتا ہے، اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے، اور اس کو چھپاتا ہے۔ یہ فطرت انسانی خدا تعالےٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے اس لئے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے، سن رشد و تمیز کے پہنچنے کو درخت، معرفت خیر و شر کے پھل کھانے سے، اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈھانکنے سے، تعبیر کیا ہے، مگر شجرۃ الخلد کے پھل تک اُس کو نہیں پہنچایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اُس کو دائمی بقا نہیں ؛

اخیر کو نہایت عمدگی سے اُس کا خاتمہ بیان کیا ہے، کہ تم سب نکل جاؤ۔ اور جاکر زمین پر رہو، وہی تمہارے ٹھیرنے کی جگہ ہے، اُس میں تم رہوگے، اُس میں مروگے، اُس میں سے

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۳۸﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾	اور اُس پر ایمان لاؤ جو مَیں نے اُس کو تصدیق کرتا ہُوا نازل کیا ہے جو تمہارے پاس ہے اور اُس کے اول منکروں میں نہ ہو اور مت لو میری نشانیوں پر تھوڑی سی قیمت اور میرا ہی ڈر رکھو ﴿۳۸﴾ اور مت شبہ ڈالو سچ میں جھوٹ ملا کر اور مت چھپاؤ سچ کو جب کہ تم جانتے ہو ﴿۳۹﴾

اُٹھو گے، تمہاری بدیوں کا علاج بھی وہی ہے، جو نیک بندے ہوں اُن کی ہدایت پر چلنا اور اپنی بدیوں سے شرمندہ ہو کر اُن کے کرنے سے باز آنا، اور خدا سے پکا اقرار کرنا کہ پھر نہ کرینگے، اور پھر مت کرنا، تم اپنے دشمن پر فتح پاؤ گے، پھر تم کو کچھ ڈر اور خوف نہ ہوگا، اچھے خاص مقبول بندے ہو گے +

یہ ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ بیان فطرت انسانی کا ہے، مگر عام لوگ اس راز فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے، اس لئے خدا نے ابتدا سے اس راز کو ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے، جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے، اور جو نتیجہ، راز فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہئے، وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے، خواہ تم یہ سمجھو کہ خدا و فرشتوں میں مباحثہ ہوا، اور شیطان نے خدا سے نافرمانی کی، اور آدم بھی گیہوں کا درخت کھا کر خدا کا نافرمانبردار ہوا، خواہ میں یوں سمجھوں کہ اُس بڑے تماشا کرنے والے نے جو بھانمتی کا ایک تماشا بنایا ہے۔ اُس کے راز کو اُسی بھانمت کی اصطلاحوں میں بتایا ہے +

(یعنی اسرائیل) اس مقام پر خدا تعالےٰ نے بنی اسرائیل کا قصہ بیان کیا ہے اور اُن کی نافرمانی کو دُہرایا ہے، اور جو مہربانیاں اُن پر کیں اُن کو یاد دلایا ہے تاکہ اُس رحمت کو جو نبی آخر الزمان کے پیدا کرنے اور قرآن کے نازل ہونے سے دنیا پر ہے اُس کی قدر کریں اور اُس کی ہدایت پر چلیں، اور جو خرابیاں انہوں نے اپنے سچے مذہب میں ملا دی تھیں اُن کو چھوڑ دیں اور نجات پاویں +

بنی اسرائیل کا قصہ قرآن میں بہت جگہ مذکور ہے، مگر اکثر لوگوں کو اس میں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ تمام واقعات کا حضرت موسےٰ ہی کے وقت میں ہونا سمجھتے ہیں، حالانکہ اُن میں ایسے بھی واقعات ہیں جو حضرت موسیٰ سے پہلے اور اُن کے بعد میں ہوئے ہیں +

حضرت موسیٰ سے جو واقعات متعلق ہیں وہ سورۂ بقر، نساء، مائدہ، انعام،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۰﴾

نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو ﴿۴۰﴾

اعراف، یونس، ھود، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، مؤمنین، شعرا، نمل، قصص، صافات، مؤمن، زخرف، دخان، نازعات، بیس سورتوں میں آئے ہیں اُن میں مکرر بھی مضامین بیان ہوئے ہیں اور کسی میں کسی جگہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کسی میں کسی جگہ کا ہم اُن تمام آیات اور الفاظ کو منتخب کر کر بہ ترتیب موسیٰ کے قصہ کو مع ترجمہ حاشیہ پر لکھ دیتے ہیں کہ تمام قصہ جس قدر قرآن مجید میں ہے بلفظہ بہ ترتیب معلوم

ـــ ۱؎ نتلو علیك من نبإ موسیٰ وفرعون بالحق لقوم یؤمنون ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفة منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم انه کان من المفسدین (قصص) یسومونکم (آل فرعون) سوء العذاب (بقر) یقتلون (اعراف) یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم (بقر) ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمة ونجعلھم الوارثین ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون (قصص) ✦

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه فاذا خفت علیه (قصص) اقذفیه فی التابوت (طه) فالقیه (قصص) فاقذفیه فی الیم فلیلقه الیم بالساحل یاخذه عدو لی وعدو له (طه) ولا تخافی ولا تحزنی انا رادوه الیك وجاعلوه من المرسلین فالتقطه آل فرعون (قصص) فصرف

ہم ٹھیک ٹھیک تجھ کو سنا دیں ایمان والوں کے لئے موسیٰ و فرعون کی کچھ خبریں، فرعون دنیا میں بہت بڑھ گیا تھا اور مصر کے رہنے والوں کو گروہ گروہ بنا دیا تھا اور اُن میں سے ایک گروہ کو بیاوں حالت میں پہنچا دیا تھا، ذبح کر ڈالتا تھا اُن کے بیٹوں کو اور جیتا رہنے دیتا تھا اُن کی بیٹیوں کو اور وہ مفسدوں میں سے تھا، فرعون والے بنی اسرائیل کو بُری طرح کے عذاب پہنچاتے تھے، بنی اسرائیل کے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے، ذبح کر ڈالتے تھے، اور اُن کی بیٹیوں کو جیتا رہنے دیتے تھے اور اس میں بنی اسرائیل پر اُن کے پروردگار کی طرف سے بڑی بلا تھی، ہم نے اُن پر جو دنیا میں کمزور ہو گئے تھے مہربانی کرنی چاہی اور اُن کو سردار بنانا اور اُن کو وارث بنانا اور زمین پر قدرت والا ٹھہرایا اور فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکروں کو جس بات پر وہ ڈرتے تھے اُن کے ہاتھ سے دکھلانا چاہا ✦

ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ کو دودھ پلاتی رہ جب اُس کو موسیٰ کے مارے جانے کا خوف ہو تو اس کو ایک صندوق میں رکھ دے پھر اُس کو ڈال دے پھینک دے دریا میں پھر دریا اُس کو کنارہ پر ڈال دیگا اُس کو اُٹھا لیگا میرا دشمن اور اُس کا دشمن اور تو مت ڈر اور نہ غمگین ہو ہم اُس کو پھر تیرے پاس لوٹا دینگے، اور اس کو رسولوں میں سے کرینگے (جب موسیٰ کی ماں نے اُن کو دریا میں ڈال دیا اور وہ صندوق کنارہ پر

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۴۱﴾

کیا لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو۔ اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور تم کتاب (توریت) پڑھتے ہو پھر کیا تم سمجھتے نہیں ﴿۴۱﴾

ہوجاوے اور پھر ہر ایک آیت کے مطلب کو اُس کے مناسب مقام پر بیان کرینگے ✦

سورۂ بقر میں اس مقام پر جو واقعات حضرت موسیٰ ع کے بیان ہوئے ہیں، اُن میں سے واقعہ عبور بحر اور غرق فرعون قابل غور کے ہے اوّل تو بہت لوگوں نے یہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھے ہیں کہ حضرت موسیٰ ع نے دریائے نیل سے عبور کیا تھا یہ بالکل غلط ہے، بلکہ انہوں نے بحر احمر کی ایک شاخ سے عبور کیا تھا۔ تمام مفسرین حضرت موسیٰ کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے ہیں جو خلاف قانون قدرت واقع ہوا ہو جس کو انگریزی میں، سپر نیچرل،

راى اخت موسى) به عن جنب وهم لا يشعرون (قصص) ✦

قالت امرأة فرعون قرة عين لى ولك لا تقتلوه عسى ان ينفعنا او نتخذه ولدا (قصص) وحرمنا عليه المراضع من قبل فقالت هل ادلكم على اهل بيت يكفلونه لكم وهم له ناصحون فرددنه الى امه كى تقر عينها ولا تحزن (قصص) ✦

ولما بلغ اشده واستوى (قصص) دخل المدينة على حين غفلة من اهلها فوجد فيها رجلين يقتتلان هذا من شيعته وهذا من عدوه فاستغاثه الذى من شيعته على الذى من عدوه فوكزه موسى فقضى عليه (قصص) فاصبح فى المدينة خائفا يترقب فاذا الذى استنصره بالامس يستصرخه قال له موسى

آنکلا) تو فرعون کے لوگوں میں سے کسی نے اُس کو اُٹھا لیا۔ موسیٰ کی بہن نے دُور سے اُس کو دیکھا اور فرعون والے نہیں جانتے تھے ✦

فرعون کی عورت بولی کہ یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اُس کو مت مارو۔ شاید اس سے ہم کو نفع ہو اور ہم اُس کو بیٹا بنالیں۔ ہم نے پہلے ہی دائیوں کا دودھ اُس پر حرام کر دیا تھا موسیٰ کی بہن بولی کہ کیا میں تمکو ایسی گھروالی بتادوں جو تمہارے لئے اُس کو پالیں اور اُس کو اچھی طرح رکھیں (اُس نے موسیٰ کی ماں ہی کو بتایا) پھر ہم نے موسیٰ کو اُس کی ماں ہی کے پاس لوٹا دیا تاکہ اُس کی آنکھوں کو ٹھنڈک رہے اور غمگین نہ ہو ✦

جب موسیٰ چالاک چوبند ہوا تو شہر والوں کی بے خبری میں شہر میں گیا وہاں اُس نے دو آدمیوں کو مارتے مرتے پایا ایک تو موسیٰ کی قوم کا تھا اور ایک اس کے دشمنوں میں تھا موسیٰ کی قوم والے نے اُس کے دشمن کی فریاد کی موسیٰ نے اُسکو ایک گھونسا مارا، کہ وہ مرگیا، پھر شہر ہی میں ڈرتے ہوئے اور کسی خرابی کے آنے کی توقع میں صبح کی جس کی مدد موسیٰ نے کل کی تھی، اُس نے موسیٰ کو پکارا، موسیٰ نے اُسے کہا کہ تو ہی علانیہ جھگڑالو ہے، پھر موسیٰ نے اُس کی جو اُس کا

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۴۲﴾

اور صبر کرنے سے اور نماز پڑھنے سے مدد لو اور وہاں بے شبہ وہ بڑی (مشکل) ہے مگر ان پر (کچھ مشکل نہیں جو خدا کے سامنے) عاجزی کرتے ہیں ﴿۴۲﴾

کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری وہ پھٹ گیا، اور پانی مثل دیوار یا پہاڑ کے اِدھر اُدھر کھڑا ہو گیا، اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا، اور حضرت موسیٰ اور تمام بنی اسرائیل اُس رستہ سے پار اُتر گئے، فرعون بھی اُسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب ڈوب گئے، اگر در حقیقت یہ واقعہ خلاف قانون قدرت واقع ہوا تھا، تو خدا تعالیٰ نے سمندر کے پانی

حاشیہ:

انک لغوی مبین فلما ان اراد ان
یبطش بالذی ھو عدو لھما
قال یا موسیٰ اترید ان تقتلنی
کما قتلت نفسا بالامس (قصص)
وجاء رجل من اقصی المدینۃ
یسعیٰ قال یا موسیٰ ان الملاء
یأتمرون بک لیقتلوک فاخرج
انی لک من الناصحین فخرج
منھا خائفا یترقب قال رب
نجنی من القوم الظالمین (قصص)
قال موسیٰ لفتاہ لا ابرح حتی ابلغ
مجمع البحرین او امضی حقبا
فلما بلغا مجمع بینھما نسیا حوتھما
فاتخذ سبیلہ فی البحر
سربا فلما جاوزا قال
لفتاہ اتنا غداءنا لقد
لقینا من سفرنا ھذا نصبا
قال ارایت اذ اوینا الی
الصخرۃ فانی نسیت الحوت
وما انسانیہ الا الشیطن

اور موسیٰ کا بھی دشمن تھا پکڑنے کا ارادہ کیا (جو چاہتا تھا وہ یہ سمجھا کہ موسیٰ مجھی کو پکڑے گا) کہا اے موسیٰ کیا تو میرے مار ڈالنے کا بھی ارادہ کرتا ہے جس طرح کہ کل تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے، اسے میں ایک آدمی شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا آیا، کہا اے موسیٰ فرعون کے درباری تیری نسبت مشورہ کرتے ہیں کہ تجھ کو مار ڈالیں بس یہاں سے نکل جا میں تیرا خیر خواہ ہوں، پھر موسیٰ ڈرتا ہوا اور کسی آفت کی توقع کرتا ہوا وہاں سے نکلا اور کہا اے پروردگار اس ظالم قوم سے مجھے بچا۔ موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے (حالانکہ اُسی شخص نے جس نے اُس کو قتل کے مشورہ کی خبر دی تھی) کہا کہ میں پھر نہ سکوں گا جب تک میں دو دریاؤں کے ملنے کے مقام تک پہنچ جاؤں یا چلا جاؤں گا بہت دنوں تک (یعنی اُس سے بھی پرے) پھر جب دونوں دو دریاؤں کے ملنے کے مقام تک پہنچے تو اپنی مچھلی وہاں رکھ کر بھول گئے۔ پھر مچھلی نے خشک جگہ میں سے دریا کا رستہ لیا پھر جب وہ اُس سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ ہمارا صبح کا کھانا لاؤ ہم نے تو اپنے اس سفر میں بڑی مصیبت اُٹھائی اُس جوان نے کہا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم اُس پتھر سے تکیہ لگا کر بیٹھے تو میں اُس مچھلی کو بھول گیا (یعنی اُس کا خیال نہ رہا) اور اُس قصہ کا ذکر کرنا (یعنی موسیٰ سے) بجز شیطان کے کسی نے مجھ کو نہیں بھلایا

وہ وہ لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ ضرور اپنے پروردگار سے ملینگے اور ضرور وہ اُس کے پاس پھر جاوینگے (۴۳)	اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (۴۳)

ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ مثل زمین کے اُس پر سے چلے جاتے، خشک رستہ نکلنے ہی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اُس کو تعبیر کرد مطابق قانون قدرت کے واقع ہوا تھا،

ان اذکرہ واتخذ سبیلہ
فی البحر عجبا قال ذلک ما
کنا نبغ فارتدا علی آثارھما
قصصا فوجدا عبدا من
عبادنا آتیناہ رحمۃ من عندنا
وعلمناہ من لدنا علما قال
لہ موسی ھل اتبعک علی ان
تعلمن مما علمت رشدا
قال انک لن تستطیع معی صبرا
وکیف تصبر علی ما لم تحط بہ
خبرا قال ستجدنی ان شاء اللہ
صابرا ولا اعصی لک امرا
قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن
شیء حتی احدث لک منہ ذکرا
فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینۃ
خرقھا قال اخرقتھا لتغرق اھلھا
لقد جئت شیئا امرا قال الم
اقل انک لن تستطیع معی صبرا
قال لا تؤاخذنی بما نسیت ولا
ترھقنی من امری عسرا فانطلقا
حتی اذا لقیا غلاما فقتلہ قال اقتلت
نفسا زکیۃ بغیر نفس لقد جئت

اور مچھلی نے عجب طرح سے دریا میں اپنا رستہ لیا موسیٰ نے کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے (یعنی دونوں دریاؤں کے ملنے ہی تک ہم آنا چاہتے تھے اب آگے کیوں جاویں) پھر وہ دونوں اپنے قدموں کا نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے پھرے۔ پھر اُن دونوں کو میرے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس پر میں نے اپنی مہربانی کی تھی اور اُس کو میں نے دانشمندی سکھا دی تھی۔ موسے نے اُس سے کہا کہ کیا میں تمہارے ساتھ ہو لوں اگر مجھ کو بھی اُن دانشمندیوں میں سے جو تم نے سیکھی ہیں سکھلا دو اُس بندے نے کہا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور تم کس طرح اس بات پر صبر کر و گے جو تمہارے دانش کے احاطہ میں نہیں ہے موسے نے کہا انشاء اللہ تم مجھ کو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں تمہارے کسی کام میں نافرمانی نہ کرونگا اُس بندے نے کہا کہ اگر تم میری تابعداری کرنی چاہتے ہو تو جب تک میں خود ہی نہ کہوں مجھ سے کسی بات کو مت پوچھنا پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک کشتی پر سوار ہوئے تو اُس بندے نے کشتی میں شگاف کر دیا موسیٰ نے کہا کہ کیا تم نے کشتی کے لوگوں کے ڈبونے کے لئے اس میں شگاف کیا ہے اُس بندے نے کہا کہ دیکھو تم نے یہ بری بات کی اُس بندے نے کہا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ جو میں بھول گیا اُس پر مواخذہ مت کرو اور میرے کام میں سختی مت ڈالو پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملے تو اُس بندے نے اُس لڑکے کو مار ڈالا موسے نے کہا

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾	اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تم کو دی ہیں اور میں نے تم کو تمام عالموں پر بزرگی دی ہے ﴿۴۷﴾

جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا ✦

سمندر میں راستہ ہو جانے کی نسبت قرآن مجید میں تین جگہ ذکر آیا ہے اول سورۂ بقر میں جہاں فرمایا ہے کہ "اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ" دوم۔ سورۂ شعرا میں جہاں فرمایا کہ "اَوْحَيْنَآ اِلٰى

بقیہ حاشیہ

شيئا نكرا قال الم اقل لك انك
لن تستطيع معي صبرا قال ان سألتك
عن شيء بعدها فلا تصاحبني قد
بلغت من لدني عذرا فانطلقا حتى اذا
اتيا اهل قرية استطعما اهلها
فابوا ان يضيفوهما فوجدا فيها جدارا
يريد ان ينقض فاقامه قال لو شئت
لتخذت عليه اجرا قال هذا فراق
بيني وبينك سانبئك بتاويل ما لم
تستطع عليه صبرا اما السفينة فكانت
لمساكين يعملون في البحر فاردت ان
اعيبها وكان وراءهم ملك ياخذ
كل سفينة غصبا واما الغلام فكان
ابواه مومنين فخشينا ان يرهقهما
طغيانا وكفرا فاردنا ان يبدلهما
ربهما خيرا منه زكوة واقرب رحما
واما الجدار فكان لغلامين يتيمين
في المدينة وكان تحته كنز لهما وكان
ابوهما صالحا فاراد ربك ان يبلغا
اشدهما ويستخرجا كنزهما رحمة من ربك
وما فعلته عن امري ذلك تاويل

کہ کیا تم نے ایک شخص بے گناہ کو بغیر جان کے بدلے مار ڈالا۔ دیکھو تم نے برا کام کیا۔ اُس بندے نے کہا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکوگے، موسیٰ نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو پھر مجھ کو اپنے ساتھ مت رکھنا میں اپنا عذر تمہارے سامنے پیش کر چکا ہوں پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں کے لوگوں کے پاس پہنچے تو ان سے کھانا مانگا اُنھوں نے ان کو کھانا کھلانے سے انکار کیا وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی کہ گرا پڑا چاہتی ہے اُن دونوں نے اُس کو سیدھا سا دیا حضرت موسیٰ کو بھوک لگی ہوئی تھی کسی نے کھانے کو دیا نہ تھا، ٹکا پیسا پاس نہ تھا، اُنھوں نے اُس بندے سے کہا کہ اگر تم چاہتے تو اس پر مزدوری لے لیتے، اُس بندے نے کہا کہ بس اب مجھ میں اور تجھ میں جدائی ہے میں اُن باتوں کی تاویل جن پر تم صبر نہ کر سکے بتا دیتا ہوں۔ وہ کشتی تو غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں کھیوا کھیا کرتے تھے میں نے اُس کو عیب دار کر دینا چاہا اُن کے پرے ایک بادشاہ ہے جو زبردستی سے ہر ایک کشتی کو پکڑ لیتا ہے اور وہ نوجوان اُس کے ماں باپ مسلمان تھے پس مجھ کو خوف ہوا کہ یہ اُن کو سرکشی و کفر میں تنگ کریگا، پس میں نے چاہا کہ اُن کا پروردگار اس کا نعم البدل پاکیزگی اور محبت میں اُن کو دیگا۔ اور وہ دیوار شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے اُن کے لئے خزانہ تھا اور اُن کا باپ اچھا آدمی تھا پس میرے پروردگار نے چاہا کہ جب وہ دونوں جوانی میں بھرپور ہوں وہ اپنا خزانہ نکال لیں میرے پروردگار کی مہربانی سے اور میں نے کام اپنی طرف سے نہیں کئے

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور ڈرو اُس دن سے جب کہ کوئی کچھ بھی کسی کے کام نہ آویگا اور اُس کے لئے کوئی سفارش قبول نہ ہوگی اور نہ کچھ اُس کے بدلے میں لیا جاویگا اور نہ اُس کی مدد کی جائیگی ﴿۴۵﴾

مُوْسٰی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ" تیسرے سورہ طٰہٰ میں جہاں فرمایا ہے کہ "فَاَوْحَيْنَا اِلٰی مُوْسٰی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ" پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے سمندر کے جدا ہو جانے یا

بقیہ حاشیہ

ما لم تستطع عليه صبرا (كهف) ✦
ولما توجه تلقاء مدين قال عسى
ربي ان يهديني سواء السبيل ولما
ورد ماء مدين وجد عليه امة من
الناس يسقون ووجد من دونهم
امرأتين تذودان قال ما خطبكما
قالتا لا نسقي حتى يصدر الرعاء و
ابونا شيخ كبير فسقى لهما ثم تولى
الى الظل فقال رب اني لما انزلت الي
من خير فقير فجاءته احداهما تمشي
على استحياء قالت ان ابي يدعوك
ليجزيك اجر ما سقيت لنا فلما جاءه
وقص عليه القصص قال لا تخف نجوت
من القوم الظلمين قالت احداهما
يا ابت استأجره ان خير من استأجرت
القوي الامين قال اني اريد ان انكحك
احدى ابنتي هاتين على ان تأجرني ثماني
حجج فان اتممت عشرا فمن عندك وما
اريد ان اشق عليك ستجدني ان

یہ بیان اُن باتوں کا ہے جن پر تو صبر نہ کر سکا ✦
اور جب موسیٰ شہر مدین کی طرف چلے تو کہا کہ امید ہے کہ میرا پروردگار
مجھ کو سیدھا رستہ بتا دے اور جبکہ شہر مدین کے پانی کے پاس پہنچے
تو وہاں لوگوں کے گروہ کو (مویشی کو) پانی پلاتے پایا اور اُس کے پرے
دو عورتوں کو پایا کہ اپنے مویشی کو روکے کھڑی ہیں موسیٰ نے کہا
کہ تمہارا کیا حال ہے اُنہوں نے کہا کہ جب تک چرواہے پانی پلا کر
نہ لیجاویں ہم نہیں پلا سکتیں اور ہمارا باپ نرا بڈھا ہے پھر موسیٰ
نے اُن دونوں کی مویشی کو پانی پلا دیا پھر چھاؤں میں جا کھڑے
ہوئے پھر کہا کہ اے میرے پروردگار تو نے میری ایسی حالت کر دی ہے
کہ تھوڑی سی بھلائی کا بھی محتاج ہوں پھر اُن دونوں میں سے ایک شرمیلی
چلی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی کہا میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے تاکہ ہمارے
(مویشی کو) جو پانی تو نے پلایا ہے اُس کی اجرت دے پھر جب موسیٰ
اُس کے پاس (یعنی اُس عورت کے باپ کے پاس) آئے اور اپنا قصہ اُس سے
کہا تو اُس نے کہا کہ مت ڈر تو نے ظالم قوم سے نجات پائی اُس کی
بیٹیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اس کو مزدوری پر رکھ لے اچھا مزدور
جس کو مزدوری پر لگاوے طاقتور اور دیانتدار ہونا چاہئے اُس
شخص نے موسیٰ سے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے
ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں اس پر کہ تو آٹھ برس تک میرے ہاں مزدوری کرے
پھر اگر تو دس برس پورے کر دے تو یہ تیری طرف سے ہے اور میں تجھ پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ	اور اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جبکہ ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچایا برے عذاب تم کو دیتے تھے،

پھٹ جانے کو خلاف قانون قدرت قرار دیا جا سکے۔ دوسری آیت میں جو الفاظ ہیں انہی پر تمام مفسرین کا دار و مدار ہے وہ "أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ" کے یہ معنی لیتے ہیں کہ خدا نے موسیٰ سے

بقیہ حاشیہ

إن شاء الله من الصالحين قال ذلك بيني
وبينك أيما الأجلين قضيت فلا عدوان
علي والله على ما نقول وكيل (قصص)
فلبثت سنين في أهل مدين ثم جئت
على قدر يا موسى (طه)
فلما قضى موسى الأجل وسار بأهله
آنس من جانب الطور نارا قال لأهله امكثوا
إني آنست نارا لعلي آتيكم منها بخبر (قصص)
أو آتيكم بشهاب قبس (نمل) أو جذوة
من النار لعلكم تصطلون (قصص) أو أجد
على النار هدى (طه) فلما أتاها نودي من
شاطئ الوادي الأيمن (قصص) من جانب
الطور الأيمن (مريم) في البقعة المباركة
من الشجرة (قصص) أن بورك من في النار
ومن حولها وسبحان الله رب العالمين يا موسى
إنه أنا الله العزيز الحكيم (نمل) إني أنا الله
رب العالمين (قصص) إني أنا ربك فاخلع
نعليك إنك بالواد المقدس طوى (طه)
وما تلك بيمينك يا موسى قال هي عصاي
أتوكأ عليها وأهش بها على غنمي ولي فيها
مآرب أخرى (طه) ألق عصاك فلما رآها
تهتز كأنها جان ولى مدبرا ولم يعقب
يا موسى أقبل (قصص) خذها ولا تخف

تو مجھ کو انشاء اللہ قرار پورا کرنیوالوں میں پاویگا موسیٰ نے کہا کہ مجھ میں
اور تجھ میں یہ اقرار ہو چکا ان دو میعادوں میں سے جونسی میں پوری
کرلوں تو پھر مجھ پر زیادتی نہ ہو اور جو میں کہتا ہوں خدا اس پر گواہ
ہے۔ پھر موسیٰ اہل مدین میں چند سال رہا پھر بولے موسیٰ
وقت پر آگیا +
پھر جب موسیٰ نے میعاد مقررہ پوری کی اور اپنی بی بی کو لیکر چلا تو اسکو پہاڑ کی
طرف سے آگ معلوم ہوئی موسیٰ نے اپنی بی بی سے کہا ٹھیرو مجھے آگ معلوم ہوتی ہے شاید
میں اس میں سے کچھ خبر لے آؤں یا ایک شعلہ کی ہوئی لکڑی اٹھا لاؤں یا آگ کا انگارہ لاؤں
تاکہ تم تاپو یا آگ کے پاس کوئی راہ بتانیوالا پاؤں۔ پھر جب
موسیٰ آگ کے پاس آیا تو جنگل کے دائیں کنارے سے پہاڑ کی
دائیں طرف سے اس مبارک جگہ میں درخت میں سے کسی نے
اس کو آواز دی کہ جو آگ میں ہے اور اس کے گرد ہے اس کو
برکت دی گئی ہے، اور اللہ پاک ہے اور تمام عالموں کا پالنے
والا ہے۔ اے موسیٰ بیشک میں ہی خدا ہوں سب پر
غالب اور بڑی حکمت والا بیشک میں ہی خدا ہوں
تمام عالموں کا پالنے والا بیشک میں تیرا خدا ہوں، پھر
جوتیاں اتار ڈال بیشک تو پاک جنگل میں پھر رہا ہے
اے موسیٰ یہ کیا تیرے داہنے ہاتھ میں ہے موسیٰ نے کہا کہ
یہ میری لاٹھی ہے اس کو میں ٹیک لیتا ہوں اور اس سے
اپنے ریوڑ پر پتے جھاڑ لیتا ہوں اور وہ میرے اور کام میں بھی آتی
ہے خدا نے کہا کہ اپنی لاٹھی ڈالدے (خدا نے ڈالدی) تو لاٹھی کو ہلتے ہوئے دیکھا
گویا کہ وہ سانپ ہے تو موسیٰ پیٹھ پھیر کر پلٹا اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا خدا نے کہا
اے موسیٰ آگے بڑھ اس کو پکڑ لے اور مت ڈر وہ جیسی پہلی

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اُس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے بلائے عظیم تھی ﴿۴۹﴾

کہا کہ سمندر کو اپنی لاٹھی سے مار چنانچہ حضرت موسٰے نے لاٹھی ماری اور سمندر ہٹ گیا یا پھٹ گیا۔ یا سمندر کی تہ زمین کھُل گئی۔ وہ اس جملہ کو اس طرح پر بطور شرط و جزا کے قرار دیتے ہیں کہ شرط

سنعیدها سیرتها الاولی (طٰہٰ) اسلك يدك فی جيبك (قصص) واضمم يدك الی جناحك تخرج بيضاء من غير سوٓء اية اخری (طٰہٰ) واضمم اليك جناحك من الرهب فذانك برهانان من ربك (قصص) فی تسع ايات (نمل) الی فرعون وملائه انهم كانوا قوما فاسقين (قصص) وقربناه نجيا (مریم) +

ثم ارسلنا موسٰی واخاه هارون باياتنا وسلطان مبين الی فرعون وملائه (مؤ) هامان وقارون (مومن) ان اخرج قومك من الظلمٰت الی النور (ہود) ان ائت القوم الظٰلمين قوم فرعون (شعرا) اذهب الی فرعون انه طغٰی (نازعات) قال رب انی اخاف ان يكذبون (شعرا) رب انی قتلت منهم نفسا (قصص) ولهم علی ذنب فاخاف ان يقتلون (شعرا) ويضيق صدری ولا ينطلق لسانی (شعرا) رب اشرح لی صدری ويسر لی امری واحلل عقدة من لسانی يفقهوا قولی (طٰہٰ) واخی هارون هو افصح منی لسانا (قصص) اجعل لی وزيرا من اهلی هارون اخی (طٰہٰ) فارسل الی هارون (شعرا) فارسله معی ردا (قصص)

بھی ویسی ہی ہو جاویگی، ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو سے ملا دے تیرا ہاتھ بے عیب سفید نکلیگا۔ بطور ایک دوسری نشانی کے جو ڈر تجھ کو ہوا ہے اس سے اپنے کو دونوں بازو ملا کر تھام، پھر یہ دونوں نشانیاں ہیں تیرے پروردگار کی نو نشانیوں میں کی، فرعون اور اُس کے درباریوں کے لئے، بیشک وہ بدکار قوم ہے، اور ہم نے موسٰے کو باتیں کرنے سے مقرب کیا +

پھر ہم نے موسٰی کو اور اُس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور علانیہ غلبہ کے ساتھ فرعون اور اُس کے درباریوں ہامان اور قارون کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے میں سے روشنی میں نکال لاوے، جا ظالم قوم کے پاس جو فرعون کی قوم ہے جا فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہے موسٰی نے کہا کہ اے پروردگار میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلاویںگے اے پروردگار میں نے اُن میں کا ایک آدمی مار ڈالا ہے میں نے اُن کا قصور کیا ہے، پھر میں ڈرتا ہوں کہ وہ مار ڈالینگے، میرے سینہ میں دم گھُٹ جاتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی، اے پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرا کام مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے میرے کنبہ میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کر پھر ہارون کو میرے پاس بھیج، پھر اُس کو میرے ساتھ بطور مددگار کے بھیج

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۴۷﴾	اور (اُس وقت کی نعمت کو یاد کرو) جب کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو جُدا کر دیا (یعنی ہٹا دیا) پھر ہم نے تم کو بچا دیا اور ہم نے فرعون والوں کو ڈبو دیا اور (یہ سب کچھ) تم دیکھتے تھے ﴿۴۷﴾

گویا علت ہے، "فرجزا" اُس کا معلول یعنی لاٹھی مارنے کے سبب سے سمندر پھٹ گیا اور زمین نکل آئی، مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے "انفلق" ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا قاعدہ

بقیہ حاشیہ:

قال سنشد عضدك باخيك ونجعل لكما سلطانا (قصص)، قال قد اوتيت سؤلك يا موسٰى (طہ) اذهب انت و اخوك باياتي ولا تنيا في ذكري اذهبا الى فرعون انه طغى (طہ) قال كلا فاذهبا باياتنا انا معكم مستمعون فاتيا فرعون فقولا انا رسول رب العالمين ان ارسل معنا بني اسرائيل (شعرا) فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى قالا ربنا اننا نخاف ان يفرط علينا او ان يطغى قال لا تخافا انني معكما اسمع وارى فاتياه (طہ) فقل هل لك الى ان تزكى واهديك الى ربك فتخشى (نازعات) فقولا انا رسولا ربك فارسل معنا بني اسرائيل ولا تعذبهم قد جئناك باية من ربك (طہ)، قال فمن ربكما يا موسى قال ربنا الذي اعطى كل شيء خلقه ثم هدى قال فما بال القرون الاولى قال علمها عند ربي (طہ) قال فرعون وما رب العالمين قال رب السموات والارض وما بينهما ان كنتم موقنين قال لمن حوله الا تستمعون قال ربكم ورب ابائكم الاولين	خدا نے کہا کہ میں تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کر دوں گا۔ اور ہم دونوں کو غلبہ دوں گا، خدا نے کہا اے موسیٰ جو تو نے مانگا تجھ کو دیا گیا تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں سمیت اور سستی نہ کرو میری نصیحت میں تم دونوں فرعون پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہے، خدا نے کہا کہ وہ ہرگز ہم کو نہ مار سکیں گے تم دونوں میری نشانیوں سمیت جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری بات سنوں گا پھر فرعون کے پاس جاؤ اور پھر اُس سے کہو کہ ہم دونوں تمام عالموں کے پروردگار کے رسول ہیں ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج اور اُس سے نرم بات کہو شاید کہ نصیحت پاوے اور خوف کرے انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار بے شک ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر زیادتی کرے یا ہم سے سرکشی کرے خدا نے کہا کہ تم مت ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری بات سنوں گا اور تم کو دیکھتا رہوں گا پھر اُس کے پاس جاؤ، موسیٰ گئے اور کہا کہ تجھ کو پاک ہونے کی کچھ خواہش ہے اور میں تجھ کو تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں تاکہ تو خوف کرے خدا نے کہا کہ تم دونوں فرعون سے کہو ہم دونو تیرے پروردگار کے رسول ہیں پھر ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج اور اُن کو عذاب نہ دے ہم تیرے پروردگار کی نشانی لائے ہیں، فرعون بولا اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے موسیٰ نے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے کہ جس نے تمام چیزوں کی خلقت ان کو عطا کی ہے پھر سیدھی راہ بتائی ہے فرعون نے کہا کہ پھر اگلے زمانہ کے لوگوں کا کیا حال ہے موسیٰ نے کہا کہ اُس کی خبر خدا کو ہے فرعون نے کہا، تمام عالموں کا خدا کون ہے موسیٰ نے کہا کہ جو آسمانوں کا اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اُس سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین کرو، فرعون نے اُن لوگوں سے جو اُسکے ارد گرد تھے کہا کہ کیا تم نہیں سنتے ہو، موسیٰ نے کہا کہ تمہارا پروردگار اور تم سب کے باپ دادا کا ◆

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور جب ہم نے چالیس راتوں کا موسٰی سے وعدہ کیا اُس پر تم نے موسٰی کے پیچھے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ﴿۴۸﴾

ہے کہ جب ماضی جزا میں واقع ہوتی ہے تو اُس کی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہے تو اُس وقت اُس پر "ف" نہیں لاتے اور جب کہ وہ اپنے معنوں پر باقی

بقیہ حاشیہ:

قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون قال رب المشرق والمغرب وما بینهما ان کنتم تعقلون قال لئن اتخذت الٰهًا غیری لاجعلنک من المسجونین (شعرا) قال الم نربک فینا ولیدا ولبثت فینا من عمرک سنین وفعلت فعلتک التی فعلت وانت من الکافرین قال فعلتها اذا وانا من الضالین ففررت منکم لما خفتکم فوهب لی ربی حکما وجعلنی من المرسلین وتلک نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل (شعرا) فقال له فرعون انی لاظنک یا موسی مسحورا (بنی اسرائیل) قال اولو جئتک بشیء مبین (شعرا) قال ان کنت جئت باٰیة فأت بها (اعراف) ان کنت من الصادقین فالقی عصاه فاذا هی ثعبان مبین ونزع یده فاذا هی بیضاء للناظرین (شعرا) وقال موسی یا فرعون انی رسول من رب العالمین حقیق علی ان لا اقول علی الله الا الحق قد جئتکم ببینة من ربکم فارسل معی بنی اسرائیل (اعراف) واستکبر هو وجنوده فی الارض بغیر الحق وظنوا انهم الینا لا یرجعون (قصص) ... (ہود) ... فاستکبروا

فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ تمہارے پاس جو رسول آیا ہے البتہ دیوانہ ہے موسٰی نے کہا کہ تمام عالموں کا خدا وہی ہے جو مشرق و مغرب کا اور جو اُس میں ہے اُن سب کا پروردگار ہے اگر تم سمجھتے ہو فرعون نے کہا کہ اگر تو نے میرے سوا اور کسی کو خدا ٹھیرایا تو میں ضرور تجھ کو قیدیوں میں داخل کر دونگا۔ فرعون نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو نہیں پالا جب کہ تو ہم میں بچہ تھا اور کیا تو نے بسر نہیں کئے ہم میں اپنی عمر کے چند سال اور تو نے وہ کام کیا جو کیا اور تو ناشکروں میں ہے موسٰی نے کہا کہ میں نے کیا تھا جب کہ میں گمراہوں میں تھا پھر میں تم سے ڈرا اور تم میں سے بھاگ گیا پھر خدا نے مجھ کو حکم دیا اور مجھ کو پیغمبروں میں کیا اور یہ بھلائی جس کا احسان تو مجھ پر رکھتا ہے اِس سبب سے ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، فرعون نے موسٰی سے کہا کہ میں تجھ کو سحر زدہ سمجھتا ہوں، موسٰی نے کہا کہ جب بھی اگر میں کوئی بڑی نشانی لاؤں، فرعون نے کہا کہ اگر تو کوئی نشانی لا سکتا ہے تو اُس نشانی کو لا اگر تو سچا ہے، پھر موسٰی نے اپنی لاٹھی ڈال دی پھر یکایک وہ ہو بہو سانپ تھی اور اپنا ہاتھ نکالا پھر یکایک دیکھنے والوں کو چمکتا معلوم ہوتا تھا، موسٰی نے کہا اے فرعون میں پروردگار عالموں کا رسول ہوں مجھ کو لائق ہے کہ میں خدا پر سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہوں میں لایا ہوں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی پھر میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے بغیر کسی حق کے دنیا میں تکبر کیا اور گمان کیا کہ وہ ہمارے پاس پھر نہ آئینگے، پھر انہوں نے تکبر کیا

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ	پھر اُس کے بعد بھی ہم نے تم کو معاف کر دیا

رہتی ہے اور جزا کی معلول نہیں ہوتی تب اُس پر" ف، لاتے ہیں جیسے کہ اس مثال میں ہے
"ان اکرمتنی فاکرمتک امس" یعنی اگر تعظیم کریگا تو میری تو میں تیری تعظیم کل کر چکا ہوں" اس

تطبیق واقعات:

وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ (مومنون) [illegible] (یونس)
قالوا أنؤمن لبشرين مثلنا وقومهما
لنا عابدون (مومنون) ظلموا (اعراف)
فكذبوهما (مومنون) فقالوا ساحر كذاب (مومن)
قال الملأ حوله إن هذا لساحر عليم يريد أن
يخرجكم من أرضكم بسحره فماذا تأمرون قالوا
أرجه وأخاه وابعث (شعراء) وأرسل في
المدائن حاشرين يأتوك بكل ساحر عليم (اعراف)
قال أجئتنا لتخرجنا من أرضنا بسحرك يا موسى
فلنأتينك بسحر مثله فاجعل بيننا وبينك
موعدا لا نخلفه نحن ولا أنت مكانا سوى
قال موعدكم يوم الزينة وأن يحشر الناس
ضحى فتولى فرعون فجمع كيده ثم أتى (طه)
وقال فرعون ائتوني بكل ساحر عليم (یونس)
فجمع السحرة لميقات يوم معلوم وقيل للناس
هل أنتم مجتمعون لعلنا نتبع السحرة إن
كانوا هم الغالبين (شعراء) فلما جاء السحرة
فرعون قالوا أئن لنا لأجرا إن كنا نحن الغالبين
قال نعم وإنكم إذا لمن المقربين (شعراء) فتنازعوا
أمرهم بينهم وأسروا النجوى قالوا إن هذان
لساحران يريدان أن يخرجاكم من أرضكم
بسحرهما ويذهبا بطريقتكم المثلى فأجمعوا
كيدكم ثم ائتوا صفا وقد أفلح اليوم من
استعلى (طه) قالوا يا موسى إما أن تلقي

اور وہ ایک قوم سرچڑھی ہوئی تھی، گنہگار تھی، بولی کہ کیا ہم ایسے
دو شخصوں پر ایمان لے آویں جو ہمارے سے ہیں اور اُن کی قوم ہماری
غلام ہے پھر انہوں نے ظلم کیا، اور اُن دونوں کو جھٹلایا
اور کہا کہ جھوٹے جادوگر ہیں، فرعون نے اپنے اردگرد کے
درباریوں سے کہا کہ یہ جادوگر بڑا جاننے والا ہے چاہتا ہے کہ تم کو
تمہارے ملک سے اپنے جادو سے نکال دے پھر تم کیا کہتے
ہو وہ بولے کہ اُس کو اور اُس کے بھائی کو مہلت دے
اور شہروں میں (جادوگروں کے) اکٹھا کرنے والوں کو بھیج
تیرے پاس لے آویں ہر ایک بڑے علم والے جادوگر کو، فرعون
نے کہا کہ اے موسٰے کیا تو ہمارے پاس ہم کو ہمارے
ملک سے اپنے جادو سے نکالنے کو آیا ہے، پھر بیشک
ہم بھی تیرے پاس ویسا ہی جادو لاویں گے۔ پس کسی
چوپٹ میدان میں ہم میں اور اپنے میں (مقابلہ کے لئے)
کوئی وقت مقرر کر کہ ہم اُس کے برخلاف کریں اور نہ تو،
موسٰے نے کہا کہ جشن کا دن تمہارے وعدے کا سہی اور
تھوڑے دن چڑھے سب آدمی وہاں اکٹھے ہو جاویں،
پھر فرعون (اپنے محل میں) گیا اور اُسنے جادوگروں کو جمع کیا
فرعون نے کہا کہ ہر ایک بڑے جادوگر کو بلاؤ، پھر تمام جادوگر
وقت معین پر جمع ہوگئے اور لوگوں سے کہا کہ کیا تم بھی
اکٹھے ہوگے، تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں تو ہم اُن کا
ساتھ دیں، جب فرعون کے جادوگر فرعون کے پاس آئے
تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم غالب ہوں تو ہمارے لئے کچھ انعام
ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تب تو تم مقربوں میں سے ہوگے
پھر اُن کے باہم اُن کے کام میں کچھ جھگڑا ہوا اور انہوں نے اپنے مشورہ
کو چھپایا۔ اُنہوں نے کہا کہ بیشک یہ دونوں جادوگر ہیں ایسے جادو
سے تم کو تمہارے ملک سے نکالنا اور تمہارے عمدہ مذہب کو کھونا چاہتے ہیں
پس سب جادوگروں کو جمع کر کے کہا کہ تم اکٹھے ہو کر چلو اور آج کے
دن جو غالب ہوگا وہی کامیاب ہوگا چنانچہ یوم موعود کو سب
جمع ہوئے فرعون کے جادوگروں نے موسٰی سے کہا کہ یا تو تو ڈال

شاید کہ تم شکر کرو ﴿۴۹﴾	لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۴۹﴾

مثال میں جزا (یعنی گذشتہ کل میں تعظیم کا کرنا) شرط کی معلول نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے پہلے ہو چکی تھی، اسی طرح اس آیت میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا ضرب کا معلول نہیں ہو سکتا ÷

اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ کے لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہ نکلا تھا، علمائے اسلام تفسیرین

إما أن نكون أول من ألقى (طه) وإما أن نكون
نحن الملقين قال ألقوا فلما ألقوا سحروا
أعين الناس واسترهبوهم وجاءوا بسحر
عظيم (اعراف) فألقوا حبالهم وعصيهم وقالوا
بعزة فرعون إنا لنحن الغالبون (شعراء) فإذا
حبالهم وعصيهم يخيل إليه من سحرهم أنها
تسعى (طه) فلما ألقوا قال موسى ما جئتم
به السحر إن الله سيبطله (يونس) فأوجس
في نفسه خيفة موسى قلنا لا تخف إنك
أنت الأعلى (طه) وأوحينا إلى موسى أن
ألق عصاك فإذا هي تلقف ما يأفكون (اعراف)
فألقى عصاه فإذا هي تلقف ما يأفكون (شعراء)
ما صنعوا إنما صنعوا كيد ساحر ولا يفلح
الساحر حيث أتى (طه) فوقع الحق وبطل
ما كانوا يعملون فغلبوا هنالك وانقلبوا
صاغرين وألقي السحرة ساجدين (اعراف)
سجدا (طه) قالوا آمنا برب العالمين رب
موسى وهرون قال فرعون آمنتم به
قبل أن آذن لكم إن هذا لمكر مكرتموه في
المدينة لتخرجوا منها أهلها فسوف تعلمون
(اعراف) إنه لكبيركم الذي علمكم السحر
فلأقطعن أيديكم وأرجلكم من خلاف

یا ہم پہلے ڈالتے ہیں موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو پھر جب اُنہوں نے ڈالا
تو لوگوں کی آنکھوں پر دست بندی کر دی اور اُن کو ڈرا دیا
اور بہت بڑا جادو کر لائے، جب اُنہوں نے اپنی رسیاں اور
لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ فرعون کی عزت کی قسم ہم ہی
غالب ہیں، تب تو موسیٰ کے خیال میں اُن کی رسیاں
اور لاٹھیاں اُن کے جادو سے چلتی ہوئی دکھنے لگیں۔ موسیٰ
نے کہا کہ یہ جو تم نے کیا یہ جادو ہے اُس کو خدا باطل کریگا
مگر موسیٰ کے دل میں ڈر گیا خدا نے کہا مت ڈر تو ہی جیتے گا
اور خدا نے موسیٰ کے دل میں ڈالا کہ اپنی لاٹھی ڈال
کہ وہ اس سب بناوٹ کو نگل جاویگی، پھر موسیٰ نے
اپنی لاٹھی ڈالی پھر اُس سب بناوٹ کو جو اُنہوں نے
گھڑی تھی نگلتی تھی، اُنہوں نے تو جادوگروں کا سا مکر
کیا تھا اور موسیٰ کے سامنے جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا
پس حق ثابت ہو گیا اور جو اُنہوں نے کیا تھا وہ باطل ہو گیا
پھر وہاں ہار کر ذلت سے لوٹ گئے۔ اور فرعون کے جادوگروں
نے سجدہ کیا اور کہا ہم پروردگار عالموں پر ایمان لائے جو موسیٰ
و ہارون کا پروردگار ہے، فرعون نے کہا کہ تم
میری اجازت سے پہلے موسیٰ پر ایمان لے آئے
بے شبہ یہ مکر ہے جو تم نے اس شہر میں شہر والوں کے
نکالنے کو کیا پھر جلد تم اس کا انجام جانو گے، موسیٰ
ہی تمہارا گرو ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے ضرور میں تمہارے ہاتھ
ایک طرف کے اور تمہارے پاؤں دوسری طرف کے

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ	اور (یاد کرو) جب ہم نے موسے کو کتاب اور صحیح کو غلط سے جدا کرنے والی (چیز) دی

میں اور خصوصاً بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی پیروی کرنے کے عادی تھے اور قرآن مجید کے مطالب کو خواہ نخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی روایتوں کے موافق کرتے تھے اس لئے اُنہوں نے اس جگہ بھی اور وہاں بھی جہاں قرآن میں آیا ہے ،، فاضرب بعصاک الحجر فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا ،، ضرب کے معنی ،، زدن ،، کے لئے اور اُس سیدھے سادے معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا ✽

تفسیر: ولاصلبنکم فی جذوع النخل ولتعلمن
اینا اشد عذابا وابقی قالوا لن نؤثرک علی
ما جاءنا من البینات والذی فطرنا فاقض
ما انت قاض (ط) وما تنقم منا الا ان آمنا
بآیات ربنا لما جاءتنا ربنا افرغ علینا
صبرا وتوفنا مسلمین (اعراف) ✽
ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین
ونقص من الثمرات لعلہم یذکرون فاذا
جاءتہم الحسنۃ قالوا لنا ہذہ وان
تصبہم سیئۃ یطیروا بموسی ومن معہ
الا انما طائرہم عند اللہ ولکن اکثرہم
لا یعلمون وقالوا مہما تاتنا بہ من آیۃ
لتسحرنا بہا فما نحن لک بمؤمنین فارسلنا
علیہم الطوفان والجراد والقمل والضفادع
والدم آیات مفصلات فاستکبروا وکانوا
قوما مجرمین (اعراف) فلما جاءتہم آیاتنا
مبصرۃ قالوا ہذا سحر مبین وجحدوا بہا
(نمل) ولقد اریناہ آیاتنا کلہا فکذب وابی
(طہ) فلما جاءہم موسی بآیاتنا بینات قالوا ما
ہذا الا سحر مفتری وما سمعنا بہذا فی

کٹوا ڈالوں گا اور تم کو کھجوروں کے درختوں کی سولی پر
چڑھا دوں گا اور بلاشبہ تم جان لوگے کہ کون سب سے زیادہ عذاب
دینے میں سخت ہے اور کس کا عذاب زیادہ پائدار ہے، وہ بولے
کہ جو نشانیاں ہمارے سامنے ہوئی ہیں اُن پر اور اُس پر جس نے
ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو ہم ترجیح نہیں دینگے پھر جو تو حکم دینا چاہتا
ہے حکم دے، تو ہم پر بجز اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر
ایمان لائے ہیں اور کوئی گناہ نہیں ٹھیرایا، اے ہمارے پروردگار
ہم پر (یعنی) ہم پر ادیں تو ہمارے (دل میں) صبر ڈالدے
اور ہم کو مسلمان مار ✽
اور بلاشبہ ہم نے فرعون والوں کو قحط میں اور پھلوں کی کم
پیداوار میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں، پھر جب انکو
فراخی ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے لئے ہے۔ اور جب
اُن پر سختی پڑتی تھی تو موسے کی اور اُس کے ساتھ کے لوگوں
کی نحوست بتلاتے تھے، سمجھو اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ جو
نحوست اُنکے لئے تھی وہ خدا کے پاس سے تھی مگر اُن میں بہت
سے لوگ نہیں جانتے، فرعون والوں نے موسیٰ سے کہا کہ جو نشان
تم لاؤ گے تاکہ ہم پر اُن سے جادو کرو تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے
پھر ہم نے اُن پر طوفان اور ٹڈی دل اور جوئیں اور مینڈک اور
خون کا (مینہ) نازل کیا جدا جدا نشانیاں، پھر انہوں نے تکبر کیا اور
وہ گنہگار قوم تھی، جب اُن کو ہماری نشانیاں دکھائی دیتی ہوئی آئیں
تو بولے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور اُن نشانیوں کا انکار کیا،
اور البتہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھلائیں پھر اُس نے جھٹلایا اور
انکار کیا، اور جب موسیٰ اُن کے پاس ہماری نشانیاں لیکر آیا، تو
بولے کہ یہ تو سحر ہے گھڑا ہوا جادو ہے اور یہ ہم نے ہمارے
اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات نہیں سنی

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۵۰)	کہ شاید تم راہ پر آؤ (۵۰)

اس مقام پر ضرب کے معنے "زدن" کے نہیں ہیں بلکہ چلنے کے یا جلد چلنے کے ہیں جیسے کہ عرب بولتے ہیں "ضرب فی الارض" چلا یا دوڑا زمین پر خود قرآن مجید میں آیا ہے

اٰبائنا الاوّلین وقال موسیٰ ربی اعلم بمن جاء بالهدیٰ من عنده ومن تکون له عاقبة الدار (قصص) قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه اٰبائنا وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمؤمنین (یونس) وقال فرعون یا ایها الملاء ما علمت لکم من اله غیری فاوقد لی یا هامان علی الطین فاجعل لی (قصص) ابن لی (مومن) صرحا لعلی اطلع الی اله موسیٰ (قصص) لعلی ابلغ الاسباب اسباب السمٰوات (مومن) وانی لاظنه من الکاذبین (قصص) وجاء هم (ای قوم فرعون) رسول کریم ان ادوا الی عباد الله انی لکم رسول امین وان لا تعلوا علی الله انی اٰتیکم بسلطان مبین وانی عذت بربی وربکم ان ترجمون وان لم تؤمنوا لی فاعتزلون (دخان) فلما جاء هم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابناء الذین اٰمنوا معه واستحیوا نساءهم وما کید الکافرین الا فی ضلال وقال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ ولیدع ربه انی اخاف ان یبدل دینکم او ان یظهر فی الارض الفساد (مومن) وقال رجل مومن من اٰل فرعون یکتم ایمانه اتقتلون رجلا ان یقول ربی الله وقد جاءکم بالبینٰت من ربکم وان یک کاذبا فعلیه کذبه وان یک صادقا یصبکم بعض الذی یعدکم ان الله لا یهدی من هو مسرف کذاب یٰقوم لکم الملک الیوم ظاهرین فی الارض فمن ینصرنا من بأس الله ان جاءنا

موسیٰ نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ کون اُس کے پاس سے ہدایت لیکر آیا ہے اور کس کے لئے پیچھے کو اُس گھر (یعنی عاقبت) کی بھلائی ہوگی فرعون والے بولے کہ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم کو اُس بات سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ہٹا دے اور تم دونوں کو دنیا میں بڑائی ہو، اور ہم تم دونوں کو نہیں مانتے ہیں، فرعون نے کہا کہ اے دربارو میں تمہارے لئے سوا اپنے کوئی خدا نہیں جانتا، پھر اے ہامان میرے لئے مٹی کی اینٹیں آگ میں پکا، اور میرے لئے اونچا محل بنا، تاکہ میں موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں، اور میں تو اُس کو جھوٹوں میں سمجھتا ہوں ◆

اور آیا فرعون کی قوم کے پاس ایک بزرگ پیغمبر (یعنی موسیٰ) یہ کہتا ہوا کہ میرے حوالے کر دو خدا کے بندوں کو بیشک میں تمہارے لئے خدا کا بھیجا ہوا امانت دار پیغمبر ہوں اور تم خدا پر سرکشی مت کرو۔ میں ضرور تمہارے سامنے کھلی دلیلیں لاتا ہوں اور بےشک میں نے اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو پناہ مانگی ہے اور اگر تم مجھ کو نہیں مانتے تو مجھ سے جدا ہو جاؤ، پھر جب موسیٰ اُن کے پاس ہمارے پاس سے حق بات لیکر آیا تو بولے کہ اُن لوگوں کے بیٹوں کو مار ڈالو جو اس پر ایمان لائے ہیں اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو حالانکہ کافروں کی مکاری بجز گمراہی کے اور کچھ نہیں اور فرعون نے کہا مجھ کو چھوڑ دو (یعنی اجازت دو) کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو پکارا ہی کرے، بلاشبہ مجھے خوف ہے کہ تمہارا دین بدل دے اور ملک میں فساد برپا کرے اور فرعون والوں میں سے ایک مسلمان شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا کہ کیا تم ایسے شخص کو مار ڈالو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے پروردگار سے نشانیاں لایا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہو تو اُس کا جھوٹ اُس پر ہے اور اگر وہ سچا ہو تو تم کو بعضی وہ مصیبتیں پہنچیں گی جن کا وہ وعدہ کرتا ہے ہرگز خدا اُس شخص کو جو حد سے تجاوز

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ	اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (نساء) یعنی جب تم چلو زمین پر یعنی سفر کرو تو کچھ حرج نہیں ہے کہ نماز میں کمی کرو، پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسٰے کو کہا کہ "اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے، سورہ طٰہٰ میں جو آیت ہے اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات

تفسیر بالقرآن

فرعون ما اريكم الا ما ارى وما اهديكم الا سبيل الرشاد (مومن) وقال الذى آمن يا قوم انى اخاف عليكم مثل يوم الاحزاب مثل داب قوم نوح وعاد وثمود والذين من بعدهم وما الله يريد ظلما للعباد ويا قوم انى اخاف عليكم يوم التناد يوم تولون مدبرين ما لكم من الله من عاصم ومن يضلل الله فما له من هاد (مومن) ولقد جاءكم يوسف من قبل بالبينات فما زلتم فى شك مما جاءكم به حتى اذا هلك قلتم لن يبعث الله من بعده رسولا (مومن) ٭

وقال فرعون يا هامان ابن لى صرحا لعلى ابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع الى اله موسى وانى لاظنه كاذبا وكذلك زين لفرعون سوء عمله وصد عن السبيل وما كيد فرعون الا فى تباب (مومن) ٭

ان قارون كان من قوم موسى فبغى عليهم وآتيناه من الكنوز ما ان مفاتحه لتنوء بالعصبة اولى القوة اذ قال له قومه لا تفرح ان الله لا يحب الفرحين وابتغ فيما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا واحسن كما احسن الله اليك ولا تبغ الفساد فى الارض ان الله لا يحب المفسدين

کرنے والا دروغ گو کو ہدایت نہیں کرتا۔ اے میری قوم آج کے دن تمہارے لئے بادشاہت ہے دنیا پر غالب ہو پھر وہ خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آجاوے کون ہم کو مدد دیگا۔ فرعون نے کہا کہ میں تم کو مگر اُس کے جو میں دکھاتا ہوں اور کچھ نہیں سمجھاتا اور میں تم کو مگر راہ راست کے اور کچھ نہیں بتاتا۔ اُس شخص نے جو ایمان لایا تھا کہا کہ اے میری قوم بیشک میں تم پر ایسے دن کا جو اگلے گروہوں پر گذرا ہے خوف کرتا ہوں جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور اُن کی جو اُن کے بعد ہوئیں حالت ہوئی اور خدا بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا، اے میری قوم بیشک میں تم پر چیل چلاہٹ پڑنے کے دن کا خوف کرتا ہوں جس دن کہ تم اُدھر سے پیٹھ پھیر کر پھر جاؤ گے کوئی تم کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا، اور جس کو خدا گمراہ کرتا ہے اُس کو کوئی راہ بتانے والا نہیں، اور البتہ تمہارے پاس اس سے پہلے کھلی ہوئی نشانیاں لیکر یوسف آیا تھا پھر تم ہمیشہ اس میں جو وہ تمہارے پاس لایا تھا شبہ میں رہے یہاں تک کہ جب وہ مرگیا تو تم نے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجے گا اللہ اُس کے بعد کسی پیغمبر کو ٭

فرعون نے کہا کہ اے ہامان میرے لئے ایک محل بنا تاکہ میں رستوں تک آسمانوں کے رستوں تک پہنچ جاؤں پھر موسٰے کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لئے اُس کے بدعمل بھڑک دار کئے گئے اور سیدھے رستہ سے روک دیا گیا تھا اور فرعون کے مکر تباہی کے اور کچھ نہ تھے ٭

قارون موسٰی کی قوم میں سے تھا پھر اُن سے پھر گیا اور ہم نے اُس کو ایسے خزانے دیئے تھے کہ اُس کی کنجیاں ایک قوی گروہ پر بھی بھاری تھیں، جب اُس کی قوم نے اُس سے کہا کہ مت اترا کہ خدا اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو کچھ خدا نے تجھ کو دیا ہے اس میں آخرت کو ڈھونڈ اور اپنے حصہ کو دنیا میں سے مت بھول اور احسان کر جیسے کہ خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے اور دنیا میں فساد مت چاہ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا

يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

کہ اے میری قوم تم نے اپنی جانوں پر بچھڑا بنا کر ظلم کیا

کو سمندر میں سوکھے رستہ سے لیکر نکل چلیں پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسی مشکل کے وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالےٰ نے موسیٰ کو اور تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اُترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ معہ اپنے لشکر کے ڈوب گیا +

قال انما اوتیته علی علم عندی اولم یعلم ان اللہ قد اهلک من قبله من القرون من هو اشد منه قوة و اکثر جمعا ولا یسئل عن ذنوبهم المجرمون فخرج علی قومه فی زینته قال الذین یریدون الحیوة الدنیا یالیت لنا مثل ما اوتی قارون انه لذو حظ عظیم وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن امن وعمل صالحا ولا یلقها الا الصابرون فخسفنا به وبداره الارض فما کان له من فئة ینصرونه من دون اللہ وما کان من المنتصرین واصبح الذین تمنوا مکانه بالامس یقولون ویکان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عباده ویقدر لولا ان من اللہ علینا لخسف بنا ویکانه لا یفلح الکافرون (قصص) +

اُس نے کہا کہ مجھ کو یہ دولت صرف میری دانائی کے سبب دی گئی ہے۔ کیا وہ یہ نہ سمجھا کہ بے شبہ خدا نے کتنی قومیں اُس سے پہلے اُن کو ہلاک کر دیا جو اُس سے بھی زیادہ قوی اور زیادہ دولت والے تھے اور کیا گنہگار اپنے گناہوں پر پوچھے نہ جاوینگے پھر قارون اپنی قوم کے سامنے تجمل سے نکلا جو لوگ دنیا ہی کی زندگی کو چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے بیشک وہی بڑا صاحب نصیب ہے، اور جن لوگوں کو دانش دی گئی تھی انہوں نے کہا افسوس تم پر، خدا کا ثواب اُن کے لئے جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کئے ہیں بہت اچھا ہے اور وہ بجز صبر کرنے والوں کے اور کسی کو نہیں ملتا، پھر ہم نے قارون کو اُس کے گھر سمیت زمین میں دھسا دیا پھر کوئی گروہ خدا کے سوا اُس کے لئے نہ تھی جو اُس کی مدد کرے اور نہ وہ اپنے آپ مدد کر سکتا تھا اور جن لوگوں نے کل اُس کے رتبہ کی تمنا کی تھی انہوں نے یہ کہتے ہوئے صبح کی کہ اوہو اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو فراخ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم کو بھی دھسا دیتا، اوہو! وہ نہیں فلاح پہنچاتا کافروں کو +

ونادی فرعون فی قومه قال یقوم الیس لی ملک مصر وهذه الانهار تجری من تحتی افلا تبصرون ام انا خیر من هذا الذی هو مهین ولا یکاد یبین فلولا القی علیه اسورة من ذهب او جاء معه الملئکة مقترنین (زخرف) ولما وقع علیهم الرجز قالوا یموسی ادع لنا ربک بما عهد عندک لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل فلما کشفنا عنهم الرجز الی اجل هم بالغوه اذا هم ینکثون (اعراف) واخذناهم بالعذاب لعلهم یرجعون وقالوا یایها الساحر ادع لنا ربک بما عهد عندک اننا لمهتدون (زخرف)

اور فرعون نے اپنے لوگوں میں پکار کر کہا کہ اے لوگو کیا میرے پاس مصر کا ملک نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے ملک کے نیچے بہتی ہیں پھر کیا تم نہیں دیکھتے ہو آیا میں اچھا ہوں اُس شخص سے جو ذلیل ہے اور نہیں بیان کر سکتا کہ کیوں نہ اُس پر ڈالے گئے سونے کے کنگن اور کیوں نہ اُس کے ساتھ فرشتے رہتے ہوئے آئے۔ اور جب فرعون والوں پر آفت پڑی تو بولے اے موسیٰ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے جس طرح اُس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ اگر ہم پر سے آفت جاتی رہی تو ہم تجھ پر ضرور ایمان لاوینگے، اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدینگے، پھر جب ہم نے اُن پر سے ایک مدت تک آفت کو دور کر دیا جس آفت تک پہنچنے کو تھے تو وہ پھر گئے، اور ہم نے اُن کو عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ (بد راہ سے) پھر جاویں۔ فرعون والوں نے کہا کہ اے جادوگر ہمارے لئے اپنے پروردگار سے جس طرح کہ اُس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ بیشک ہم ہدایت پا گئے ہیں

فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ	پھر معافی چاہو اپنے پروردگار سے ،

اس مقام پر یہ بحث پیش آئیگی کہ جب "ضرب" کے معنی چلنے کے آتے ہیں اور اُس کے صلہ میں "فی" کا لفظ آتا ہے جیسے کہ "اذا ضربتم فی الارض" میں ہے حالانکہ "فاضرب بعصاک البحر" اور "فاضرب بعصاک الحجر" میں "فی" نہیں ہے مگر "فی" کے نہ ہونے سے کچھ حرج نہیں ہے اس لئے کہ جب "ضرب" کے معنی چلنے کے لئے جاتے ہیں تو بواسطہ

تفسیر

قال موسٰی ربنا انک اٰتیت فرعون وملاٗہ زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علٰی اموالھم واشدد علٰی قلوبھم فلا یؤمنوا حتٰی یروا العذاب الالیم قال قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون (یونس) قال موسٰی لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا قال عسٰی ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون (اعراف) +

موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون کو اور اُس کے درباریوں کو تجمل اور دولت دنیا کی زندگی میں دی ہے ، اے ہمارے پروردگار کیا اس لئے کہ تیری راہ سے گمراہ کریں ، اے پروردگار ہمارے ستیاناسی ڈال اُن کے مالوں پر اور سختی ڈال اُن کے دلوں پر پھر وہ نہیں ایمان لانے کے جب تک کہ دکھ دینے والا عذاب نہ دیکھینگے ، خدا نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول کی گئی پھر مستقل رہو اور اُن کی راہ مت چلو جو نہیں جانتے ، موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد مانگو اور صبر کرو بیشک یہ زمین خدا کی ہے اُس کو اپنے بندوں میں سے جسکو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخر کو بھلائی پرہیزگاروں کے لئے ہے ، انہوں نے کہا کہ ہم کو تو تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد اذیت ہی دیگئی ہے موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کریگا اور عنقریب تم کو زمین پر خلیفہ کردیگا پھر دیکھیگا کہ تم کس طرح کرو گے +

ولقد اوحینا الٰی موسٰی ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا لا تخاف درکا ولا تخشٰی (طٰہٰ) فاسر بعبادی لیلا انکم متبعون واترک البحر رھوا انھم جند مغرقون (دخان) ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم (شعرا) واذ فرقنا بکم البحر فانجینٰکم واغرقنا اٰل فرعون وانتم تنظرون (بقر) فاتبعوھم مشرقین فلما تراءا الجمعان قال اصحاب موسٰی انا لمدرکون قال کلا ان معی ربی سیھدین (شعرا) فاتبعھم فرعون

ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ رات کو لیچل میرے بندوں کو چل اُن کے لئے سمندر کے سوکھے رستہ میں مت خوف کر پکڑ لئے جانے سے (اور نہ اور کسی طرح کا ڈر کر) لیچل میرے بندوں کو رات کو ہم (دشمن سے) تعاقب کئے جاوگے اور چھوڑ چل سمندر کو اسی حالت میں کہ ۱ٓ ٹھہرا ہوا ہے بیشک فرعون کے لوگ ایک لشکر ہے کہ ڈبویا جاویگا چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں کہ وہ پھٹا ہوا ہے پھر تھا ہر ایک ٹکڑہ بڑے پہاڑ کی مانند اور جب کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو جدا کردیا پھر ہم نے تم کو بچایا اور ہم نے فرعون والوں کو ڈبو دیا اور تم دیکھتے تھے۔ پھر سورج کے نکلتے ہی فرعون والوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا پھر جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے لوگوں نے کہا کہ اب ہم پکڑے گئے موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں بیشک میرے ساتھ میرا خدا ہے جو مجھکو رستہ بتاویگا۔ پھر فرعون نے اپنے لشکر سمیت اُن کا

ل٥ "رھوا" کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے "تھم رہا" کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے "خشک" کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے "آرمیدہ" اور قاموس میں اُس کے معنی لکھے ہیں "المرتفع والمنخفض ضد السکون" +

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ	پس مار ڈالو اپنے آپ کو ،

حرف جر یعنی "فی" کے متعدی کیا جاتا ہے اور جو افعال کہ بواسطہ جرّ کے متعدی ہوتے ہیں اُن میں حرف جرّ کو محذوف کرنا اور فعل کو بلاواسطہ مفعول کی طرف متعدی کرنا جائز ہے۔ اور اس مفعول کو منصوب علی نزع الخافض کہتے ہیں۔ اس مقام پر فعل "اضرب" کے "عصا" کے ساتھ

فغشیھم من الیم ما غشیھم واضل فرعون قومہ وما ھدی (طہ) وازلفنا ثم الاخرین وانجینا موسیٰ ومن معہ اجمعین ثم اغرقنا الاخرین (شعراء) فانتقمنا منھم فاغرقنٰھم فی الیم بانھم کذبوا بآیاتنا وکانوا عنھا غافلین (اعراف) فاخذناہ وجنودہ فنبذناھم فی الیم (قصص) فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقناہ ومن معہ جمیعًا وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض فاذا جاء وعد الاخرۃ جئنا بکم لفیفا (بنی اسرائیل) ✤

وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلوٰی کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون (بقر) ونزلنا علیکم المن والسلوٰی کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم ولا تطغوا فیہ فیحل علیکم غضبی ومن یحلل علیہ غضبی فقد ھوٰی (طہ) وقطعنٰھم اثنتی عشرۃ اسباطا امما واوحینا الی موسیٰ اذ استسقٰہ قومہ ان اضرب بعصاک الحجر فانبجست (اعراف) فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا قد علم کل اناس مشربھم کلوا واشربوا من رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین (بقر) واذ قلتم یا موسیٰ لن نصبر علی طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلھا وقثائھا وفومھا وعدسھا وبصلھا قال اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر اھبطوا مصرا فان لکم ما سالتم (بقر)

پھر چھا گیا پھر ڈھانک دیا اُن کو سمندر میں سے جس نے اُن کو ڈھانک لیا ، اور غلط راہ پر لے گیا فرعون اپنی قوم کو اور ٹھیک رستہ نہ بتایا ۔ اور ہم نے پچھلوں کو قریب کر دیا اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اُس کے ساتھ تھے سب کو بچا دیا پھر ہم نے پچھلوں کو ڈبو دیا۔ پھر ہم نے بدلا لیا اُن سے اور ہم نے اُن کو سمندر میں ڈبو دیا اس لئے کہ بے شبہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور اُس سے غافل تھے پھر پکڑا ہم نے فرعون کو اور اُس کے لشکر کو اور اُن کو ہم نے سمندر میں ڈال دیا۔ فرعون چاہتا تھا کہ اُن کو زمین سے نکال دے پھر ہم نے اُس کو ڈبو دیا اور سب کو جو اُس کے ساتھ تھے اور اُس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہا کہ رہو اس زمین پر پھر جب آویگا آخرت کا وعدہ تو ہم تم کو لا دینگے ملوان ✤

ہم نے تم پر بدلیوں کی ابر کی اور تم پر من وسلوے اُتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا۔ مگر اُنھوں نے آپ اپنے پر ظلم کیا تھا۔ اور ہم نے تم پر من وسلوے اُتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اس میں زیادتی مت کرو تاکہ میرا غصہ تم پر نازل ہو اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا وہ ہلاک ہوا۔ اور جدا کر دیئے ہم نے بنی اسرائیل کے اسباط کے بارہ گروہ اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی جب کہ اُس کی قوم نے پانی مانگا کہ چل اپنی لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر اُس سے بہتی ہیں ، پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے ان میں ہر ایک نے اپنا گھاٹ جان لیا کھاؤ اور پیو خدا کے دیئے ہوئے رزق سے اور زمین پر مفسد ہو کر باغی مت کرو۔ جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پھر اپنے پروردگار سے دعا مانگ کہ ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے جو زمین اُگاتی ہے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز اور لہسن موسیٰ نے کہا کیا تم بدلنا چاہتے ہو بُرے کو بھلے سے جا اترو شہر میں کہ تم کو ملیگا جو تم مانگتے ہو ✤

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ	یہ اچھا ہے تمہارے لئے تمہارے پروردگار کے نزدیک ،

ربط دینے کو ایک حرف جر یعنی "ب" "عصا" پر آچکی تھی پھر اسی فعل کو مفعول کی جانب متعدی کرنے کے لئے دوسرے حرف جر یعنی "فی" کا لانا کسی قدر فصاحت کلام کے مناسب نہ تھا اور اس لئے اُس کا حذف اَولیٰ تھا پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہ "فاضرب بعصاك فی البحر" اور قرینہ حذف "فی" کا خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیونکہ ٹھیک انہی الفاظ سے سورہ طٰہٰ میں بھی آیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ "فاضرب لھم طریقا فی البحر" پس ایک جگہ لفظ "فی" مذکور ہے تو یہی قرینہ باقی مقامات میں اُس کے محذوف ہونے کا ہے۔ اسی آیت میں فعل "ضرب" کے بلا واسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہونے کی مثال بھی موجود ہے ، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس آیت

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا على قوم یعکفون على اصنام لهم قالوا یا موسى اجعل لنا الها كما لهم الهة قال انكم قوم تجهلون ان هؤلاء متبر ما هم فيه وباطل ما كانوا يعملون (اعراف)

واذ قلنا ادخلوا هذه القرية فكلوا منها حيث شئتم رغدا وادخلوا الباب سجدا وقولوا حطة نغفر لكم خطاياكم وسنزيد المحسنين فبدل الذين ظلموا قولا غير الذي قيل لهم فارسلنا عليهم رجزا من السماء بما كانوا يفسقون (بقر) يظلمون (اعراف)

ولما جاء موسى لميقاتنا وكلمه ربه قال رب ارني انظر اليك قال لن تراني ولكن انظر الى الجبل فان استقر مكانه فسوف تراني فلما تجلى ربه للجبل جعله دكا وخر موسى صعقا فلما افاق قال سبحانك تبت اليك وانا اول المؤمنين قال يا موسى اني اصطفيتك على الناس برسالاتي وبكلامي فخذ ما آتيتك وكن من الشاكرين (اعراف)

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا سے نکال لے گئے پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس آئے جو اپنے بتوں کی سیوا کرتے تھے بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسے معبود بنا جیسے اُن کے معبود ہیں موسیٰ نے کہا کہ بیشک تم جاہل قوم ہو یہ خراب حالت ہے جس میں یہ لوگ ہیں اور غلط ہے جو یہ کرتے ہیں اور جب ہم نے تم سے کہا کہ داخل ہو اس شہر میں پھر کھاؤ اُس میں سے جو چاہو پیٹ بھر کر اور داخل ہو دروازوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں بخش دینگے ہم تمہاری سب خطائیں اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ دینگے پھر ظالموں نے بات بدل دی اُس کے سوا جو اُن سے کہی گئی تھی پھر ہم نے اُن کی بدکاری کے سبب اُن پر آسمان سے آفت بھیجی اور جب موسیٰ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اُس کے پروردگار نے اُس سے بات کی تو اُس نے کہا کہ تو مجھ کو اپنے تئیں دکھا دے تاکہ میں تجھ کو دیکھوں خدا نے کہا کہ تو مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن تو اس پہاڑ کو دیکھ پھر اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ سکیگا ، پھر جب اُس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بیہوش ہو کر گرا پھر جب ہوش میں آیا تو کہا کہ تو پاک ہے اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں تیرے سامنے اور میں پہلا ایمان لانیوالا ہوں ، خدا نے کہا اے موسیٰ میں نے تجھ کو اور لوگوں پر اپنا رسول کرنے اور خود کلام کرنے سے برگزیدہ کیا ہے پھر جو میں تجھ کو دیتا ہوں اُس کو لے اور شکر کرنیوالوں میں سے ہو

فَتَابَ عَلَيْكُمْ	پھر (خدا نے) تم کو معاف کیا ،

کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "پس بروبرائے ایشاں درراہ خشک" یعنی شاہ صاحب نے "ضرب" کے معنی زدن کے نہیں لئے ، رفتن ، کے لئے ہیں جو لازمی ہے اور لفظ ، "طریقا" اس آیت میں "اضرب" کا مفعول ہے اور بلاواسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہوا ہے ؛

جغرافیہ کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ خلیج عرب اور بحر احمر عدن کے پاس مل گئے ہیں دونوں طرف پہاڑ ہیں اور اُن کے بیچ میں نہایت تنگ رستہ ہے ، جو جہاز خلیج عرب سے

تفسیر بالقرآن

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً (بقر) وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا (اعراف) فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (بقر) فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ (اعراف) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقر) وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ (اعراف) وَمَا أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَا مُوسَىٰ قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَىٰ أَثَرِي وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ (طہ) وَوَاعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (اعراف) وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ (اعراف) قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِن بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (طہ) فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَٰذَا إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ

اور جب تم نے کہا اے موسٰے ہم تجھ پر ایمان نہ لاوینگے جب تک کہ علانیہ خدا کو نہ دیکھیں۔ اور موسٰے نے ہمارے وقت مقررہ پر حاضر ہونے کے لئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چھانٹے پھر تم کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا اور یہ سب باتیں تم دیکھتے تھے پھر ہم نے تم کو تمہارے مرجانے (بیہوش ہوجانے) کے بعد اُٹھایا کہ شاید تم شکر کرو ، پھر جب اُن کو کپکپاہٹ نے پکڑا تو موسٰے نے کہا اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی اُن کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا۔ اور جب ہم نے تم سے قول لیا اور ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا ، کہ مضبوط پکڑو جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم بچ جاؤ۔ اور جب ہم نے اُن پر پہاڑ کو اُٹھایا گویا کہ وہ سائبان تھا اور اُنہوں نے گمان کیا کہ وہ اُن پر گریگا مضبوطی سے پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے۔ ہم نے موسٰی سے کہا کہ کیوں تو جلدی کر کے چلا آیا اپنی قوم کے پاس سے کہا وہ بھی میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس جلدی چلا آیا ہوں تاکہ اے پروردگار تو راضی ہو ، اور وعدہ کیا ہم نے موسٰی سے تیس رات کا اور ہم نے پورا کیا اُس کو دس سے تمام ہوگئی میعاد اُس کے پروردگار کی چالیس رات ، اور موسٰی نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرا خلیفہ ہو اور اصلاح کر اور مفسدوں کے طریق کی پیروی مت کر موسٰی کی قوم نے اُس کے بعد اپنے زیور سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ خدا نے موسٰی سے کہا کہ ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو فتنہ میں ڈالا اور سامری نے اُنکو گمراہ کر دیا۔ پھر سامری نے اُن کے لئے بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں آواز نکلتی تھی پھر وہ بولے کہ یہ ہمارا خدا اور موسٰے کا خدا موسٰی تو بھول گیا ، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ اُن کی بات کا اُلٹ کر جواب نہیں دیتا اور نہ اُن کے لئے ضرر اور نہ نفع پہنچانے کا مالک ہے ، اور پہلے ہی سے ہارون نے اُن سے کہا تھا

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۱﴾	ہاں وہ بڑا معاف کرنیوالا بڑا مہربان ہے ﴿۵۱﴾

بحراحمر میں جاتے ہیں وہ اُسی تنگ رستہ میں ہوکر گذرتے ہیں اس رستہ کو طے کرنے کے بعد بحراحمر ملتا ہے جو نہایت بڑا اور وسیع سمندر ہے جب اُس کے شمال کی طرف چلے جاؤ تو اخیر کو اُس کی دو شاخیں ہوگئی ہیں، اگر تم اپنے دائیں ہاتھ کو چت کر کر سب اُنگلیاں بند کرو اور صرف بیچ کی اُنگلی اور کلمے کی اُنگلی کھولدو اور دونوں کو پھیلا کرنا تو تو بحراحمر کی شاخوں کی بالکل صورت بن جاویگی کلمہ کی اُنگلی دائیں طرف رہیگی اور بیچ کی اُنگلی بائیں طرف اور اُن دونوں کے بیچ میں ایک مثلث کی صورت دکھائی دیگی، بحراحمر کی دائیں شاخ جو جانب شرق ہے چھوٹی ہے جیسے کہ کلمہ کی اُنگلی چھوٹی ہے اور بائیں شاخ جو جانب غرب ہے کسی قدر بڑی ہے جیسے کہ بیچ کی اُنگلی بڑی ہے اور یہ سمجھو کہ بیچ کی اُنگلی یعنی بڑی شاخ کے بائیں طرف مصر ہے اور اُن دونوں اُنگلیوں کے بیچ میں جو مثلث جگہ ہے وہ جگہ اُن جنگلوں اور پہاڑوں کی ہے جہاں بنی اسرائیل چالیس برس تک ٹکراتے پڑے پھرے اور اُسی جگہ کوہ سینا یا کوہ طور ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلّی ہوئی اور توریت ملی ✤

حاشیہ:

یا قوم انما فتنتم بہ وان ربکم الرحمان فاتبعونی واطیعوا امری قالوا لن نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ (طٰہٰ) فرجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا (طٰہٰ) قال موسیٰ لقومہ یا قوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ذٰلکم خیر لکم عند بارئکم (بقر) ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلۃ فی الحیوۃ الدنیا (اعراف)

قال یا قوم الم یعدکم ربکم وعدا حسنا افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (طٰہٰ) قال بئسما خلفتمونی من بعدی اعجلتم امر ربکم والقی الالواح واخذ براس اخیہ یجرہ الیہ قال ابن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعداء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین (اعراف)

کہ اے قوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم اس سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو اور بیشک تمہارا پروردگار رحم والا ہے میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو اُنہوں نے کہا کہ ہم اسی کی پوجا کیا کرینگے جب تک کہ موسیٰ لوٹ کر نہ آوے پھر موسیٰ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا غصہ میں بھرا ہوا افسوس کرتا ہوا موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے بنانے میں اپنی جانوں پر ظلم کیا تو توبہ کرو اللہ کے سامنے اور مار ڈالو اپنی جانوں کو کہ یہی تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک بہتر ہے، جن لوگوں نے بچھڑا بنایا قریب ہے کہ اُن کے پروردگار کا غصہ اُن تک پہنچیگا اور ذلت دنیا کی اس زندگی میں ✤

موسیٰ نے کہا کہ اے میری قوم کیا تم سے خدا نے وعدہ نہیں کیا تھا اچھا وعدہ اور کیا ایک لمبا زمانہ تم پر گذر گیا تھا بلکہ تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غصہ اُترے اس لئے تم نے میرے وعدے کے برخلاف کیا، موسیٰ نے کہا کہ بہت بُرا کیا تم نے میرے بعد کیا جلدی کی تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں اور پھینکدیا الواح توریت کو اور لیا اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اُس نے کہا کہ اے میرے ماں جائے ان لوگوں نے مجھ کو کمزور جانا تھا اور مجھ کو مار ڈالنے تھے پھر میرے دشمنوں کو مت خوش کرو اور مت کرو مجھ کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ ✤

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً

اور (یاد کرو) جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم تجھ پر یقین نہیں کرینگے، جب تک کہ ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں۔

جس زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں رہتے تھے اور فرعون منفتہ بادشاہ تھا اُس زمانہ میں اُس کا دارالسلطنت شہر رامیسس تھا اُس کے بائیں طرف تھوڑے فاصلہ پر دریائے نیل تھا اور دائیں طرف یعنی جانب شرق تین منزل کے فاصلہ پر بحر احمر کی بڑی شاخ تھی، حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو شہر رامیسس سے لیکر نکلے پہلی منزل "سکوت" میں ہوئی دوسری منزل "ایتام" میں تیسری منزل "فم الحیروت" میں مقام بحر احمر کی بڑی شاخ کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب غرب، اُس شاخ کی نوک کے پاس واقع تھا، جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا، توراتوں رات حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہم نے نقشہ میں نقطوں کا نشان کر دیا ہے پار اتر گئے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بسبب جوار بھاٹے کے جو سمندر میں آتا

انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (طہ) قالوا ما اخلفنا موعدک بملکنا ولکنا حملنا اوزارا من زینۃ القوم فقذفناھا فکذلک القی السامری (طہ) قال فما خطبک یا سامری قال بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتھا وکذلک سولت لی نفسی قال فاذھب فان لک فی الحیوۃ ان تقول لا مساس (طہ) ٭

مجھ کو یہ ڈر تھا کہ تو کہیگا کہ تو نے تفرقہ ڈالدیا بنی اسرائیل میں اور نہ انتظار کیا تو نے میری بات کا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے اختیار سے تیرے وعدہ کے خلاف نہیں کیا لیکن ہم قوم (قبطی) کے زیور کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھے پھر ہم نے اُس کو پھینکدیا اور اسی طرح پھینکدیا سامری نے پھر سامری نے بچھڑے کی مورت نکالی (جس میں سے آواز نکلتی تھی)۔ موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اُس نے کہا مجھے وہ بات سجھائی جو اُن کو نہیں سجھائی پھر میں نے سمیٹ کے اوس پاؤں تلے کے نشان کی مٹی لی پھر میں نے بچھڑے میں ڈالدی اور اسی طرح میرے دل نے مجھے اچھا بتایا موسیٰ نے کہا کہ دور ہو تجھکو اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو کہتا رہیگا کہ میرے پاس مت آؤ ٭

ولما سکت عن موسی الغضب اخذ الالواح وفی نسختھا ھدًی ورحمۃ للذین ھم لربھم یرھبون (اعراف) ثم اتینا موسی الکتاب تماما علی الذی احسن وتفصیلا لکل شیء وھدًی ورحمۃ لعلھم بلقاء ربھم یؤمنون (انعام) ٭

پھر جب موسیٰ کا غصہ تھما تو اُس نے الواح کو اُٹھا لیا اور اُس میں اُن کے لئے ہدایت اور رحمت تھی جو ڈرتے ہیں۔ پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو لوگ نیکی کرنے والے ہیں اُن پر نعمت پوری کرنے کو اور ہر چیز کی تفصیل بتانے کو اور ہدایت اور رحمت کرنے کو کہ شاید وہ اپنے پروردگار سے ملنے پر ایمان لاویں ٭

ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ وامنتم برسلی و

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا اور اُن میں سے بارہ سردار کھڑے کئے اور خدا نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم قائم کرتے رہوگے نماز اور دیتے رہوگے زکوٰۃ اور تم ایمان لاتے رہوگے میرے رسولوں پر اور

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۲﴾	پھر تم کو گرج نے پکڑ لیا اور تم دیکھتے تھے ﴿۵۲﴾

رہتا ہے اُس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب ہو جاتی تھی بنی اسرائیل پایاب و خشک راستہ سے راتوں رات پار اُتر گئے۔ یہی مطلب صاف اس آیت سے پایا جاتا ہے جو سورۂ دخان میں ہے کہ،، وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ،، جس کا ٹھیک مطلب یہ ہے۔ کہ چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت میں کہ اُترا ہُوا ہے۔ صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اُتر گئے اُس نے بھی اُن کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیاں اور سوار و پیادے غلط رستے پر سب دریا میں ڈالدئے اور وہ وقت پانی کے بڑھنے کا تھا لمحہ میں پانی بڑھ گیا جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑھتا ہے اور ڈباؤ ہو گیا جس میں فرعون اور اُس کا لشکر ڈوب گیا ✽

عزرتموهم واقرضتم الله قرضًا حسنا (مائدہ) ✽

اذقال موسٰی لقومه ان الله يأمركم ان تذبحوا بقرة قالوا اتتخذنا هزوا قال اعوذ بالله ان اكون من الجاهلين قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي قال انه يقول انها بقرة لا فارض ولا بكر عوان بين ذلك فافعلوا ما تؤمرون قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما لونها قال انه يقول انها بقرة صفراء فاقع لونها تسر الناظرين قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي ان البقر تشابه علينا وانا ان شاء الله لمهتدون قال انه يقول انها بقرة لا ذلول تثير الارض ولا تسقي الحرث مسلمة لا شية فيها قالوا الآن جئت بالحق فذبحوها وما كادوا يفعلون (بقر) يا قوم ادخلوا الارض المقدسة التي كتب الله لكم ولا ترتدوا على ادباركم فتنقلبوا خاسرين قالوا

تم مدد کرتے رہو گے اُن کی اور تم قرض دیتے رہو گے اللہ کو قرض حسنہ ✽

جب موسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو یہ حکم کرتا ہے کہ ذبح کرو بیل کو اُنھوں نے کہا کہ کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے موسٰی نے کہا کہ میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں جاہل قوم سے اُنھوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پوچھ کہ ہم کو بتلا دے کہ وہ کیسا بیل ہو کہا کہ وہ بیل نہ بوڑھا ہو اور نہ بچا سانہ سال ان دونوں کے بیچ میں کرو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے اُنھوں نے کہا کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ کہ بتلا دے کیسا ہو اُس کا رنگ موسٰی نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ بیل ڈہڈہے زرد رنگ کا ہو اُس کا رنگ خوش کرتا ہو دیکھنے والوں کو اُنھوں نے کہا کہ پوچھ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے کہ بتلا دے وہ کیسا ہے کہ ہم پر بیل مشتبہ ہو گئے ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پاویں گے۔ موسٰی نے کہا کہ خدا کہتا ہے وہ ایسا بیل ہو جو نہ جوتا ہو کہ زمین کو پھاڑے نہ کھیتی کو پانی دے اُس کے تمام اعضاء مسلّم ہوں اور اُس میں کوئی دھبّہ نہ ہو اُنھوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی پھر اُنھوں نے ذبح کیا اور کرتے نہیں لگتے تھے۔ اے لوگو تم اُس پاک زمین میں داخل ہو جو خدا نے تمہارے لئے لکھ دی ہے اور مت پھر واپنے پیٹھ کے پیچھے پھر ہو گے نقصان اُٹھانے والے اُنھوں نے

ثم بعثنٰکم من بعد موتکم	پھر ہم نے تم کو اُٹھایا تمہارے مردہ ہونے کے بعد

علمائے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ سو برس سے سمجھنا چاہئے اُن بزرگوں نے جو اپنے ہوش
سے بحر احمر اور اس کی شاخ کو جس میں سے حضرت موسےٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت
عمیق اور ایک قہار سمندر دیکھا ہے اور اُن کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کیسا ہی بڑا جوار بھاٹا
آوے وہ جگہ کبھی پایاب نہیں ہوسکتی اس لئے اُنہوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت
اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتے تھے اُلٹ پلٹ
کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنایا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دے ٹھیرا دیا،
مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جب بنی اسرائیل نے عبور کیا بحر احمر ایسا
قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے گو اُس زمانہ کا صحیح جغرافیہ ہم کو نہ ملے مگر بہت پُرانا جغرافیہ جو بطلیموس
نے بنایا تھا مع اُس کے نقشجات کے جو بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق بنائے گئے ہیں خوش قسمتی
سے ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں بحر احمر کا بھی نقشہ ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بطلیموس
کے زمانہ تک بحر احمر میں تیس چھوٹے بڑے جزیرے موجود تھے اور یہ صاف دلیل اس بات کی
ہے کہ اُس زمانہ میں بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے یا جیسا کہ ہمارے علمائے اسلام بارہ سو

یا موسیٰ ان فیہا قوما جبارین وانا
لن ندخلہا حتی یخرجوا منہا فان
یخرجوا منہا فانا داخلون
قال رجلان من الذین یخافون
انعم اللہ علیہما ادخلوا علیہم
الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون
وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین
قالوا یا موسیٰ انا لن ندخلہا ابدا
ما داموا فیہا فاذہب انت وربک
فقاتلا انا ہٰہنا قاعدون قال
رب انی لا املک الا نفسی واخی
فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین
قال فانہا محرمۃ علیہم اربعین سنۃ
یتیہون فی الارض فلا تاس علی القوم الفاسقین
(مائدہ)

کہا اے موسیٰ اُس میں تو بہت زبردست قوم رہتی ہے
ہم ہرگز اُس میں نہیں جائینگے جب تک کہ وہ اُس میں سے نکل
جاویں جب وہ اُس زمین سے نکلجاوینگے تب ہم اُس
میں داخل ہونگے اُن میں سے دو آدمیوں نے کہا جو خدا سے
ڈرتے تھے جن پر خدا نے نعمت کی تھی کہ اے لوگوں جا گھسو
اس قوم کے دروازہ میں جب تم جا گھسوگے تو تم ہی غالب ہوگے
اور خدا ہی پر بھروسا کرو اگر تم ایمان والے ہوؤ ہو۔ بولے کہا کہ اے
موسیٰ ہم ہرگز اس میں نہیں گھسینگے جب تک کہ وہ اُس میں ہیں
تو جا اور تیرا پروردگار دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ
نے کہا اے میرے پروردگار مجھ کو اختیار نہیں مگر اپنی جان
پر اور اپنے بھائی پر پھر ہم میں اور اس بدکار قوم میں فرق کر۔
خدا نے فرمایا کہ وہ حرام کردی گئی ہے اُس پر چالیس برس
تک وہ ٹکراتے پھرینگے زمین میں اور تو رنج مت کر اس
بدکار قوم پر ❖

شاید تم شکر کرو ﴿۵۳﴾	لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

برس سے اُس کو دیکھتے آئے ہیں۔ بحر احمر کی اس حالت پر خیال کرنے سے بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اُترے بلاشبہ جوار بھاٹے کے سبب رات کو پایاب



وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ	اور چھادیا ہم نے تم پر بادل ،

اور دن کو عمیق ہو جاتا ہو گا ، مزید توضیح کے لئے بطلیموس کے جغرافیہ میں سے بعینہ بحر احمر کے نقشہ کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں یہ جغرافیہ ہمارے پاس اصل یونانی زبان میں جس میں بطلیموس نے لکھا تھا مع لیٹن ترجمہ کے موجود ہے جو ۱۶۱۸ء میں لوئیس سیزدہم شاہ فرانس کے عہد میں چھپا تھا اُس میں وہ تمام جزیرے جو بحر احمر میں موجود تھے مندرج ہیں ۔ مؤرخین کے قول کے بموجب بنی اسرائیل سنہ عیسوی سے دو ہزار پانسو تیرہ برس قبل بحر احمر کی شاخ سے اُترے تھے اور بطلیموس جس نے جغرافیہ لکھا اور جس کو گلا دیس ٹالمی کہتے ہیں سنہ عیسوی کی دوسری صدی میں تھا پس بنی اسرائیل کے عبور کرنے کے دو ہزار سات سو برس بعد تک وہ جزیرے موجود تھے ۔ یہ بطلیموس یونانی تھا ، مگر مصر میں رہتا تھا اور اس لئے بحر احمر کا جو حال اُس نے لکھا ہے زیادہ اعتبار کے لائق ہے ۔ سمندر کے جزیرے مدت تک نکلے رہتے ہیں اور پھر کسی زمانہ میں اُن اسباب سے جن کا ذکر علم جیالوجی[۱] میں ہے دفعۃً زمین میں بیٹھ جاتے ہیں اور جہاں لوگ بستے تھے اور جن پایاب مقامات پر لوگ چلتے تھے وہاں دفعۃً میلوں گہرا پانی ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح بطلیموس کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں یہ جزیرے بھی جو بحر احمر میں تھے ، غائب ہو گئے ہیں اور اب ہم کو اتنا بڑا گہرا سمندر دکھائی دیتا ہے مگر موسیٰ کے عہد میں ایسا نہ تھا اور اس بات پر یقین کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں کہ حضرت موسیٰ کو اس مقام پر سمندر کے پایاب ہو جانے کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے یہ رستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا کیونکہ سمندر کے پار ایسے جنگل و پہاڑ تھے جس میں فرعون کو لشکر لیجانا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرنا غیر ممکن تھا ✤

اسمائے جزیرہ ہائے بحر احمر

۱- تھی جینس ✤	۱۱- جریکم ✤	۲۱- اگبن تھیس ✤
۲- ونرس ✤	۱۲- سیٹی رورم ✤	۲۲- کیم بسنا ✤
۳- زجبنیا ✤	۱۳- کیٹی تھری ✤	۲۳- مگیرنیا ✤
۴- اگیٹی عفونس ✤	۱۴- میرونس ✤	۲۴- ارنیان ✤
۵- ڈیمونم ✤	۱۵- تھرب ڈی ڈیس ✤	۲۵- ملیاکی ✤
۶- اسٹارٹی ✤	۱۶- ساکرٹیٹیس ✤	۲۶- بیکائی ✤
۷- یالی ٹیچ ✤	۱۷- مجورم ✤	۲۷- ایڈیپی ✤
۸- ایراپلیڈس ✤	۱۸- گارڈی بیٹڈ ✤	۲۸- ڈایو دورائے ✤
۹- جبسی لیٹس ✤	۱۹- ڈیف نین ✤	۲۹- پیٹیس ✤
۱۰- گوما ڈیرم ✤	۲۰- ایری ✤	۳۰- اسی ڈس ✤

۱؎ علم طبقات الارض ۔ [illegible]

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ	اور اُتارا ہم نے تم پر مَن و سلوے، کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو کچھ ہم نے تم کو دی ہیں

(۵۱) (عجل) بچھڑا بنانے کا واقعہ اُس وقت ہوا تھا، جب کہ حضرت موسیٰ چالیس دن رات پہاڑ پر جا کر رہے تھے، بنی اسرائیل نے بچپن سے مصریوں میں پرورش پائی تھی، اور دیکھا کرتے تھے کہ وہ ساری قوم بتوں کی اور جانوروں کی پرستش کرتی ہے، مصری بندر اور سانپ اور بیل اور اور بہت قسم کے جانوروں کی پوجا کیا کرتے تھے، جب بنی اسرائیل سمندر کے پار ہوئے تو وہاں بھی اُنھوں نے بتوں کی پرستش کرتے ہوئے لوگوں کو پایا، اور موسیٰ سے کہا کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے (یہ قصہ سورۂ اعراف میں ہے) گمان غالب ہوتا ہے کہ وہ لوگ بچھڑے ہی کی مورت کی پوجا کیا کرتے ہونگے، اور اسی کی نقل پر بنی اسرائیل نے بھی بچھڑے کی مورت بنائی تھی، جس کے سبب خدا کی خفگی ہوئی *

(فَاقْتُلُوْا) اس آیت سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ کو مار ڈالا تھا کیونکہ یہ کہنا کہ "مار ڈالو اپنے آپ کو" حضرت موسیٰ کا قول ہے اور یہ کہنا اسی طرح کا کہنا ہے، جیسے کوئی بزرگ کسی کو نفرین کرتے وقت کہے کہ، "ڈوب مر ایسا کرنے سے تو تیرا مر جانا بہتر ہے" پس بنی اسرائیل پر جو حضرت موسیٰ کے غصہ کے یہ الفاظ ہیں خدا نے اُن کو اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا، نہ اُن میں کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالا تھا۔ یہ مطلب اِس آیت کے پچھلے حصہ سے جس میں معاف کر دینے کا ذکر ہے زیادہ تر صاف ہو جاتا ہے، کیونکہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اُنھی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ "پھر خدا نے تم کو معاف کیا" *

(۵۲) (نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً) انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے کی خواہش تین طرح پر پیدا ہوتی ہے اُس کا حال اور اوصاف سننے سے، یا دل میں کسی خاص قسم کا ذوق و شوق پیدا ہو جانے سے، یا اُس کا حال کہنے والے کی بات پر یقین نہ کرنے سے، موسیٰ کو بھی خدا کے دیکھنے کا شوق ہوا، مگر وہ شوق دوسری قسم کا تھا جس کے غلبہ میں انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، اور ہونی اور نہ ہونی بات کہ اُٹھتا ہے، بنی اسرائیل نے بھی خدا کا دیکھنا چاہا، مگر یہ اُن کا سوال تیسری قسم کا تھا، وہ موسےٰ کی اس بات پر کہ خدا سے پروردگار عالم موجود ہے اور اُس نے موسےٰ کو اپنا پیغمبر کیا ہے یقین نہیں لاتے تھے اور اس بناء پر اُنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو دکھا دے، جب تک ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیوینگے تجھ پر ایمان نہ لاوینگے، حضرت موسےٰ اپنے شوق کے سبب جس میں انسان کو ذہول ہو جاتا ہے بھول گئے کہ خدا

وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا	اور اُنھوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا آپ نقصان کرتے تھے ﴿۵۷﴾ اور (یاد کرو جب ہم نے کہا کہ اس شہر میں جاؤ پھر اُس میں سے سیر ہو کر کھاؤ جہاں چاہو ،

ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیسکتا ، اور بنی اسرائیل نے اپنی حماقت سے یہ چاہا کہ علانیہ خدا کو ہم دیکھ لیں ، اور نہ سمجھے کہ کسی کو خدا اپنے تئیں نہ کسی کو دکھا سکتا ہے ، اور نہ کوئی خدا کو دیکھ سکتا ہے ، ہر کوئی اُس کی قدرت کا کرشمہ دیکھتا ہے ، اور اُسی سے اُس کی ذات کے موجود ہونے پر یقین لاتا ہے ❖

(صاعقہ) صاعقہ کے معنی لغت میں ، موت ، کے بھی ہیں اور ، عذاب مہلک ، کے بھی ہیں ، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس عذاب سے کوئی ہلاک ہوئے بغیر رہے ہی نہیں ، اور عذاب یا بلا آنے کی سنسناہٹ اور گڑگڑاہٹ اور کڑک کے معنی بھی آئے ہیں اور بجلی اور آسمان پر سے گرنے والی آگ کے معنی بھی ہیں ، اور ،، صعق ،، بکسر العین کے معنی ہیں ،، غسی علیہ ،، یعنی بیہوش کیا گیا ❖

اب دیکھنا چاہئے کہ اس جگہ ،، فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ،، کے کیا معنی ہیں ، موت ، کے معنی تو یہاں ہو ہی نہیں سکتے ، اِس لئے کہ ، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ، کا مطلب غلط ہو جاتا ہے کیونکہ موت کی نسبت واسم سظرون نہیں کہہ سکتے ، امام فخرالدین رازی بھی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں ، صاعقہ ، کے معنی موت کے نہیں ہیں کیونکہ موت کی نسبت ، سظرون ، نہیں آسکتا اور اُس کے سوا خدا نے سورۂ اعراف میں فرمایا ہے کہ ،، وخرّ موسیٰ صعقا ،، اور پھر فرمایا ہے ،، فلمّا افاق ،، اور افاقہ موت سے نہیں ہوتا بلکہ غشی سے ہوتا ہے ۔ سورۂ اعراف میں ، صاعقہ ، کی جگہ ، رجفہ ، فرمایا ہے جس کے معنی کپ کپاہٹ کے ہیں غرضکہ اس جگہ ، صاعقہ ، کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ ٹھیک معنی ، گرج ، اور ، گڑگڑاہٹ ، کے ہیں خواہ وہ گرج بجلی کی ہو خواہ وہ گڑگڑاہٹ بادل کی ہو یا کسی آتشیں پہاڑ کی ۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب کہ اسی آیت میں ہے کہ ،، ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ،، تو یہ ایک قوی ثبوت اس بات کا ہے کہ یہاں ، صاعقہ ، کے معنی موت کے ہیں ۔ مگر مفسّرین اور خصوصاً امام فخرالدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی ، بعث ، کا اطلاق لا بعد الموت پر بھی ہوتا ہے جیسے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ ،، فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ ،، پس ، بعثنا ، کے لفظ سے تو ، صاعقہ ، کے معنی موت کے لینے پر استدلال نہیں

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۵﴾	اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے گھسو اور کہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں، ہم تمہارے قصور معاف کر دینگے اور اچھے لوگوں کو زیادہ دینگے ﴿۵۵﴾

ہوسکتا ہے لفظ ، موت ، کا اس کی نسبت مفسرین نے نہایت سہل رستہ اختیار کیا ہے ، جو ہم کو نہایت ہی مشکل اور پیچدار معلوم ہوتا ہے ، اُنہوں نے فرمایا کہ محققین کا یہ قول ہے کہ ، صاعقہ ، سے مراد تو سبب موت ہے ، اور موت کے معنی موت ہی کے ہیں ، خدا نے اُن لوگوں کو جو خدا کو دیکھنے گئے تھے صاعقہ سے جو سبب اُن کی موت کا ہؤا مار ڈالا ، اور پھر حضرت موسیٰ کی دُعا سے اور گڑگڑا کر یہ کہنے سے ، کہ یہ تو ستر کے ستر مر گئے اب بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دونگا ، اور میری نبوت کی گواہی کون دیگا ، خدا نے اُن کو پھر زندہ کر دیا +

مگر میری سمجھ میں خدا ئے پاک کا کلام ایسا بودا نہیں ہے ، بلکہ جیسا اُس کا قانون قدرت مستحکم اور مضبوط ہے ، ویسا ہی اُس کا کلام بھی مضبوط ہے ، جب کہ ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ صاعقہ کے معنی ، موت ، کے نہیں ہیں ، بلکہ اس مقام پر ہو بھی نہیں سکتے ، اور ، بعث ، کا اطلاق ، لا بعد الموت ، پر بھی آتا ہے تو ہم لفظ موت ، کو اُس کے حقیقی معنوں پر یعنی بدن سے جان نکل جانے پر اطلاق نہیں کر سکتے ، بلکہ مُردے کے مانند ہو جانے پر اطلاق کرتے ہیں ، اور اُس کی دلیل خود قرآن مجید میں موجود ہے ، اس لئے کہ جو واقعہ اِس مقام پر بیان ہؤا ہے ، وہی واقعہ سورۂ اعراف میں بھی آیا ہے ، اور وہاں یہ فرمایا ہے ، کہ ،، فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ " یعنی بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی جو خدا کے دیکھنے کے لئے گئے تھے ڈر کے مارے کانپنے لگے تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی اُن کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا ' +

اِس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اُن کے مرنے تک نوبت نہ پہنچی تھی ، یا بیہوش ہو گئے تھے یا اُن کی حالت مُردے کیسی ہو گئی تھی ، اور اسی سبب سے یہاں اُن پر مردہ کا اطلاق کیا گیا ہے ، علاوہ اس کے حضرت موسیٰ پر بھی پروردگار کی تجلّی ہوئی تھی ، جس کے سبب پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا ، وہاں یہ لفظ ہیں کہ ،، وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ،، یعنی موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑا ، سورہ احزاب[1] میں خود خدا تعالےٰ نے خوف کی حالت کو موت کی بیہوشی کی حالت سے تشبیہ دی ہے ، پس ان سب آیتوں کے ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر بھی یہی حالت گذری تھی +

[1] فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (احزاب) آیت ۱۹ ۰

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۶﴾	پھر ظالموں نے اُس کے سوا جو ہم نے اُن سے کہی تھی بات بدل دی، پھر ہم نے اُن پر جنہوں نے نا انصافی کی تھی آسمان سے بُرائی بھیجی اس لئے کہ وہ بُرے کام کرتے تھے ﴿۵۶﴾

"موت" کے لفظ کا نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے، امام فخر الدین رازی اور صاحب تفسیر ابن عباسؓ نے سورۂ زمر کی تینتالیسویں آیت میں، لفظ "موت" کو بمعنی "نوم" قرار دیا ہے اور "حین موتها" کی تفسیر "حین منامها" کی ہے، اور قرآن مجید میں رنج میں پڑے رہنے پر بھی موت کے لفظ کا استعمال ہؤا ہے جہاں سورۂ آل عمران میں فرمایا ہے کہ "قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ" یعنی اپنے غصہ سے مرجاؤ یعنی اس میں مبتلا رہو، ڈھے ہوئے شہر، غیر آباد یا فصل گذری ہوئی زمین پر بھی موت کا استعمال ہوتا ہے، بے جان یا معدوم شے پر بھی موت کا لفظ بولا جاتا ہے، جہاں فرمایا ہے کہ "كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ" اور اور جگہ فرمایا ہے کہ "يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ" غرضکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس مقام پر لفظ "موتکم" سے جو قرآن مجید میں آیا ہے اُن لوگوں کے فی الحقیقت مرجانے پر استدلال نہیں ہوسکتا ✦

یہ تمام واقعات موسیٰ و بنی اسرائیل پر سینا کے مقام میں گذرے تھے، وہاں ایک سلسلہ پہاڑوں کا ہے جس کو "طورسینا" یا "طور سینین" کہتے ہیں، اور کبھی صرف "طور" ہی اُس کا نام لیتے ہیں، کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں وہ کوہ آتش فشاں تھا، جب بنی اسرائیل نے حضرت موسےٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں، تو وہ بجز اُس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے اور کچھ اُن کو نہیں دکھا سکتے تھے، بس وہ اُن کو اُس پہاڑ کے قریب لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور شور کی آواز اور پتھروں کے اُڑنے کے خوف سے وہ بیہوش یا مردے کی مانند ہوگئے، خدا تعالےٰ اُن تمام کاموں کو جو اُس کے قانون قدرت سے ہوتے ہیں خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے، جن کے منسوب کرنے کا بلاشبہ وہ مستحق ہے، اسی طرح ان واقعات عجیبہ کو بھی اس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے ✦

اِس بات کے آثار کہ کوہ سینا درحقیقت آتش فشاں تھا، اب تک پائے جاتے ہیں، اور ہر شخص اب بھی جاکر دیکھ سکتا ہے، ایک بہت بڑا عالم شخص یعنی کپتان اسٹینلی حال میں بطور سیاحت اُس وادی میں گئے تھے جہاں سے حضرت موسےٰ اور بنی اسرائیل نے گذر کیا تھا،

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ

اور (یاد کرو اُس وقت کو، جب موسٰی نے اپنی قوم کے لئے پانی چاہا، تو ہم نے کہا کہ چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس چٹان پر، اُس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے، بیشک جان لیا ہر شخص نے اپنا گھاٹ، کھاؤ اور پیو سدا کے دئے ہوئے رزق میں سے اور مت پھرو زمین میں (یعنی ملک میں) فساد مچاتے ﴿۵۷﴾ اور (یاد کرو) جب تم نے کہا کہ اے موسٰی ہم ایک کھانا کھانے پر صبر نہ کریں گے، بس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے مانگ کہ پیدا کرے ہمارے لئے اُن چیزوں میں سے جن کو زمین اُگاتی ہے اُس کے ساگ اور اُس کی ککڑی اور اُس کے گیہوں اور اُس کے مسور اور اُس کے پیاز میں سے،

اُنھوں نے اُس پہاڑ کا حال اس طرح پر لکھا ہے کہ، "چٹانوں کی راہ سے جو بطور زینہ کے بنی ہوئی تھیں ہم ایک وادی میں پہنچے جو سُرخ پتھر کے پہاڑوں کے درمیان تھا یہاں پر عجیب وغریب پہاڑ دیکھنے میں آئے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرخ و سیاہ مادہ کی گرم نہریں اُن پر بہتی ہیں۔ درحقیقت آتشی مادہ اوپر کو آیا تھا جب کہ وہ زمین سے اُٹھے تھے، یہ راستہ ایسی جگہ ہو کر گذرتا تھا جہاں بجز جلے ہوئے مادوں اور خاکستر کے اور کچھ نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی سنار ڈھالنے کے کارخانہ میں ڈھیر ہوتے ہیں، یہاں اکثر ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں جن کو کوئی نیا آدمی آتش فشاں پہاڑ کے آثار تصور کرے، لیکن یہ غلط فہمی ہے، جلے پہاڑوں کی مانند جو بڑے بڑے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں وہ صرف لوہے کے ریزے ہیں جو بھربھرے پتھروں کی بناوٹ میں ملے ہوئے ہیں۔ سُرخی مائل پتھر کی چٹانوں میں جو آتشی عمل کے آثار پائے جاتے ہیں، وہ اُن کے ابتدائی اُٹھان سے متعلق ہیں، نہ کسی بعد کے انقلاب سے، ہر جگہ پانی کے عمل کے آثار ہیں آگ کے کہیں نہیں ہیں +

کینن سٹیلی بہت بڑے پادری اور عیسائی مذہب کے پیشوا ہیں، عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ درحقیقت خدا ہی آگ کی صورت میں پہاڑ پر اُترا تھا، اس لئے انھوں نے اپنی تحریر میں اُس پہاڑ کو آتشیں پہاڑ کہنے سے بہت بچایا ہے، مگر جو شے کہ موجود ہے اُس کو کوئی شخص ہیر پھیر کر بیان کرنے سے معدوم نہیں کر سکتا، خود توریت میں جو کچھ اس پہاڑ کی نسبت بیان ہوا ہے (اگر صحیح تسلیم کیا جاوے) تو کچھ شبہ نہیں رہتا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ تھا، کتاب خروج باب ۱۹ میں

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ	موسیٰ نے کہا کہ کیا بدلتے ہو اُس کو جو گھٹیا ہے اُس سے جو اچھا ہے، اُتر پڑو کسی شہر میں پھر بیشک تمہارے لئے وہ چیز ہے جو تم مانگتے ہو، اور ڈالی گئی اُن پر ذلت اور مسکنت اور مستحق ہوئے اللہ کے غصہ کے،

میں لکھا ہے،، کہ بوقت طلوع صبح رعدہا و برقہا و غمامۂ مظلمہ بالائے کوہ نمایاں شد و آواز کرنا بحدے شدید شد کہ تمامی قومے کہ در اُردو بودند لرزیدند ✦ ✦ و تمامی کوہ سینی را دود فرا گرفت ✦✦ و دودش مثل دود تنور متصاعد بود و تمامی کوہ بغایت متزلزل شد، یہ تمام حالتیں وہ ہیں جو کوہ آتش فشاں میں واقع ہوتی ہیں، اور اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں وہ آتش فشاں تھا، اور کپتان ایٹلی کی یہ تاویل کہ وہ نشانیاں اُس پہاڑ کی بناوٹ ہی کی ہیں صحیح نہیں ہوسکتی ✦

خدا کی تجلی ہر چیز میں ہے جس کو اُس نے اپنی قدرت کاملہ سے بنایا اور پیدا کیا، ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ، فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّنَا عَلَی الْجَبَلِ، فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّنَا عَلَی الْبَحْرِ، فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّنَا عَلَی الْاِنْسَانِ، فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّنَا عَلَی الْحِمَارِ، فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّنَا عَلَی الْبَعُوْضَةِ، وَمَا فَوْقَهَا فقد وقع كذا، مگر کسی مادی یا فانی صورت میں نہ خدا آسکتا ہے نہ سما سکتا ہے، پس ہم توریت کے اس لفظ پر کہ، خداوند در آتش بر آں نزول نمود،، یقین نہیں لا سکتے گو کپتان ایٹلی کو یقین ہو، ہاں اگر ان لفظوں کے معنی بھی تجلّی اور ظہور قدرت کے لئے جاویں تو پھر مقام انکار نہیں رہتا ✦

(۵۴) (وَظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ) توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کی چھاؤں ہونے کا واقعہ عجب طرح سے لکھا ہے، کہ بادل تمام دن بنی اسرائیل[۱] کو راہ دکھانے کے لئے اُن کے آگے آگے چلتا تھا، اور جہاں ٹھیر جاتا تھا، وہاں بنی اسرائیل مقام کرتے تھے، اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا۔ مگر اس پر کیونکر یقین ہوسکتا ہے جب کہ چالیس برس تک بنی اسرائیل کو منزل مقصود تک پہنچنے کا رستہ نہیں ملا ۔۔ ہمارے علمائے مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہے اور اس آیت کی تفسیر میں ایسی قسم کی باتیں جن کا اشارہ تک اس آیت میں نہیں ہے بیان کی ہیں ✦

قرآن مجید سے بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ بادل کا پھرنا نہیں معلوم ہوتا، اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آجانے سے خدا نے

[۱] دیکھو کتاب خروج باب ۱۴ درس ۱۹ و ۲۰ و باب ۴۰ درس ۳۴ - ۳۸ ✦

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۵۸﴾	اور یہ اِس لئے کہ وہ نہ مانتے تھے اللہ کی نشانیوں کو، اور مار ڈالتے تھے پیغمبروں کو ناحق، اور یہ اس لئے ہوا کہ اُنہوں نے نافرمانی کی، اور وہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے ﴿۵۸﴾

اُن کی تکلیف کو دُور کر دیا، جس کا بطور ایک احسان کے ذکر کیا ہے۔ بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ جو امور موافق قانون قدرت کے ظہور میں آتے ہیں، اُن کو نہ معجزہ سمجھتے ہیں، نہ احسان جتلانے یا ماننے کے قابل جانتے ہیں، اور اس لئے اس میں بالطبع ایسی باتیں شامل کر لیتے ہیں، جو قانون قدرت سے خارج ہوں، حالانکہ خدا تعالٰے نے تمام قرآن مجید میں جا بجا بندوں پر اُنہی باتوں سے اپنا احسان جتلایا ہے، اور اُنہی کو بطور معجزہ کے سلایا ہے، جس کو اُس نے اپنی قدرت کاملہ سے، موافق قانون قدرت کے پیدا کیا ہے +

جب بنی اسرائیل بحر احمر کی شاخ کو پار کر گئے، جس کا پانی بسبب ہوا بھاٹے کے اُترتا چڑھتا رہتا تھا، تو اُس پار پتھر اور ریگستان کا ایک مسطح بیابان ہے، وہاں اکثر ریگ کا طوفان رہتا ہے، جو اُس مُلک کے ساتھ مخصوص ہے، اور حال کے سیاحوں نے بھی اُس کو دیکھا ہے، اس ریت کے میدان میں دھوپ کی شدت سے بنی اسرائیل کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی، خصوصًا اس وجہ سے کہ ریت بھی بھوبل کی مانند گرم ہوگی جس پر چلنا اور بیٹھنا نہایت مشکل ہوگا، ایسے وقت میں ابر کا آجانا بلاشبہ بنی اسرائیل کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی، جس کو اس مقام پر بطور احسان کے خدا نے یاد دلایا ہے +

(منّ وسلوٰی) منّ، ایک چیز ہے جو بطور ترنجبین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے، اور، سلوٰے، بٹیر کی قسم کا جانور ہے جو اُس جنگل میں جہاں بنی اسرائیل گئے تھے بکثرت پایا جاتا تھا، اور وہاں وہی اُن کی غذا تھی، پس اُسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے، باقی عجائبات، منّ، کے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت سے انکار کرنا، اُن کا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، گو مفسرین نے اور انبیا کے قصے لکھنے والوں نے یہودیوں کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں اُن کا ذکر کیا ہے +

حال کے سیاحوں نے بھی اُس جنگل میں، منّ، کو پایا ہے، کپتان اسٹینلی لکھتے ہیں، کہ چشمہ مرہ سے گذر کر دو وادیاں دیکھیں جس میں سے ایک یقینًا ایلم ہوگی۔ عام صورت اس وسیع میدان کی یہ تھی کہ ایک ریگستان تھا اور جا بجا پانی کے سے راستے جیسے کوئی دریا خشک ہو جاتا ہے بنے ہوئے تھے، اُن وادیوں کے راستہ راستہ جا کر عجیب سیاہ وسفید پہاڑ ملتے ہیں۔ یہ بیابان بعیر

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ھَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۵۹﴾	اس میں کچھ شک نہیں کہ جو ایمان لائے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے ہیں اور عیسائی اور صابئین جس نے یقین کیا اللہ اور اخیر دن پر اور اچھے عمل کئے تو اُن کے لئے اُن کی مزدوری اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور نہ اُن کو کچھ اندیشہ ہی اور نہ وہ غمگین ہونگے ﴿۵۹﴾
وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّاذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۰﴾	اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے تمہارا قول لیا اور ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا کہ پکڑو جو چیز کہ تم کو دیجاتی ہے مضبوطی سے اور یاد رکھو جو کچھ اُس میں ہے تاکہ تم پرہیزگار رہو ﴿۶۰﴾

درخت اور گھاس کے تھا، لیکن اُن دو وادیوں میں جن پر ایلیم کا شبہ ہوتا ہے، درخت اور جھاڑیاں موجود تھیں۔ یہاں کے کھجور کے درخت چھوٹے چھوٹے تھے، اور یہاں پر، ٹمرسک، کے درخت بھی تھے۔ جن کے پتّوں پر وہ شے پائی جاتی ہے جس کو اہل عرب، منّ، کہتے ہیں ✣

﴿۵۵﴾ وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا، اِس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ حضرت موسیٰ کے وقت کا قصّہ نہیں ہے، بلکہ بنی اسرائیل کا حال ہے، جب کہ وہ حضرت یوشع کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تھے اُس شہر کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے، مگر قدیم نام اُس کا، یریحو، ہے جس کو یونانی میں، جریکو، کہتے ہیں اور مسلمان مفسّروں نے اُس کو، اریحا، لکھا ہے ✣

(وَادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا) سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ کرنا نہیں ہے جس میں ماتھا زمین پر ٹیکنا ہوتا ہے، بلکہ خشوع وخضوع سے خدا کا شکر کرتے ہوئے داخل ہونا مراد ہے، تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ،، اراد به الخضوع وهو الاقرب،، یعنی سجدہ سے مراد عاجزی ہے اور یہی معنی اس جگہ زیادہ اچھے ہیں ✣

﴿۵۶﴾ (فَبَدَّلَ) اِس تبدیل سے کسی لفظ کا بدل دینا مُراد نہیں ہے، کیونکہ اُن کو الفاظ نہیں بتائے گئے تھے، بلکہ استغفار یعنی گناہوں سے معافی چاہنے کا حکم تھا، مگر اُنہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا، اور توبہ و استغفار کی کچھ پرواہ نہیں کی، بلکہ فتح کے سبب مغرور و متکبّر ہوگئے، امام فخرالدین رازی نے بھی یہ معنی اختیار کئے ہیں، چنانچہ اُنہوں نے لکھا ہے کہ ،، لما امروا بالتواضع وسوال المغفرة لم یمتثلوا امر اللہ ولم یلتفتوا الیه،، یعنی جب کہ اُن کو تواضع اور استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو اُنہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی، اور اُس پر التفات نہ کیا، اور بیضاوی میں بھی یہی مطلب تسلیم کیا گیا ہے ،، بدلوا بما امروا به من التوبة والاستغفار

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۱﴾	پھر تم پھر گئے اُس کے بعد، پھر اگر تم پر خدا کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ٹوٹے میں پڑنے والوں میں سے ہوتے، اور بیشک تم اُن کو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے سبت کے دن زیادتی کی پھر ہم نے اُن کو کہا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل و خوار ﴿۶۱﴾

طلب ما لیس ھو من اعراض الدنیا"، یعنی اُنہوں نے بدل دیا حکم توبہ و استغفار کا جو اُن کو دیا گیا تھا دنیاوی چیزوں کے چاہنے سے جس کے وہ خواہشمند تھے +

﴿۵۷﴾ (فانفجرت) اس آیت میں بھی ایک امر بحث کے لائق تھا کہ پانی کے بارہ چشمے کیونکر پیدا ہوئے تھے اور اس بحث کو ہم نے سینتالیسویں آیت کی تفسیر میں بالاستیعاب بیان کیا ہے۔ پہاڑی ملک کو اہل عرب حجر کہتے ہیں جیسے کہ عرب الحجر یعنی عرب کا پہاڑی حصہ اسی طرح "فاضرب بعصاک الحجر" میں لفظ حجر کا استعمال ہوا ہے، بحر احمر کی شاخ کو عبور کرنے کے بعد ایک وادی ملتا ہے جس کا قدیم نام، ایشام ہے وہاں پانی نہیں ملتا، توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت تلخ تھا اور پی نہیں سکتے تھے اسی لئے اس کا نام، مرہ، رکھا ہے، حال کے زمانہ کے سیاحوں نے بھی وہاں ایک چشمہ پایا ہے جس کو وہ، مرہ، خیال کرتے ہیں، یہی مقام ہے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے پانی مانگا تھا اس مقام کے پاس پہاڑیاں ہیں جن کی نسبت خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ "فاضرب بعصاک الحجر" یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل، اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کو توریت میں، ایلم، لکھا ہے وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے، جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراروں میں سے جاری ہوتے ہیں جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ "فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا"، یعنی اُس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے، اگر ہم توریت کی عبارت پر یقین کریں تو اس سے بھی یہی پایا جاتا ہے اور اُس کی یہ عبارت ہے کہ[۵۸] "بعد ازاں بہ ایلم آمدند و در انجا دوازدہ چشمۂ آب یافتند و ہفتاد درخت خرما بود و در انجا بہ پہلوئے آب اردو زدند" +

یہ مقام اب بھی موجود ہے، اور سیاحوں نے دیکھا ہے، مگر اب وہاں پانی کے چشمے نہیں بہتے، کیونکہ پہاڑی چشمے انقلاب زمانہ سے سوکھ جاتے ہیں، جیسے کہ مکہ معظمہ میں زمزم

[۵۸] کتاب خروج باب ۱۵ درس ۲۸ +

پھر ہم نے اس واقعہ کو اُس قوم کے لئے جو اُس واقعہ کے زمانہ میں تھی اور اُس کے لئے جو اُس واقعہ کے بعد آویگی بطور عبرت کے بنادیا اور بطور نصیحت کے پرہیزگاروں کے لئے (۶۲)	فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۶۲)

کا چشمہ خشک ہوگیا ہے، مگر ایسے مقاموں کو ہمیشہ لوگ مقدّس سمجھتے ہیں، اور اُس کے یادگار یا نشان قائم رکھنے کو وہاں کنوئیں کھود دیتے ہیں، جس طرح کہ مکہ معظمہ میں چاہ زمزم کھودا گیا ہے اُس مقام پر بھی جہاں حضرت موسےٰ کو بارہ چشمے پانی کے ملے تھے، لوگوں نے کسی زمانہ میں کنوئیں کھود دے ہیں، اور اب وہاں سترہ کنوئیں موجود ہیں، اور وہ مقام عیونِ موسیٰ کے نام سے مشہور ہے، اس مقام پر بھی "تمرسک" کے درخت ہوتے ہیں جن کے پتوں پر "منّ" جم جاتا ہے +

(۵۸) (وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى) اس آیت کی تفسیر میں مفسروں نے دو زمانے کی جدا جدا باتوں کو خلط ملط کر دیا ہے، یہ بہت لمبی آیت ہے اور اس کے جداگانہ دو حصّے ہیں، ایک حصّہ اُس سوال و جواب کا ہے جو بنی اسرائیل نے موسےٰ سے کیا تھا، اور دوسرا حصّہ اُن واقعات کا ہے جو بعد حضرت موسیٰ بلکہ اُس سے بھی بہت زمانہ کے بعد بنی اسرائیل پر واقع ہوئے تھے +

جن جنگلوں اور میدانوں میں بنی اسرائیل پڑے پھرتے تھے، وہاں بجز جنگل کے جانوروں کے شکار کے یا اُس مویشی کے گوشت کے جو بنی اسرائیل کے ساتھ تھے اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ ہوتی تھی، اور ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بنی اسرائیل دق ہوگئے تھے، جس کی شکایت اُنہوں نے حضرت موسیٰ سے کی، اور زمین کی پیداوار کھانے کو مانگی، جو شکار کے گوشت یا جانوروں کے گوشت سے ادنےٰ درجہ کی تھی، حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد فلسطین میں جانا اور وہاں کے شہروں پر قبضہ کرنے کا تھا، مگر بنی اسرائیل عمالیقیوں اور کنعانیوں سے ڈرتے تھے اور لڑنے پر اور ملک کے فتح کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے، پس جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے زمین کی پیداوار کا کھانا ملنے کی خواہش کی، تو اُنہوں نے جواب دیا کہ کسی شہر میں چل پڑو، اور جا اُترو وہاں سب کچھ ملیگا، پس اس سے یہ سمجھنا کہ اُن کے سفر میں کوئی شہر پڑا تھا، اور حضرت موسیٰ نے یا خدا نے اُس میں اُترنے کا حکم دیا تھا، ایک صریح غلط فہمی ہے +

دوسرا حصّہ آیت کا اُن واقعات کے بیان میں ہے، جب کہ بنی اسرائیل فلسطین میں پہنچ گئے اور شہروں کو فتح کر لیا اور اُس میں آباد ہوگئے، اور پھر اُن کی بدیوں اور بُرائیوں اور انبیاء کے قتل کے سبب اُن پر آفت پڑی، اور ذلیل و خوار اور مسکین بے یار و دبار ہوگئے اور باوجودیکہ اُن میں سے بادشاہانِ ذیشان پیدا ہوئے، مگر تمام قوم میں سے وہ شان و شوکت یک لخت جاتی رہی، اور اس وقت تک اُن کا یہی حال ہے +

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

اور (یاد کرو) جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل کو ذبح کر ڈالو، بولے کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے (موسیٰ نے) کہا کہ خدا کی پناہ کہ میں نادانوں میں سے ہو جاؤں، بولے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ، ہم کو بتادے کہ وہ کیسا ہے (موسیٰ نے) کہا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ ایک بیل ہے نہ بڈھا اور نہ بچا ان کے درمیان درمیان ہے، پھر کرو جو حکم تم کو دیا گیا ہے ﴿٦٣﴾ بولے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ، ہم کو بتادے کہ کیا اُس کا رنگ ہے، (موسیٰ نے) کہا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ وہ زرد ڈہڈہاتے رنگ کا بیل ہے دیکھنے والوں کو خوش آتا ہے ﴿٦٤﴾

(٦٠) (وَرَفَعْنَا) یہ مضمون دو مقام میں آیا ہے ایک تو اسی آیت میں ہے کہ، ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا، اور سورۂ اعراف میں یہ لفظ ہیں " واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه واقع بهم "، ان دونوں مقاموں میں چار لفظ ہیں جن کے معنی حل ہونے سے مطلب سمجھ میں آویگا۔ رفع۔ فوق۔ نتق۔ ظلہ ❖

" رفع "، کے معنی اونچا کرنے کے ہیں، مگر اس لفظ سے یہ بات کہ جو چیز اونچی کی گئی ہے وہ زمین سے بھی معلق ہو گئی ہو لازم نہیں آتی دیوار[1] اونچا کرنے کو بھی، رفعنا، کہہ سکتے ہیں حالانکہ وہ زمین سے معلق نہیں ہوتی ❖

" فوق "، کے لفظ کو بھی اُس شے کا زمین سے معلق ہونا لازم نہیں ہے ❖

" نتق " کا لفظ البتہ بحث طلب ہے جس کے معنی مفسرین نے مذہبی عجائبات بنانے کو، قلع، کے بھی لئے ہیں، جس کو زمین سے یا جگہ سے علیحدہ کرنا لازم ہے، اور، رفع، کے بھی لئے ہیں جس کو علیحدہ کر لینا لازم نہیں ہے، بیضاوی میں لکھا ہے " واذ نتقنا الجبل فوقهم " اى قلعناه ورفعناه "، مگر قاموس میں اُس کے معنی ہلا دینے کے لکھے ہیں، " نتقه زعزعه " اور " زعزع " کے معنی ہلا دینے کے ہیں، " الزعزعة تحريك الريح الشجرة ونحوها او كل تحريك شديد "، یعنی زعزعہ کے معنی ہوا کا درخت کو ہلانے کے ہیں اور ہر جنبش شدید کو بھی، زعزعہ، کہتے ہیں، پس صاف طور سے، نتقنا، کے معنی ہلا دینے کے ہیں یعنی ہم نے پہاڑ کو ہلا دیا، اور الفاظ " وظنوا انه واقع بهم " زیادہ تر پہاڑ کے ہلا دینے کے جس سے اُن کو

[1] قرآن شریف میں ابراہیم اور اسمٰعیل کے کعبہ کی دیواروں کو اونچا کرنے کی نسبت ہے۔ اذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت واسمعیل۔ (احمد بابا)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿۶۵﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿۶۶﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۶۷﴾

بولے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے پوچھ ہم کو بتادے کہ وہ کیا ہے بات یہ ہے کہ ہم کو وہ بیل شبہ ہوگیا ہے اور بیشک اگر خدا نے چاہا تو ہم ٹھیک بلت پالیوینگے (یعنی جس بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے اُس کو ٹھیک جان لینگے) ﴿۶۵﴾ (موسیٰ نے) کہا کہ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک بیل ہے نہ سدھا ہوا زمین جوتنے کو اور نہ کھیتی میں پانی دینے کو سالم ہو (یعنی کان غیرہ کٹے ہوئے یا کوئی عضو ناقص نہیں ہے) نہ اس میں کوئی دھبا (یعنی یک رنگ ہے) بولے اب تو نے ٹھیک بتا بتا دیا پھر انہوں نے اُس کو ذبح کر ڈالا اور کرتے ہوئے لگتے نہ تھے ﴿۶۶﴾ اور (یاد کرو) جب کہ تم نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر اُس کو ایک دوسرے پر دھرنے لگے اور اللہ اس کو ظاہر کرنیوالا ہے جس کو تم چھپاتے تھے ﴿۶۷﴾

اُس کے گر پڑنے کا گمان ہُوا مناسب ہیں ✦

،ظلہ، کے معنی سائبان کے بھی ہو سکتے ہیں، چھتری کے بھی ہو سکتے ہیں، اور جو چیز کہ ہم پر سایہ ڈالے اُس کے بھی ہو سکتے ہیں، اور اُس چیز کا زمین سے معلق ہمارے سر پر ہونا ضرور نہیں ہے، تفسیر کبیر میں لکھا ہے ،، الظلۃ کل ما اظلک من سقف بیت او سحابۃ او جناح حائطۃ ،، یعنی، ظلہ، ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو سایہ ڈالے گھر کی چھت ہو یا ابر کا ٹکڑا یا احاطہ کا باز (یعنی دیوار) پس، ظلہ، کے لفظ سے بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ معلق سر کے اوپر ہو ✦

اب غور کرنا چاہیئے کہ واقعہ کیا تھا، بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے، پہاڑ اُن کے سر پر نہایت اونچا اُٹھا ہوا تھا، وہ اس کے سایہ کے تلے تھے، اور طور بسبب آتش فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا، جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ اُن کے اوپر گر پڑیگا، پس اُس حالت کو خدا تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے کہ ،، ورفعنا فوقکم الطور ،، نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلۃ وظنوا انہ واقع بھم ،، پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہ ہو، ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقع کو عجیب و غریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر (خدا اُن پر رحمت کرے) عجائبات دور از کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اُس کی عمدگی سمجھتے تھے، اِس لئے اُنہوں نے تفسیروں میں لغو اور بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں، بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا اُن کے سر پر اُٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو نہیں تو اسی پہاڑ کے

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

پھر ہم نے کہا کہ اُسی مقتول کو اُسی کے ٹکڑے یعنی اعضا سے مارو اس طرح اللہ زندہ کر دیتا ہے (یعنی ظاہر کر دیتا ہے) مرے ہوئے (یعنی نا معلوم قاتل) کو اور اپنی نشانیاں تم کو دکھلاتا ہے تاکہ تم سمجھو ﴿۶۸﴾ پھر اُس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہو گئے پس وہ پتھر کی مانند ہیں بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت اور ہاں پتھروں میں سے تو ایسا بھی ہے کہ پھوٹ نکلتی ہیں اُس سے نہریں اُنہی میں سے ایسا بھی ہے کہ پھٹ جاتا ہے پھر اُس سے پانی نکلتا ہے، اور اُنہی میں سے ایسا بھی ہے کہ خدا کے خوف سے گر پڑتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُس سے بے خبر نہیں ہے ﴿۶۹﴾

تلے کچل دیتا ہوں، اور بعضوں نے کہا کہ نہیں بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اکھاڑ کر ہوا میں اُڑا لایا تھا، اور پانچ میل کا چوڑا اور پانچ میل کا لمبا تھا، اتنی بڑائی اُس کی اِس لئے تھی کہ کل لشکر بنی اسرائیل کا اُس کے تلے ایک ہی دفعہ میں کچل جاوے، یہ تمام خرافاتیں لغو و بیہودہ ہیں اور خدائے پاک کا کلام پاک ایسی بیہودہ باتوں سے پاک ہے +

﴿۶۱﴾ (کُوْنُوْا قِرَدَةً) ہو جاؤ بندر، اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علمائے مفسرین نے عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں، اور لکھا کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل و خاصیت میں بھی بندر ہو گئے تھے، بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے، اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ بندر جو اب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اُچھلتے پھرتے ہیں اُنہی بندروں کی نسل میں سے ہیں +

مگر یہ تمام باتیں لغو و خرافات ہیں، خدائے پاک کے کلام پاک کا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا، اور اُس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا، مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارہ پر رہتا تھا فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا، اُن کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا، جب نہ مانا تو اُن کو قوم سے منقطع، برادری سے خارج، کھانے پینے سے الگ میل جول سے علحدہ کر دیا، اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے، اور اسی لئے اُن کی حالت بندروں کی سی حالت ہو گئی تھی، جس کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ "کونوا قردہ خاسئین" یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۱﴾

(اے مسلمانو) کیا تم اس بات کی توقع رکھتے ہو کہ (یہودی)، تم کو مان لینگے حالانکہ بلاشبہ انہی میں کا ایک گروہ تھا جو خدا کا کلام سنتا تھا اور پھر اُس کو سمجھنے کے بعد بدل دیتا تھا اور خود بھی جانتے تھے ﴿۷۰﴾ اور جب وہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم اُن سے کہہ دیتے ہو وہ چیز جو خدا نے تم پر ظاہر کی ہے تاکہ وہ اسی بات سے جو تمہارے خدا کے پاس سے آئی ہے تم سے حجت کریں کیا تم سمجھتے نہیں؟ ﴿۷۱﴾

حرکتیں کرتے ہیں جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ہیں، اُسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل و خوار و رسوا ہو، جس کے سبب اُس زمانے کے لوگوں کو عبرت ہو، اور آیندہ آنے والے اُن کی ذلت و رسوائی کا حال سُن کر عبرت پکڑیں ✦

یہ کہنا کہ وہ لوگ سچ مچ کے بندر ہو گئے تھے، بجز اہل الجنتہ کے اور کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا، اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی اُن کے سچ مچ کے بندر ہو جانے سے انکار کیا ہے، جس کو ہم بطور تائید اپنی کلام کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں، بیضاوی میں لکھا ہے، "وقال مجاھد مامسخت صورھم ولکن قلوبھم فمثلوا بالقردۃ کما مثلوا بالحمار فی قولہ کمثل الحمار یحمل اسفارا" یعنی مجاہد کا قول ہے کہ اُن کی صورتیں بندر کی سی نہیں ہو گئی تھیں بلکہ اُن کے دل بندروں کے سے ہو گئے تھے، اور اسی لئے بندروں کے ساتھ اُن کو تشبیہ دی ہے، جیسے کہ خدا نے گدھے کے ساتھ اپنے اِس قول میں، کہ اُن کی مثال گدھے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں، تشبیہ دی ہے ✦

﴿۶۳﴾ (دیکھو حاشیہ) یہ قصہ توریت میں بھی ہے[1] - مگر اُس میں بنی اسرائیل کا موسیٰ سے اُس کا اتا پتا پوچھنا مذکور نہیں ہے اور اُس کے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ہے وہ قرآن مجید میں نہیں ہے بہر حال اتنی بات کہ خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں میں موجود ہے، "بقرہ"، بالتحریک مع التاء گائے اور بیل دونوں پر بولا جاتا ہے، اور قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ "لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث" صاف اُس کے بیل ہونے پر دلالت کرتے ہیں - قرآن کے تمام الفاظ سے اور اُن پتوں اور نشانوں سے جو بتائے گئے ہیں صاف

[1] دیکھو کتاب اعداد باب ۱۹ ✦

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۲﴾	کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۲﴾

پایا جاتا ہے، کہ وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر بطور سانڈھ کے چھوڑا ہوا تھا تفسیر کبیر میں بقرہ مسلمہ کی تفسیر "ای وحشیة مرسلة من الحبس" لکھی ہے، جو ٹھیک چھوٹے ہوئے سانڈھ کی ہے، اور اُسی کے ذبح کر ڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا، اور بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح ہونے سے بچ جاوے، اسی لئے اُس کے لتے پتے پوچھتے تھے، پس اس قصہ میں کوئی اعجوبہ بات نہیں ہے، جس بچھڑے کو بنی اسرائیل نے پوجا تھا اُس کا معدوم کرنا اور جس بیل کو بطور سانڈھ کے چھوڑا تھا کہ وہ بھی ایک قسم کی پرستش ہے، اُس کو ذبح کر ڈالنا اُس شرک کفر کے مٹانے کے لئے تھا، ہمارے[1] مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھا ہے کہ یہ قصہ اگلی آیت "واذ قتلتم نفسًا" سے متعلق ہے اور پہلی آیت کو خدا نے پیچھے کر دیا ہے ✦

﴿۷۴﴾ (واذ قتلتم) اس قصہ کو پہلے قصہ سے کچھ تعلق نہیں ہے، بیل کے ذبح کرنے کا قصہ ختم ہو چکا، یہ دوسرا قصہ ہے، کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص مارا گیا تھا، اور قاتل معلوم نہ تھا، اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ سب لوگ جو موجود ہیں اور اُنہی میں قاتل بھی ہے۔ مقتول کے اعضاء سے مقتول کو ماریں جو لوگ درحقیقت قاتل نہیں ہیں وہ بسبب یقین اپنی بیجرمی کے ایسا کرنے میں کچھ خوف نہ کرینگے، مگر اصلی قاتل بسبب خوف اپنے جرم کے جو از روے فطرت انسان کے دل میں اور بالتخصیص جہالت کے زمانہ میں اس قسم کی باتوں سے ہوتا ہے ایسا نہیں کرنے کا، اور اُسی وقت معلوم ہو جاویگا، اور وہی نشانیاں جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھی ہیں لوگوں کو دکھاویگا، اِس قسم کے حیلوں سے اس زمانہ میں بھی بہت سے جرم معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ بسبب خوف اپنے جرم کے ایسا کام جو دوسرے لوگ بلا خوف بہ ثبوت اپنی بیجرمی کے کرتے ہیں نہیں کر سکتے، پس یہ ایک تدبیر قاتل کے معلوم کرنے کی تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا ✦

ہمارے مفسرین نے ان آیتوں کی یہ تفسیر کی ہے، کہ پہلا اور پچھلا ایک ہی قصہ ہے، اور پچھلی آیتوں میں جو بیان ہوا ہے وہ باعتبار وقوع کے مقدم ہے، اور قصہ یوں قرار دیا ہے، کہ بنی اسرائیل نے ایک شخص کو قتل کیا تھا اُس کا قاتل معلوم کرنے کو خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ کہا کہ اُس مذبوح بیل کے اعضا سے مقتول کو مارو، اُن کے مارنے

---

[1] اول هذه القصة (ای قصه واذ قال موسٰی لقومه) قوله تعالےٰ واذ قتلتم نفسًا فادّٰرءتم فیها وانما فك عنه وقدمت لاستقلاله (صاوی) ✦

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۳﴾	اور انہی میں بعضے ان پڑھ ہیں لکھنا بھی نہیں جانتے بجز زبانی پڑھنے کے اور وہ کچھ نہیں ہیں بجز اس کے (کہ خدا کی طرف سے اس کے ہونیکا) گمان کرتے ہیں، پھر افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں ایک نوشتہ پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ لیویں اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت، پھر افسوس ہے انکے لئے اس پر جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور افسوس ہے اُن کے لئے اُس پر جو وہ کماتے ہیں ﴿۷۳﴾

سے مقتول زندہ ہوگیا اور اُس نے اپنے قاتل کو بتلادیا +

مگر اس تفسیر میں متعدد نقصان ہیں، اوّل تو پچھلی آیتوں کو مقدم قرار دینے اور دونوں قصوں کو ایک کردینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسرے "کذلک یحی اللہ الموتی" کے معنی جب مربوط ہوتے ہیں جب اُس کے پہلے یہ جملہ، فَاَحْيَاهُ اللّٰهُ، مقدّر مانا جاوے، اور ایسے جملہ کو جو خارج از عقل اور خلاف عادت باری تعالیٰ ہے، اپنی طرف سے بغیر موجود ہونے کسی یقین یا اشارہ صریح کے مقدّر ماننا عبارت قرآن میں اضافہ کرنا ہے۔ تیسرے یہ کہ باوجود اس اضافہ کے یہ ماننا پڑیگا کہ "کذلک یحی اللہ الموتی" سے مراد احیاءِ اموات بروز بعث و نشر ہے، اور اس جگہ بعث و نشر کے حال کے بیان کرنے کا کوئی محل و موقع نہیں ہے اور نہ کوئی مباحثہ بعث و نشر کی بابت ہے +

جو سیدھے سادے صاف صاف معنی آیتوں کے ہم نے بیان کئے ہیں اور جن میں آیتوں کی ترتیب اُلٹنی پڑتی ہے اور نہ کسی جملہ خلاف از عقل و بغیر سند نقل کے اپنی طرف سے بڑھانے کی حاجت ہوتی ہے، اور جو صاف طور پر قرآن مجید سے پایا جاتا ہے، شاید اُس کی نسبت بھی بعض لوگ کچھ شبہ کرینگے۔ اول تو یہ کہینگے "اضربوہ" میں ضمیر مذکر کی ہے اور "ببعضھا" میں ضمیر مؤنث کی، اور دونوں کا مرجع ہم نے مقتول ٹھیرایا ہے۔ مگر یہ اعتراض کسی طرح صحیح نہیں ہونیکا، اِس آیت سے پہلے "واذ قتلتم نفسا" واقع ہے اور ببعضھا کی ضمیر نفس کی جانب راجع ہے اور نفس مؤنث ہے اور اُس کے لئے مؤنث ہی کی ضمیر ہونی چاہئے "اضربوہ" کی ضمیر کو بھی تمام مفسرین نے نفس ہی کی طرف راجع کیا ہے، مگر باعتبار شخص مقتول کے اُس کا مذکر لانا جائز قرار دیا ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے "الھاء فی قولہ تعالیٰ فاضربوہ ضمیر وھو اما ان یرجع الی النفس وحینئذ یکون التذکیر علی تاویل الشخص

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۷۴) بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۷۵) وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۷۶)

اور کہتے ہیں کہ بجز چند گنتی کے دنوں کے ہم کو آگ نہیں چھونے کی تو اُن سے کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی اقرار لے لیا ہے کہ اللہ اپنے اقرار سے ہرگز خلاف نہیں کرنے کا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جو نہیں جانتے (۷۴) ہاں جس نے بُرائی کمائی اور گھیر لیا اُس کو اُس کی خطاؤں نے پھر وہی آگ میں پڑنے والے ہیں وہ ہمیشہ اُس میں رہینگے (۷۵) اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے وہ جنت میں جانے والے ہیں وہ ہمیشہ اُس میں رہینگے (۷۶)

والانسان واما الی الفعیل وھو الذی دل علیہ قولہ وما کنتم تکتمون"

دوسرا یہ شبہ کرینگے کہ " یحیی " اور " موتی " کے لفظ کے ہم نے وہ معنی نہیں لئے جو صریح اُن لفظوں سے پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہ ہوگا اس لئے کہ ہم نے ان لفظوں کے وہی معنی لئے ہیں جن معنوں میں خود خدا نے ان لفظوں کو استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے " وکنتم امواتا فاحیاکم " یعنی تم مردہ یعنی معدوم یا غیر موجود یا نامعلوم تھے، پھر ہم نے تم کو زندہ یعنی مخلوق یا موجود یا ظاہر کیا پس اسی دلیل سے ہم نے یہاں سے ، یحیی ، اور ، موتی ، کے یہی لئے ہیں ، کہ نامعلوم قاتل معلوم ہوگیا ، اور ان معنوں کے صحیح ہونے پر خود اسی مقام میں خدا تعالٰی نے اشارہ کیا ہے ، اوپر کی آیت میں لفظ واللہ مخرج آیا ہے ، اُسی کے مقابل اس آیت میں یحیی اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اوپر کی آیت میں تکتمون کا لفظ آیا ہے ، اُسی کے مقابل اس آیت میں موتی کا لفظ آیا ہے ، پس علانیہ ثابت ہے کہ یحیی اللہ ، سے ظاہر ہونا قاتل کا اور ، موتی ، سے نامعلوم یا غیر ظاہر ہونا قاتل کا مُراد ہے نہ مقتول کا زندہ ہونا ، خدا اپنی قدرت اور اپنی حکمت کو ، اُنہی باتوں میں جو انسان روزمرہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ظاہر کرتا ہے ، مگر انسان کا خیال اُس پر قناعت نہیں کرتا ، اور دور از کار باتوں کو پسند کرتا ہے ✦

تیسرا شبہ یہ کرینگے کہ ، کذلک یحیی اللہ الموتی ، کے قبل ہم کو یہ جملہ کہ ، فاظھرہ اللہ ، مقدر ماننا پڑیگا ، مگر یہ جملہ نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف قرآن ، اور نہ خلاف سیاقِ کلام خدا کیونکہ خود خدا نے فرمایا ہے ، واللہ مخرج ، برخلاف اُس پہلے جملہ کے کہ نہ وہ زمین کا ہے نہ آسمان کا ✦

(۸۱) (وآتینا عیسی ابن مریم البینٰت) ، بینٰت ، صفت ہے اور جہاں صرف لفظ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ
إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ
حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم
مُّعْرِضُونَ (۷۷) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ
لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن
دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ (۷۸) ثُمَّ
أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ
وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ
تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن
يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ
بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ
مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ
الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُونَ (۷۹) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ (۸۰) وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى
الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِن بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ
وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ

اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے قول لیا کہ اللہ
کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان
کرو اور قرابت مندوں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ
اور کہو لوگوں کے لئے اچھی بات اور پڑھتے رہو نماز اور دیتے
رہو زکوٰۃ پھر تم پھر گئے بجز چند کے تم میں سے اور تم پھر جانیوالے
ہو (۷۷) اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے تمہارا قول لیا کہ آپس
میں خونریزی مت کرو اور اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے
مت نکالو پھر تم نے اقرار کیا اور تم شاہد ہو (۷۸) پھر تم
ہی وہ ہو کہ مار ڈالتے ہو اپنے لوگوں کو اور نکال دیتے ہو
اپنے گروہ کو اُن کے گھروں سے اُن پر گناہ اور زیادتی سے
ایک دوسرے کے مددگار رہتے ہو اور اگر وہ غیر قوم کے
قیدی ہو کر تمہارے پاس آتے ہیں تو فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو
اور اُن کا نکال دینا بھی تو تم پر حرام ہے پھر کیا ایمان لاتے
ہو کتاب کے ایک ٹکڑے پر اور انکار کرتے ہو اُس کے
دوسرے ٹکڑے سے پھر کیا سزا ہے اُس شخص کی جو تم میں سے
ایسا کرے بجز خواری کے دنیا کی زندگی میں اور قیامت
کے دن سخت تر عذاب میں ڈالے جاویں اور جو کچھ تم کرتے ہو
اُس سے خدا بیخبر نہیں ہے (۷۹) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں
نے لے لیا ہے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے
پھر نہ اُن پر سے عذاب کی تخفیف ہوگی اور نہ
اُن کی مدد کی جاویگی (۸۰) اور بے شبہ ہم نے
دی موسیٰ کو کتاب اور اُس کے بعد پے درپے
بھیجے ہم نے پیغمبر اور ہم نے دیں عیسےٰ مریم
کے بیٹے کو نشانیاں

بیّنات ہے وہاں اُس کا موصوف جس کی وہ صفت ہے مقدر ہے، پس خدا ہی کے کلام پر غور کر کر
موصوف مقدر کو قرار دینا چاہیئے، خدا کے کلام میں ہمیشہ بیّنات کا موصوف آیات کا لفظ آیا
ہے، جیسے کہ اسی سورہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے ،، ولقد انزلنا

وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَھْوٰۤی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۱)	اور ہم نے اُس کی تائید کی روح قدس سے کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس چیز لایا جس کو تمہارا جی نہ چاہتا تھا تو تم نے اُس سے سرکشی نہیں کی پھر ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو تم نے مار ڈالا (۸۱)

الیک ایات بیّنات " اس لئے جو معنی آیات بیّنات کے ہیں وہی معنی صرف بیّنات کے بھی ہیں، کیونکہ آیات اس کا موصوف وہاں مقدر ہے، اور جو مراد لفظ آیات سے ہے وہی مراد لفظ بیّنات سے ہے، مع اُس صفت کے جس پر لفظ بیّنات دلالت کرتا ہے ✦

(ایہ) کے معنی لغت میں علامت یعنی نشانی کے ہیں، اور علامت ہمیشہ اُس چیز کی وہ نشانی ہے دلالت کرتی ہے، پس آیت کے معنی دلالت کرنے والے کے ہوئے، جیسے کہ امام فخر الدین رازی نے بھی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے،، ان الآیۃ ھی الدالۃ " اور جو کہ قرآن مجید کے فقرے بھی خدا کی وحدانیت اور انبیاء کی نبوت اور احکام شریعت پر دلالت کرتے ہیں، اس لئے اُس کے ہر فقرہ کو بھی آیت کہتے ہیں، جیسے کہ تفسیر معالم التنزیل میں " ولقد انزلنا الیک ایات بیّنات،، کی تفسیر میں لکھا ہے،" واضحات مفصلات بالحلال والحرام والحدود والاحکام" اور جب کہ فقرات قرآن پر اس لئے کہ وہ احکام پر دلالت کرتے ہیں آیات کا اطلاق ہوا، تو آیات سے خود احکام بھی جو اُس شخص کے وجود اور عظمت و جلال اور قدرت و سطوت و اختیار پر دلالت کرتے ہیں، جس نے وہ احکام صادر کئے ہیں مراد لئے جا سکتے ہیں، درحقیقت آیات کے لفظ سے قرآن مجید کی آیتیں یا احکام جو خدا نے اُن آیتوں میں نازل فرمائے ہیں مراد لینا ایک ہی بات ہے ✦

قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال کبھی تو خدا کی جانب سے ہوا ہے، جیسے کہ اس آیت میں " ولقد انزلنا الیک ایات بیّنات،، اور کبھی بطور قول کفار یا اہل الکتاب کے ہوا ہے، جیسے کہ اس آیت میں ہے،، وقالوا لولا یاتینا بایۃ من ربہ" پس جہاں قرآن میں اس لفظ یعنی، آیت، یا آیات، یا بیّنات، یا آیات بیّنات، کا استعمال خدا کی جانب سے ہوا ہے، اُس سے ہمیشہ وہ احکام یا نصائح اور مواعظ مراد ہیں، جو خدا تعالےٰ نے بذریعہ اپنے کلام یا وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، اُن احکام و مواعظ میں سے بعضے خفی ہیں جن کی حکمت بہ تأمل و تدقیق نظر سمجھ میں آتی ہے، اور بعضے ایسے ہیں جو نہایت صاف اور واضح بدیہی ہیں، اسی لئے خدا نے کبھی صرف آیات سے اور کبھی آیات بیّنات سے اور کبھی زیادہ تر بدیہی ہونے کے سبب سے صرف بیّنات سے اُن کو تعبیر کیا ہے ✦

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور بولے کہ ہمارے دل (ایمان سے) ڈھکے ہوئے ہیں (نہیں) بلکہ اُن پر اُن کے کفر کے سبب اللہ نے لعنت کی ہے پس ذرا[1] بھی ایمان نہ لائینگے ﴿۸۲﴾

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب اُن کے لئے اللہ کے پاس سے کتاب (یعنی قرآن) آئی سچ بتانے والی اُس چیز کو جو ان کے پاس ہے حالانکہ اُس سے پہلے (اُسی سے) اُن لوگوں پر جو کافر تھے فتح پانی چاہتے تھے پھر جب اُن کے پاس آئی وہ چیز جس کو وہ جانتے تھے اُس سے انکار کیا پس لعنت ہے خدا کی انکار کرنے والوں پر ﴿۸۳﴾

اِس بیان سے ظاہر ہے کہ ہم آیات بینات سے جہاں کہ وہ خدا کی طرف سے بولا گیا ہے وہ چیز مراد نہیں لیتے جس کو لوگ معجزہ یا معجزات کہتے ہیں، گو مفسرین نے اکثر مقامات میں بلکہ قریباً کل مقامات میں ان الفاظ سے معجزات ہی مراد لئے ہیں مگر یہ غلطی ہے، معجزہ پر آیت یا آیات کا اطلاق ہو نہیں سکتا، کیونکہ معجزہ امر مطلوب پر یعنی اثبات نبوت یا خدا کی طرف سے ہونے پر دلالت نہیں کرتا، اور نہ وہ صفت بینات موصوف ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اُس میں اگر وہ ہو بھی تو بھی کوئی ایسی وضاحت جس سے اُس کا حق اور واقعی ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا پایا جاوے کبھی نہیں ہوتی، صرف احکام ہی ہیں جو بینات کی صفت سے موصوف ہو سکتے ہیں ✤

معجزہ نبوت کے ثبوت کی کیونکر دلیل ہو سکتا ہے، اثبات نبوت کے لئے اول خدا کا وجود اور اُس کا متکلم ہونا اور اُس میں اپنے ارادہ سے کام کرنے کی قدرت کا ہونا اور اُس کا تمام بندوں کا مالک ہونا ثابت کرنا چاہیئے۔ پھر اُس کا ثبوت چاہیئے کہ وہ اپنی طرف سے رسول و پیغمبر بھیجا کرتا ہے پھر ثابت ہونا چاہیئے کہ جو شخص دعوے نبوت کرتا ہے وہ درحقیقت اُس کا بھیجا ہوا ہے۔ ہم پہلی دو باتوں سے قطع نظر کرتے ہیں کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں ایسے مقامات پر اکثر اہل کتاب مخاطب ہیں جو اُن دونو پہلی باتوں کو مانتے تھے، اور اس لئے معجزات سے صرف تیسری بات کا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے ✤

مگر وہ تیسری بات بھی معجزے سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ قاضی ابی الولید محمد بن رشد نے اپنی کتاب میں جس کا نام ،، کتاب الکشف عن مناہج الادلہ فی عقائد الملہ ،، ہے بعثت انبیاء پر نہایت لطیف مباحثہ لکھا ہے، جس کا حاصل ہم بھی اس مقام پر لکھتے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے کہ

[1] فقلیلا ما یؤمنون " مایؤمنون قلیلا ولا کثیرا ویقول مایؤمنون نقلیل ولا بکثیر (تفسیر ابن عباس)

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے آپ کو انہوں نے اپنے لئے لی، کہ انکار کریں اُس چیز سے (یعنی قرآن سے) جس کو خدا نے بھیجا ہی اِس ضد سے کہ خدا اس کو بھیجے اپنے فضل سے! بندوں میں سے جس پر چاہے، پھر مستحق ہوئے غضب پر غصہ کے اور کافروں کے لئے سخت عذاب ہی (۸۴) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس چیز پر ایمان لاؤ جو خدا نے بھیجی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اُس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اُتری ہے اور اُس کے سوا کو بھی نہیں مانتے حالانکہ وہ سچ ہے اور سچ بتاتی ہے اُس چیز کو جو اُن کے پاس ہے (یعنی توریت) تو اُن سے کہہ کہ اگر تم اُسی کو مانتے ہو جو تمہارے پاس ہے تو پھر تم نے کس لئے اگلے زمانہ میں اللہ کے نبیوں کو مار ڈالا اگر تم ایمان والے تھے (۸۵)

خدا کی طرف سے رسولوں کے آنے میں دو چیزیں غور طلب ہیں۔ اول رسول کے ہونے کا ثبوت۔ دوسرے وہ چیز جس سے ظاہر ہو کہ یہ شخص جو رسول ہونے کا دعوے کرتا ہے رسولوں میں سے ایک رسول ہے، اور اپنے دعوے میں جھوٹا نہیں ہے۔ [illegible] ہیں جو ایسے انسان کے ہونے پر متکلمین نے دنیا کے حالات پر قیاس کر کر استدلال کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالےٰ متکلم ہے اور صاحب ارادہ، اور بندوں کا مالک، اور دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص مجاز ہے کہ اپنے مملوک بندوں کے پاس اپنا ایلچی یا رسول بھیجے، تو خدا کی نسبت بھی ممکن ہے کہ اپنے بندوں پاس اپنا رسول بھیجے۔ اور یہ بات بھی دنیا میں دیکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں بادشاہ کا ایلچی ہوں اور بادشاہی نشانیاں اُس کے پاس ہیں تو واجب ہوتا ہے کہ اُس کا ایلچی ہونا قبول کیا جاوے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ یہ نشانیاں رسولوں کے ہاتھ سے معجزوں کا ہونا ہے ✤

ابن رشد فرماتے ہیں کہ یہ دلیل عام لوگوں کے لئے کسی قدر مناسب ہو، مگر جب غور سے دیکھا جاوے تو ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بادشاہ کے ایلچی ہونے کا دعوے کرتا ہے اُس وقت تک اُس کو سچا نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ جو نشانیاں وہ دکھاتا ہے وہی نشانیاں بادشاہ کے ایلچی ہونے کی ہیں، اور یہ بات دو طرح سے ہو سکتی ہے یا تو خود بادشاہ نے اپنی رعیت سے کہہ دیا ہو کہ جس شخص کے پاس تم میری ان خاص نشانیوں کو دیکھو تو اُس کو میرا ایلچی یا رسول جانو، یا بادشاہ کی عادت سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو کہ وہ ایسی نشانیاں بجز اپنے ایلچی یا رسول کے اور کسی کو نہیں دیتا۔ جب کہ یہ بات ہے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کہ بعض انسان کے

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

بیشک تمہارے پاس موسٰی کھلی ہوئی نشانیاں لیکر آیا پھر اس کے بعد تم نے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم ہو ﴿۸۶﴾ اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور ہم نے تم پر طور کو اونچا کیا کہ مضبوط پکڑو اُس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے اور (اُس کو) مانو، (اپنی زبان سے تو انہوں نے) کہا کہ ہم نے مانا (مگر اُن کی زبان حال اور کردار نے کہا کہ) ہم نے نہ مانا اور اُن کے دلوں میں پلا دی گئی تھی بچھڑے کی (محبّت) اُن کے کفر کے سبب کہدے بُری بات ہے جس کے کرنے کو تمہارا ایمان حکم دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۸۷﴾

ہاتھ سے معجزوں کا ہونا رسول ہونے کی خاص نشانی ہے، کیونکہ دو حال سے خالی نہیں، یا یہ بات شرع سے جانی گئی ہوگی یا عقل سے، شرع سے جاننا تو غیر ممکن ہے، کیونکہ شرع تو رسول ثابت ہونے کے بعد ٹھیرے گی اور اب تک رسول ہونا ہی ثابت نہیں ہوا ہے اور عقلاً بھی اس بات کا قرار دینا کہ یہ نشانیاں مخصوص رسولوں کی ہیں غیر ممکن ہے ہاں اگر وہ نشانیاں بہت سی دفعہ اُنہی لوگوں سے ظاہر ہوتیں جو رسول ہونے کا دعوے کرتے ہیں اور اُن کے سوا اور کسی سے نہ ہوئی ہوتیں تو جو لوگ رسولوں کے ہونے کو مانتے ہیں اُن کے لئے دلیل ہو سکتی، اور اُس وقت یہ کہا جا سکتا کہ اس شخص نے جو رسول ہونے کا دعوے کرتا ہے معجزے دکھائے ہیں، اور جو شخص کہ معجزے دکھاتا ہے وہ رسول ہوتا ہے اور اس لئے یہ شخص بھی رسول ہے۔ مگر یہ ماننا کہ جس شخص نے جو رسول ہونے کا دعوے کرتا ہے معجزے دکھائے ہیں، اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اول تسلیم کر لیا جاوے کہ ایسی باتیں انسان سے ہو سکتی ہیں، اور درحقیقت اُن کا ہونا بخوبی محسوس ہوا ہو، اور بیقین ہو گیا ہو کہ وہ کسی لاگ سے اور کسی حکمت سے اور خواص اشیاء سے نہیں ہوئیں، اور جو دکھائی دیا ہے وہ صرف نظر بندی نہ تھی، بلکہ حقیقت میں واقع ہوا ہے۔ اور یہ کہنا کہ جو شخص معجزے دکھاتا ہے وہ رسول ہوتا ہے، جب صحیح ہوگا کہ پہلے رسولوں کا وجود اور یہ بات کہ وہ معجزے بجز رسولوں کے اور کسی نے نہیں دکھائے مان لیا جاوے، کیونکہ اس قسم کی منطقی دلیل کا جس میں دو مقدمے ملا کر نتیجہ نکالا جاتا ہے یہ خاصہ ہے کہ وہ دونوں مقدمے مان لئے گئے ہوں، مثلاً جس شخص کے سامنے یہ دلیل کی جاوے کہ "العالم محدث"، تو ضرور ہے کہ اُس کو یہ بات معلوم ہو کہ عالم موجود ہے اور محدث بھی ہے، پس اب ایک معترض کہہ سکتا ہے، کہ یہ بات کہ جو شخص معجزے دکھاتا ہے وہ رسول ہوتا ہے کہاں سے ثابت ہوئی ہے"

کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر خدا کے نزدیک اور لوگوں کے سوا بالتخصیص تمہارے ہی لیئے ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو (۸۸)	قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۸۸)

کیونکہ اب تک رسالت ہی کا وجود ثابت نہیں ہوا ہے، اور دو مقدموں کو ملا کر نتیجہ نکالنے کے لیئے اول اُن دونوں کا ثابت ہوجانا ضرور تھا۔ اور یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ جب رسولوں کا ہونا عقلاً ممکن ہے تو اُن کے ہونے پر عقل دلالت کرتی ہے، کیونکہ وہ امکان اِس قسم کا امکان نہیں ہے جو موجودات کی طبیعت میں پایا جاتا ہے، جس طرح کہ ہم کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مینہ برسے اور نہ برسے، اِس لیئے کہ جو امکان موجودات کی طبیعت میں مانا جاتا ہے وہ اس لیئے مانا جاتا ہے کہ وہ شے کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی، جیسے کہ مینہ کا حال ہے کہ کبھی برستا ہے اور کبھی نہیں برستا، اور اِس لیئے عقل بطور قاعدہ کلیہ کے یہ بات کہتی ہے کہ مینہ کا برسنا ممکن ہے۔ اور واجب کا حال اس کے برخلاف ہے اور وہ وہ ہے جو ہمیشہ موجود اور محسوس ہو، اور اس لیئے اُس کی نسبت عقل بطور قاعدہ کلیہ کے یہ بات کہتی ہے کہ اُس کا متغیر ہونا اور بدلا جانا ممکن نہیں، پس جو شخص کسی ایک رسول کے ہونے کا بھی قائل ہوگیا ہو تو اُس کے مقابل میں کہا جا سکتا ہے کہ رسولوں کا ہونا ممکن ہے، مگر جو شخص رسول ہونے کا قائل ہی نہ ہو تو اُس کے مقابل میں اُس کا امکان کہنا جہالت ہے، اور لوگوں کی طرف سے ایلچی کا ہونا ممکن مانا گیا ہے، تو اس سبب سے مانا گیا ہے، کہ اُن کے ایلچیوں کا وجود ہم نے پایا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں کی طرف سے ایلچیوں کے وجود کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی طرف سے بھی رسولوں کا ہونا ممکن ہو، جیسے کہ عمرو کے ایلچی کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ زید کی طرف سے بھی ایلچی کا ہونا ممکن ہے، تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا اس لیئے کہ ایسی صورت میں عمرو اور زید دونوں کی طبیعتوں کا مساوی ہونا ضرور ہے، اور یہ مساوات خدا اور بندوں میں نہیں ہے، اور اگر آیندہ کے لیئے رسول ہونے کا امکان فی نفسہ مان لیا جاوے، تو یہ تسلیم ایک امکانی امر کی تسلیم ہوگی نہ اُس کے وقوع کی، اور یہ نہ معلوم ہوگا کہ اُس نے بھیجا بھی ہے یا نہیں جیسے کہ اس بات میں شک ہوتا ہے کہ عمرو نے کسی گذشتہ زمانے میں ایلچی بھیجا ہے یا نہیں، اور آیندہ زمانے میں بھیجنے میں شک کرنا کہ آیندہ بھی وہ بھیجیگا یا نہیں، گذشتہ زمانے کے شک کرنے سے بالکل مختلف ہے۔ پھر جب ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ زید نے گذشتہ زمانہ میں کوئی ایلچی بھیجا ہے یا نہیں تو ہم کو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جس کے پاس زید کی نشانیاں ہوں وہ زید کا ایلچی ہے، جب تک کہ ہم یہ نہ جان لیں کہ یہ نشانیاں اُس کے ایلچی ہونے کی نشانیاں ہیں، اور یہ بات جب ہوگی جب ہم جان چکے ہوں کہ اُس نے اپنا ایلچی بھیجا ہے۔ پس جب کہ ہم نے

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾	اور رہرگز کبھی اُس کی آرزو نہ کرینگے اُس کے سبب سے جو اُن کے ہاتھوں نے پیش کیا ہی (یعنی بہ سبب اپنے اعمال بد کے) اور اللہ جانتا ہے ظالموں کو ﴿۸۹﴾

یہ بھی تسلیم کر لیا کہ رسالت ہوتی ہے اور معجزے بھی ہوتے ہیں، تو کس طرح ہم کو یہ بات معلوم ہو گی کہ جس نے وہ معجزے دکھلائے ہیں وہ رسول ہے کیونکہ اُس کے رسول ہونے کا ثبوت خدا کی طرف سے اُس وقت تک تو نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کا رسول ہونا ثابت نہ ہو لے ورنہ تصحیح الشئے بنفسہٖ لازم آتی ہے جو باطل ہے اور تجربہ اور عادت سے بھی اُس کے رسول ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکنے کا بجز اس کے کہ معجزے رسول ہی دکھایا کریں اور کوئی نہ دکھا سکے حالانکہ خرق عادت جس کا ایک نام معجزہ بھی ہے رسول اور غیر رسول دونوں دکھا سکتے ہیں۔ ان تمام مشکلات کے سبب متکلمین نے اُن سب باتوں کو چھوڑ کر صرف یہ بات کہی کہ جس شخص کے پاس معجز یعنی عاجز کرنے والی چیز ہو وہ رسول ہے، مگر یہ بھی صحیح نہ ہوگا بجز اس کے کہ وہ شئے معجز فی نفسہٖ رسالت اور رسول پر دلالت نہ کرے، اور عقل میں یہ قوت نہیں کہ وہ جب کوئی عجیب خرق عادت دیکھے تو یہ جان لے کہ وہ ربانی ہے اور رسالت پر دلیل قاطع، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والا یہ اعتقاد کرے کہ جس شخص سے یہ خرق عادت ہوئی ہے، وہ ایک بڑا شخص ہے، اور بڑا شخص جھوٹ نہیں بولیگا، بلکہ اُس کے رسول ماننے کو یہ بھی کافی نہ ہوگا جب تک کہ یہ بھی نہ مان لیا جائے کہ رسالت درحقیقت ایک چیز ہے، اور ایسی خرق عادت بجز رسول کے اور کسی بڑے شخص سے نہیں ہوتی۔ شئے معجز بھی رسالت پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ عقل نہیں جان سکتی کہ رسالت اور شئے معجز میں کیا علاقہ ہے، جب تک یہ نہ مان لیا جائے کہ اعجاز، رسالت کے افعال میں سے ایک فعل ہے، جیسے کہ بیمار کا اچھا کرنا طب کے افعال میں سے ایک فعل ہے، اور جو شخص بیمار کو اچھا کر دیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ طب کا وجود ہے، اور یہ شخص طبیب ہے، پس یہ تمام دلیلیں بودی ہیں۔ اور اگر ہم بطور تنزل کے رسالت کے امکان امری کو امکان وقوعی فرض کر لیں اور معجزہ کو بھی اُس شخص کے سچا ہونے کی دلیل مان لیں جو رسالت کا دعوےٰ کرتا ہے، تو بھی اُن لوگوں کے نزدیک جو کہتے ہیں کہ رسول کے سوا اور سے بھی شئے معجز ظاہر ہوتی ہے، رسالت پر معجزہ کی دلالت لازمی نہیں ہونے کی، اور متکلمین اس بات کے قائل ہیں کہ شئے معجز کبھی جادوگر سے اور ولی سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس مقام پر جو اُنہوں نے یہ شرط لگائی ہے، کہ شئے معجز اُسی وقت رسالت پر دلالت کرتی ہے، جب کہ وہ رسالت کے دعوےٰ کے مقارن ہو، اور جو شخص رسول نہیں ہے اور وہ یہ دعوےٰ کرکے کہ میں رسول ہوں شئے معجز کو دکھانا چاہے تو نہ دکھا سکیگا، یہ ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل نہیں، نہ تو اس کا نشان

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَھُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور بیشک تو اُن کو پاویگا سب آدمیوں سے زیادہ حریص زندگی پر، اور اُن لوگوں سے بھی زیادہ (حریص) جو مشرک ہیں، ہر ایک اُن میں کا چاہتا ہے کہ کاش اُس کو ہزار برس کی عمر دیجائے اور لمبی عمر[۱] ہونا بھی اُس کو عذاب سے بچانیوالا نہیں، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (۹۰) کہدے جو کوئی دشمن ہے جبرئیل کا کہ بے شبہ اُس نے ڈالا ہے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے (وہ کلام جو) سچ بتاتا ہے اُس چیز کو جو اُس سے پیشتر ہے، اور ہدایت اور خوشخبری ہے ایمانوالوں کے لئے (۹۱)

منقولات میں پایا جاتا ہے، اور نہ عقل سے معلوم ہوسکتا ہے، اور یہ کہنا کہ شئے معجز ایک بڑے شخص سے ظاہر ہوتی ہے، اور جو شخص جھوٹا دعوےٰ کرے وہ بڑا شخص نہیں ہے، اور اِس لئے اُس سے ظاہر نہ ہوگی، اس لئے غلط ہوجاتا ہے کہ متکلمین جادوگر سے شئے معجز کا ظاہر ہونا تسلیم کرتے ہیں، اور جادوگر بڑا شخص تسلیم نہیں کیا جاسکتا ✦

ان سب خرابیوں پر خیال کرکے بعض لوگوں نے یہ کہا ہے، کہ یہ اعتقاد ٹھیک ہے کہ خرق عادات بجز انبیاء کے اور کسی سے نہیں ہوتا، اور سحر صرف ایک ڈھسٹ بندی ہے، نہ قلب ماہیت شئے، یعنی معجزہ سے لکڑی سچ مچ کا سانپ بن جاتی ہے، اور سحر سے وہ سانپ نہیں بنتی، بلکہ لوگوں کو سانپ دکھائی دیتی ہے، اور اسی وجہ سے اُن لوگوں نے کراماتِ اولیاء سے انکار کیا ہے (واضح ہو کہ اسی خیال پر شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ بالغہ میں کراماتِ اولیائے سے انکار کیا ہے) مگر قاضی ابن رشد اس اعتقاد کی بھی تردید کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تم کو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے حال سے ظاہر ہوگا، کہ آنحضرت صلعم نے نہ کسی ایک شخص کے اور نہ کسی ایک گروہ کے ایمان پر دعوت کرتے وقت یہ نہیں کیا، کہ اُس سے پہلے اُس کے سامنے کوئی خرق عادت کی ہو، اور ایک چیز کو دوسری چیز میں بدل دیا ہو، یعنی لکڑی کا سانپ اور سانپ کی لکڑی، اور سونے کو مٹی اور مٹی کو سونا بنا دیا ہو، اور اسلام لانے کی دعوت کے وقت کوئی کرامات اور کوئی خوارق عادات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ظاہر نہیں ہوئی اگر ظاہر ہوئی ہے تو معمولی حالات ہیں، بغیر اس کے کہ کرامات اور خرق عادت کا دعوےٰ کیا ہو

[۱] والضمیر (ای ضمیر هو) ✦ ✦ ✦ لما دل علیه یعمّر وان یعمّر بدل منه (بیضاوی) ✦

جو کوئی خدا کا دشمن ہے	مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ

اور اُس کا ثبوت خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے، جہاں خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ "کافر کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے جب تک کہ تو زمین پھاڑ کر ہمارے لئے چشمے نہ نکالے، یا تیرے پاس کھجور و انگور کا باغ نہ ہو جس کے بیچ میں تو بہتی ہوئی نہریں نہ نکالے زور سے بہتی، یا تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے نہ ڈالے، یا خدا اور فرشتوں کو اپنے ساتھ نہ لا دے، یا تیرے لئے کوئی مزین گھر نہ ہو، یا تو آسمان پر چڑھ نہ جاوے، اور ہم تو تیرے چڑھنے پر ہرگز ایمان نہیں لانے کے، جب تک کہ ہم پر ایسی کتاب نہ اُترے جو ہم پڑھ لیں (اس پر خدا اپنے پیغمبر سے کہتا ہے کہ) تو اُن سے کہدے، کہ پاک ہے میرا پروردگار میں تو کچھ نہیں ہوں مگر رسول (اور خدا نے فرمایا کہ) نہیں روکا ہم کو آیات کے بھیجنے سے مگر یہ کہ جھٹلایا اُن کو اگلوں نے۔

قالوا لن نؤمن لك حتى تفجر لنا من الارض ينبوعا او تكون لك جنة من نخيل وعنب فتفجر الانهار خلالها تفجيرا او تسقط السماء كما زعمت علينا كسفا او تاتى بالله والملائكة قبيلا او يكون لك بيت من زخرف او ترقى فى السماء ولن نؤمن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا نقرؤه قل سبحان ربى هل كنت الا بشرا رسولا ۔
وما منعنا ان نرسل بالآيات الا ان كذب بها الاولون ۔

غرضکہ قاضی ابن رشد نے معجزات کو مثبت نبوت قرار نہیں دیا، اور اُس کے بعد صرف قرآن کو مثبت نبوت قرار دیا ہے" اور قریباً قریباً وہی لکھا ہے جو اس بحث میں ہم لکھ چکے ہیں، مگر وہ بحث اس مقام سے متعلق نہیں ہے۔ قاضی ابن رشد نے جو اتنی بڑی بحث لکھی ہے اس کا حاصل یہ ہے، کہ اگر خدا کو موجود و مرید و متکلم و قادر و مالکِ عباد تسلیم بھی کر لیا جاوے، اور یہ بھی مان لیا جاوے، کہ وہ رسول بھیجا کرتا ہے، اور معجزات کا بھی وقوع قبول کر لیا جاوے، تب بھی معجزات کے وقوع سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی، کہ وہ شخص خدا کا رسول ہے، مختصر طور پر اس کی یہ دلیلیں ہیں:-

(۱) جو امر کہ واقع ہوا اُس کی نسبت اس امر کے لزوم کا ثبوت نہیں ہوتا کہ جس شخص سے وہ واقع ہو وہ رسول ہوتا ہے۔

(۲) کوئی خرق عادت ایسی معلوم نہیں ہے جو بطور خاصہ رسولوں سے مخصوص ہو۔

(۳) کچھ ثبوت نہیں ہے کہ خرق عادت سے رسالت کو کیا تعلق ہے۔

(۴) اس کا ثبوت نہیں ہوتا کہ اُس کا وقوع قانون قدرت کے مطابق نہیں

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ	اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے رسولوں کا

ہُوا کیونکہ بہت سے عجائبات اب بھی ایسے ظاہر ہوتے ہیں جو فی الحقیقت اُن کا وقوع قانون قدرت کے مطابق ہوتا ہے، مگر وہ قانون ابھی لامعلوم ہے +

(۵) اس کا کچھ ثبوت نہیں ہوتا کہ جو امر واقع ہُوا وہ خواص نفس انسانی سے جو ہر ایک انسان میں ہے کچھ تعلق نہیں رکھتا +

(۶) غیر انبیا سے جو امور خرق عادت کے واقع ہوتے ہیں اور جو انبیا سے واقع ہوتے ہیں اُن دونوں میں کوئی ما بہ الامتیاز نہیں ہے +

(۷) یہاں تک کہ اہل ہُنر سے جو امور واقع ہوتے ہیں اُن میں و خرق عادت میں امتیاز نہایت ہی مشکل ہوتا ہے +

کوئی معترض غلطی سے کہ سکتا ہے، کہ قرآن مجید میں جس طرح آیات بینات کا اطلاق قرآن کی آیتوں یا احکام و نصائح و مواعظ قرآنی پر ہُوا ہے، اسی طرح معجزات پر ہُوا ہے، اور دو آیتیں قرآن کی غلط فہمی سے اِس کی دلیل میں پیش کر سکتا ہے، پس مناسب ہے کہ ہم اس مقام پر بتا دیں، کہ اُن آیتوں میں سے آیات بینات سے معجزے مراد نہیں ہیں +

پہلی آیت سورۂ مائدہ کی ہے جہاں خدا تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ کی نسبت فرمایا ہے کہ " اذ ایدتك بروح القدس تکلم الناس فی المھد وکھلا۔ واذ علمتك الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل۔ واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی و تبرئ الاکمہ والابرص باذنی۔ واذ تخرج الموتیٰ باذنی۔ واذ کففت بنی اسرائیل عنك اذ جئتھم بالبینات فقال الذین کفروا منھم ان ھذا الا سحر مبین " اِس آیت میں مفسرین کے نزدیک حضرت عیسیٰ کے معجزات کا بیان ہے، اور پھر کہا گیا ہے کہ کافروں نے کہا کہ یہ کھلا ہُوا جادو ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بینات سے جو اِس آیت میں ہے معجزے مراد ہیں جن کو کافروں نے جادو کہا۔ صاحب تفسیر بیضاوی نے بھی ھذا کا اشارہ " الذی جئت بہ " کی طرف کیا ہے جس سے صاحب بیضاوی کے نزدیک بھی اس جگہ بینات سے معجزے مراد ہیں +

مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے، اوّل تو " ان ھذا " کا مشار الیہ " الذی جئت بہ " نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ظرف واقع ہُوا ہے " کففت " کا جیسے کہ خود صاحب بیضاوی نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، پس " ان ھذا " کا مشار الیہ مابہ کفف ہے نہ " الذی جئت بہ " کیونکہ " اِذ جئتھم " ظرف اور جزو زائد ہے جو کلام میں مقصود بالذات نہیں ہوتا، اور کفف خود فعل مسند ہے

وَجِبْرِيلَ	اور جبریل

جو مقصود بالذات ہے اور اس لئے ھذا کا اشارہ اُسی کی طرف اولی ہے +

غرضکہ حضرت عیسیٰ کا بنی اسرائیل کے حملہ سے بچ جانے کو جو اُنہوں نے اُن کے قتل کے ارادہ سے اس وقت کیا تھا جب کہ وہ احکام خدا اُن کو سُنا رہے تھے کافروں نے کھُلا ہُوا جادو بتایا، بیّنات کے لفظ سے اُس کو کچھ تعلق نہیں ہے +

دوسرے یہ کہ جب سادے طور سے تمام اس آیت پر نظر ڈالی جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ پر جو اکرام کئے تھے اُن کو اِذْ اِذْ کر کر بیان کیا ہے، اور اخیر کو جو قول کافروں کا تھا اُس کا ذکر کیا ہے، پس وہ قول اُنہی چیزوں سے متعلق ہے جن سے کہ وہ متعلق ہو سکتا ہے، نہ یہ کہ اُس سے کوئی خاص معنی لفظ بیّنات کے ثابت ہو سکتے ہیں +

دوسری آیت سورہ بنی اسرائیل کی ہے، جہاں خدا نے فرمایا ہے،، وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بھا الاولون، وآتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ فظلموا بھا وما نرسل بالآیات الا تخویفا،، اس آیت سے قاضی ابن رُشد نے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ادعائے نبوت کے ساتھ کوئی معجزہ کسی کو نہیں دکھلایا، جیسے کہ اوپر بیان ہوا ہے، اور اس سے پایا جاتا ہے، کہ قاضی ابن رُشد نے اِس آیت میں جو لفظ،، آیات،، ہے اُس سے معجزات مراد لئے ہیں۔ صاحب تفسیر بیضاوی نے بھی یہ سمجھا ہے کہ جو معجزات قریش نے طلب کئے تھے اس آیت میں لفظ بیّنات سے وہی معجزے مراد ہیں +

مگر اس تفسیر میں چند نقصان ہیں، اول تو یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خدا نے لوگوں کے نہ ماننے یا جھٹلانے سے کیوں معجزوں کا بھیجنا بند کر دیا۔ دوسرے یہ کہ آدم سے عیسیٰ تک برابر کیوں بھیجتا رہا، اور کیوں ایسی بیرحمی سے اگلوں کو غارت کرتا رہا، اس لئے میری سمجھ میں اس مقام پر بھی آیات کے معنی معجزات کے لینا صحیح نہیں، یہاں بھی احکام ہی کے معنی ہیں، جو حکم خاص کسی کو یا کسی قوم کو دیا گیا ہے وہ بھی آیت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسے کہ سورہ آل عمران سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زکریا سے جب کہ خدا نے کہا کہ تیرے بیٹا ہوگا، تو اُنہوں نے عرض کیا، ،، رب اجعل لی آیۃ،، یعنی اے پروردگار میرے لئے خاص آیت یعنی حکم مقرر کر، خدا نے کہا،، آیتک الا تکلم الناس ثلثۃ ایام الا رمزا،، یعنی تیری آیت یعنی تیرے لئے یہ حکم ہے کہ تین دن تک بجز اشارے کے کسی آدمی سے بات نہ کر۔ قوم ثمود کو جو احکام حضرت صالح نے نسبت ناقہ کے بتائے اُن کے سبب سے اُس پر بھی آیت کا اطلاق ہوا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے،، ھذہ ناقۃ اللہ لکم آیۃ،، کیونکہ وہ اونٹنی فی نفسہ کوئی معجزہ نہ تھی +

وَمِيْكٰلَ	اور میکائیل کا

پس اب اِس آیت پر غور کرنا چاہئے جس پر بحث ہے خدا تعالٰے نے تمام قرآن میں کوئی حکم خاص بنسبت کسی شخص کے یا خاص کسی قوم کے مخصوص نہیں کیا ہے، بلکہ تمام انسانوں کے لئے یکساں حکم ہیں، اور نہ کسی حکم میں کوئی خاص بات یا کسی امر کی نشانی کا ہونا بتایا ہے، برخلاف اس کے بعضی اگلی امتوں پر بعض احکام خاص خاص بطور نشانی کے تھے، پس خدا فرماتا ہے کہ ہم نے وہ احکام اس لئے نہیں بھیجے کہ اگلی قومیں جن پر وہ احکام تھے وہ اُس کو بجا نہیں لاسکیں۔ اور اُسی کے ساتھ بطور تمثیل کے قوم ثمود کا ذکر کیا ہے، جن کو حکم تھا کہ اونٹنی کو کھاتا پیتا پڑا پھرنے دیں اور کسی طرح ستاویں نہیں، اور پھر اخیر کو بتا دیا کہ وہ خاص احکام صرف ڈر قائم رکھنے کے لئے تھے نہ مقصود بالذات ❊

(۹۲) **وجبریل ومیکال** یہودیوں نے فرشتوں کے لئے نام مقرر کئے تھے، اور اُن کے ہاں سات فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں، مگر اس کا ثبوت نہیں ہے کہ کسی نبی نے اُن کو بتایا تھا، کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحف انبیا میں کوئی صفت صفات باری میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی، اور پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام منصور ہونے لگا، قرآن مجید میں اُن کا استعمال اُسی طرح پر ہوا ہے جس طرح کہ یہودی خیال کرتے تھے، مگر ہمارے ہاں کے علمانے بھی یہودیوں کی تقلید سے ان کو فرشتوں کے نام قرار دئیے ہیں، قرآن مجید میں صرف دو فرشتوں یعنی جبرئیل ومیکائیل کا نام آیا ہے، وہ دونوں فرشتے یہودیوں کے ہاں بھی اسی نام سے مشہور ہیں، صرف تلفظ کا فرق ہے، کیونکہ یہ دونوں نام دراصل عربی نہیں بلکہ عبرانی ہیں ❊

(جبریل) عبری زبان میں اس لفظ کے معنی قوۃ اللہ یا قدرۃ اللہ کے ہیں یہ لفظ دانیال[1] پیغمبر کی کتاب میں آیا ہے۔ حضرت دانیال نے سینگ وار مینڈھے اور سینگ دار بکرے کی لڑائی کا ایک خواب دیکھا تھا، اُسی خواب میں ایک شخص نے دریا کے کنارے سے پکار کر کہا کہ اے جبرئیل اس شخص یعنی دانیال کو اُس کے خواب کی تعبیر سمجھا دے، اور ایک اور دفعہ وہی شخص جس کا نام خواب میں حضرت دانیال نے جبرئیل سُنا تھا، اُن کا خواب سمجھانے کو اُن کے پاس آیا تھا، لوقا نے جو انجیل[2] لکھی ہے اُس کے پہلے باب میں جبرئیل کا ذکر ہے، جس نے الیشع حضرت زکریا کی بیوی کو حاملہ ہونے کی بشارت دی، اور پھر حضرت مریم کو بھی بیٹا ہونے کی خوشخبری سنائی۔ علمائے یہود کے نزدیک جبرئیل بنی اسرائیل کے لئے قابض ارواح ہیں، اور اُن کی روحیں

---

[1] دانیال باب ۸ ورس ۱۶ و باب ۹ ورس ۲۱ ❊ [2] لوقا باب ۱ ورس ۱۹ و ۲۶ ❊

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۲﴾	تو بیشک اللہ دشمن ہے کافروں کا ﴿۹۲﴾

اُنہی کے پاس رہتی ہیں، تالمد میں اُن کو ملک النار کہا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ رعد پر ان کی حکمرانی ہے، اور میووں کا پکانا اُن سے متعلق ہے۔ علمائے یہود یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جبرئیل بڑے زباندان ہیں، اور بابل میں جو لوگوں کی زبانیں ستر قسم کی ہوگئی تھیں، اُن سب کو یہ جانتے ہیں، اور حضرت یوسف کو وہ سب زبانیں انہیں نے سکھا دی تھیں، اور کلدانی اور سریانی زبان سوائے جبرئیل کے اور کسی فرشتہ کو نہیں آتی، غالباً زباندانی میں اُن کے مشہور ہونے کے سبب مسلمانوں نے تصور کیا ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیتیں خدا سے سُن کر یاد کر لیتے تھے اور آنحضرت کو آکر سُناتے تھے *

(میکائیل) کے معنی عبری میں ،، مس کا اللہ ،، کے ہیں دانیال[۵۱] کی کتاب میں اور اُن کے خوابوں میں یہ لفظ بھی آیا ہے، مشاہدات[۵۲] یوحنا میں بھی یہ لفظ ہے، اور لکھا ہے کہ آسمان پر لڑائی ہوئی، میکائیل اور اُس کے فرشتے اژدہے سے لڑے، اور اژدہے اُس کے فرشتوں سے لڑے، پس غالب نہ ہوئے، اور اُن کے لئے آسمان پر جگہ نہ رہی، اور یہودا[۵۳] نے میکائیل کی نسبت لکھا ہے کہ، ،، جب بڑے فرشتہ میکائیل نے شیطان کے ساتھ موسیٰ کی لاش کے حق میں تکرار کر کے گفتگو کی، تب اُس نے بدنامی کی نالش کرنے میں دلیری نہ کی، لیکن کہا اللہ تجھے ملامت کرے" *

بہرحال ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو الفاظ صفات باری پر مستعمل ہوئے تھے آخر کو اُنہی الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے۔ یہودی خیال کرتے تھے کہ میکائیل قوم بنی اسرائیل کا محافظ اور نگہبان ہے، اور جبرئیل کو سمجھتے تھے کہ وہ بنی اسرائیل کا مخالف ہے۔ اس سبب سے جبرئیل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اُس سے عداوت رکھتے تھے، اُسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ، جو کوئی جبرئیل کا یا میکائیل کا دشمن ہے بیشک خدا اُس کا دشمن ہے۔ مگر جبرئیل و میکائیل کا اس آیت میں حکایۃً نام ہونے سے اُن کے ایسے وجود واقعی پر جیسا کہ یہودیوں نے اور اُن کی پیروی سے مسلمانوں نے تصور کیا ہے استدلال نہیں ہوسکتا، جیسے کہ فرشتوں کی بحث کے بعد اُس کو بیان کرینگے *

(ملائکہ) فرشتوں کی نسبت بھی جو بحث ہے وہ نہایت ہی غور طلب ہے، قرآن مجید میں فرشتوں کا ذکر آیا ہے، اور اس لئے ہر ایک مسلمان کو جو قرآن پر یقین رکھتا ہے فرشتوں کے موجود

---

[۵۱] دانیال باب ۱ ورس ۱۳ *
[۵۲] مشاہدات یوحنا باب ۱۲ ورس ۷ *
[۵۳] یہودا ورس ۹ *

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۳﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور بیشک ہم نے بھیجی ہیں تیرے پاس کھلی ہوئی نشانیاں (یعنی احکام صریح) اور اُن سے انکار نہیں کرتے مگر فاسق ﴿۹۳﴾ اور کیا یہ نہیں ہے، کہ جب کبھی اُنہوں نے (یعنی یہودیوں نے) کسی عہد کا معاہدہ کیا، تو اُنہی میں کے ایک فرقہ نے اُس کو پھینک دیا، بلکہ اُن میں کے اکثر اُس پر یقین ہی نہیں کرتے ﴿۹۴﴾ اور جب کبھی اُن کے پاس خدا کے پاس سے کوئی پیغمبر آیا، اُس چیز کو سچ بتاتا ہوا جو اُن کے پاس ہے، تو اُن لوگوں میں کے ایک فریق نے جن کو کتاب کا (علم) دیا گیا تھا، خدا کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا، گویا کہ وہ اُس کو جانتے ہی نہیں ﴿۹۵﴾

اور اُن کے مخلوق ہونے پر یقین کرنا ضرور ہے، مگر جہاں تک بحث ہے اس پر بحث ہے کہ وہ کیسی مخلوق ہے۔ عام خیال مسلمانوں کا اور علماے اسلام کا یہ ہے کہ جس طرح انسان و حیوان جسم و صورت و شکل رکھتے ہیں، اسی طرح وہ بھی جسم اور صورت و شکل رکھتے ہیں، اور اُن کے پر بھی ہیں جن سے وہ اُڑ کر آسمان پر جاتے ہیں اور زمین پر اُتر آتے ہیں، اور خدا کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتے اور دنیا کے کام جو اُن سے متعلق ہیں کرتے پھرتے ہیں۔ اور حیوانات کے جسم اور اُن کے جسم میں اتنا ہی فرق ہے کہ اُن کا جسم محسوس نہیں ہوتا، نہ چھونے سے ہاتھ کو لگتا ہے، نہ دیکھنے سے آنکھ کو دکھائی دیتا ہے، اور باوجود اس قدر نازک ہونے کے وہ بہت بڑے بڑے اور نہایت مشکل مشکل کام کرتے ہیں، پہاڑ اُٹھا لیتے ہیں۔ زمین کو اُلٹ دیتے ہیں، اور اُن میں یہ بھی طاقت ہے کہ کبھی اپنے جسم کو ایسا کر لیتے ہیں کہ اُن کی اصلی صورت جو بہت بڑی خیال کی گئی ہے دکھائی دیجاتی ہے، اور اُن میں یہ بھی قدرت ہے کہ جس شخص کی صورت چاہیں بنا دیں، اور انسانوں کی طرح انسانوں کے پاس آ کر باتیں کریں۔

ہمارے پاس کسی ایسی مخلوق کے ہونے سے جو کسی قسم کا جسم و صورت بھی رکھتی ہو جو ہم کو نہ دکھائی دیتی ہو انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، پس ہم کہتے ہیں کہ شاید ایسی مخلوق ہو، مگر ہم ایسی مخلوق کے ہونے کا دعوے بھی نہیں کرتے، اور جو افعال ایسی مخلوق کی نسبت منسوب کئے

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ	اور پیروی کی اُس چیز کی جو شیاطین سلیمان کی سلطنت میں ٥ پڑھتے تھے (یہ سمجھ کر کہ سلیمان نے اُس کو کیا ہے) اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا جو آدمیوں کو جادو سکھاتے تھے اور اُس چیز کی (پیروی کی) جس کی نسبت وہ کہتے تھے) کہ بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر اُتاری گئی ہے،

جانتے ہیں اُن کا بھی اقرار نہیں کرتے کیونکہ اِن باتوں کے اثبات کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، قرآن مجید سے فرشتوں کے اس قسم کے وجود کا، اور اُن کے اس قسم کے جسم کا، اور اُنکے اِن افعال کا، جن کا اوپر ذکر ہوا کچھ ثبوت نہیں ہے +

فرشتوں کے اس قسم کے وجود اور افعال کا ثبوت ضرور ہے کہ دلیل نقلی سے ہوگا، اور اس لئے قبل شروع کرنے اس بحث کے ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمائے علم کلام نے جو بحث نسبت دلیل نقلی کے کی ہے اس مقام پر اُس کو نقل کریں +

شرح مواقف میں اس بات پر ایک بحث لکھی ہے، کہ دلائل نقلیہ جن سے مطالب پر استدلال کیا جاتا ہے مفید یقین ہیں یا نہیں ؟ معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کا یہ مذہب بیان کیا ہے کہ مفید نہیں، اور اُس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جن الفاظ سے استدلال کیا جاتا ہے اُن کی نسبت جاننا چاہئے کہ وہ اُنہی معنوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں جو معنی اُن سے لئے جاتے ہیں، اور اس بات کا بھی جاننا چاہئے کہ یہی معنی اُن سے مراد بھی ہیں، پہلی بات کے جاننے کے اصول تین ہیں، لغت اور صرف و نحو، اور یہ تینوں اصول روایت احاد سے ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً اصمعی اور خلیل و سیبویہ سے، اور اگر وہ صحیح بھی ہوں تو ممکن ہے کہ خود اہل عرب نے اُس میں غلطی کی ہو، اِس لئے کہ امراؤ القیس جو سب سے بڑا شاعر زمانہ جاہلیت کا تھا اُس نے کئی جگہ ان باتوں میں غلطی کی ہے۔ اور ان اصول کی فروعات قیاس پر مبنی ہیں، اور روایت احاد اور قیاس دونوں ظنی دلیلیں ہیں +

دوسری بات اِس پر موقوف ہے کہ جن معنوں کے لئے وہ لفظ وضع ہوئے تھے اُن معنوں سے کسی دوسرے معنی میں منتقل نہیں ہوئے۔ اور نیز وہ لفظ مشترک المعنی بھی نہیں ہیں، کیونکہ اگر مشترک المعنی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ جو معنی ہم نے سمجھے ہیں اُن سے وہ معنی مراد نہ ہوں، بلکہ دوسرے معنی مراد ہوں، اور نیز یہ بھی معلوم ہو کہ وہ مجازی معنوں میں بھی نہیں بولے گئے ہیں

٥ علی ملک سلیمان۔ ای علی عہدہ۔ ای زمانہ ملکہ۔ فالمضاف محذوف۔ او زمان سلیمان فالملک مجاز عن العہد و علی السقد بر ین علی بمعنی فی (بیضاوی و عصام) +

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى
يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ
بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا
هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ
مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ
وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ
فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا
شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (٩٦)
وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ (٩٧)

اور وہ کسی کو نہ سکھلاتے یہاں تک کہ کہتے، کہ ہم تو بجز فتنہ کے اور کچھ نہیں ہیں، پس تم کافر مت ہو، پھر اُن دونوں سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے جدائی ڈال دیں مرد میں اور اُس کی جورو میں، اور وہ اُس سے کسی کو ضرر نہیں پہنچاتے تھے بجز خدا کے حکم کے، اور اُن سے سیکھتے تھے وہ چیز جو اُن کو نقصان دیتی تھی، اور اُن کو نفع نہ پہنچاتی تھی، اور بیشک وہ جانتے ہیں کہ جس کسی نے جادو کو مول لیا اُس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہے، اور جس چیز کے بدلے اپنے آپ کو اُنہوں نے بیچ دیا بیشک وہ بُری ہے، کاش کہ وہ جانتے ہوتے (۹۶)

اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو بلاشبہ اللہ کے پاس کا ثواب بہتر تھا، کاش کہ وہ جانتے ہوتے (۹۷)

کیونکہ اگر مجازی معنوں میں بولے گئے ہوں تو اُن سے وہی معنی مراد ہونگے نہ حقیقی معنی جو اُن سے متبادر ہوتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو کہ کلام میں کوئی مستتر بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی شے مضمر ہو تو اُس کے معنی بدل جاوینگے، اور نیز وہاں کوئی تخصیص بھی نہ ہو، کیونکہ اگر کوئی تخصیص ہوگی تو جن چیزوں پر وہ لفظ دلالت کرتا ہے اُن میں سے بعض مراد ہونگے نہ کل، اور یہ کہ کلام میں تقدم و تاخر بھی نہ ہو، کیونکہ اگر کلام میں تقدم و تاخر ہوگا تو اُس کے معنی بھی پلٹ جاوینگے اور ان باتوں میں سے ہر ایک بات ایسی ہے جو فی الواقع کلام میں ہوتی ہے، اس لئے ضرورةً نقل مفید یقین نہیں ہوتی ٭

ان سب باتوں کے ہونے کے بعد اس بات کا جاننا بھی ضرور ہے کہ جس بات پر نقلی دلیل دلالت کرتی ہے اُس پر کوئی عقلی معارضہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی عقلی معارضہ پایا جاویگا تو ضرور عقلی دلیل پر اُس کو ترجیح ہوگی، اور اُس نقلی دلیل کو ضرور دوسرے معنوں میں تاویل کرنا پڑیگا، مثلاً یہ جو خدا کا قول ہے کہ ،، الرحمن علی العرش استوی،، یہ صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا تخت پر بیٹھا ہوا ہے، مگر دلیل عقلی اس کی معارض ہے اور خدا کا تخت پر بیٹھا ہوا ہونا عقلی دلیل سے محال ہے اس لئے اُس نقلی دلیل کی غلبہ یا بادشاہت سے تاویل کی گئی، اور اگر یوں نہ کیا جاوے تو اجتماع نقیضین یا ارتفاع نقیضین لازم آتا ہے، اور اگر دلیل نقلی کو عقل پر ترجیح دیں تو فرع سے اصل کا ابطال لازم آتا ہے کیونکہ جو چیزیں نقلی ہیں اُن کا اثبات بھی بجز عقل کے اور کسی طرح ممکن نہیں، پس نقل کے لئے بھی عقل

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾	اے لوگو جو ایمان لے آئے ہو تم "راعنا" کا لفظ مت کہو بلکہ "انظرنا" کا لفظ کہو اور اچھی طرح سنو اور کافروں کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہے ﴿۹۸﴾

ہی اصل ہے، اس لئے نقل کو ترجیح دینے سے اصل سے فرع کا ابطال لازم آتا ہے، اور فرع بھی اُس سے باطل ہو جاتی ہے، کیونکہ صحت نقل تو متفرع تھی عقل پر جس میں فساد ہونا مانا گیا تو نقل بھی مقطوع الصحت نہ رہی عقلی معارضہ کا نہ ہونا بھی یقینی نہیں ہے، کیونکہ غایت الغایت یہ ہے کہ باوجود تلاش کے کوئی معارض عقلی نہیں ملا، لیکن معارض عقلی کے نہ ملنے سے اُس کے نہ ہونے پر یقین نہیں ہو سکتا، اور اس سے ثابت ہوا کہ دلالت نقلی بلکہ عقلی بھی امور ظنی پر موقوف ہے، اور اس لئے دلالت نقلی اپنے مدلولات پر مفید یقین نہیں ہے +

صاحب شرح مواقف نے ان دلیلوں کے لکھنے کے بعد یہ لکھا ہے، کہ یہ دلیلیں ٹھیک نہیں ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ دلائل نقلی نسر عبارات میں اُن قرائن سے جو سعول میں مشاہدہ ہوتی ہیں، اور بطور تواتر کے ہم تک پہنچی ہیں، اور جن سے تمام احتمالات مذکورہ بالا جاتے رہتے ہیں مفید یقین ہوتی ہیں، کیونکہ تمام اہل لغت کے بیان سے ہم جانتے ہیں کہ جن معنوں میں لفظ ارض و سما کا اور اسی کی مانند جو اور مستعمل لفظ ہیں رسول خدا علیہ السلام کے وقت میں اُنہی معنوں میں مستعمل تھے جو معنی کہ اب اُن سے لئے جاتے ہیں، اور اس میں شک کرنا سفسطہ ہے جس کے غلط ہونے میں کچھ شبہ نہیں اور معارض عقلی کا نہ ہونا قائل کو یعنی پیغمبر کو صادق ماننے سے جانا جاتا ہے، کیونکہ اگر معارض عقلی کا ہونا خیال کیا جاوے تو قائل کا کذب لازم آتا ہے (ھٰذا محصل ما فی شرح المواقف) +

مگر جو کچھ نسبت دلیل نقلی کے مفید یقین ہونے کے شارح مواقف اور صاحب مواقف نے لکھا ہے وہ کسی قدر زیادہ غور کے قابل ہے، اس لئے کہ الفاظ مستعملہ کے جو معنی بطور تواتر اور بنقل اہل لغت ہم تک پہنچے ہیں وہ سمیات اُن الفاظ کے ہیں بالحاظ اُن کی ماہیات کی، مثلاً ارض و سما جو سب سے زیادہ مشہور و مستعمل الفاظ ہیں اُن کے معنی جو ہم تک بطور تواتر کے پہنچے ہیں وہ اسی قدر ہیں، کہ جس چیز پر ہم رہتے ہیں وہ ارض ہے، اور جو چیز ہم کو اپنے سر پر دکھائی دیتی ہے وہ سما یا آسمان ہے، اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ عرب قدیم اس قدر سے زیادہ اور کوئی معنی اُن لفظوں کے نہیں سمجھتے تھے، مگر اہل کلام نے اور فقہا اور علمائے اسلام نے صرف اسی قدر پر قناعت نہیں کی، بلکہ اُن کے معنوں میں وہ باتیں بھی شامل قرار دی ہیں جن کا غالباً خیال بھی عرب قدیم کو نہیں تھا، اور اس صورت میں اُن الفاظ کی دلالت اُن معنوں پر یقینی قطعی نہیں ہے +

الفاظ مشترک المعنی کی نسبت کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے اُن کا کسی ایک معنی

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۹۹﴾	نہیں دوست رکھتے اہل کتاب میں سے وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا ہے اور نہ مشرکین اس بات کو کہ اُتاری جاوے تم پر کچھ بھلائی تمہارے پروردگار سے اور اللہ مخصوص کرتا ہے اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۹۱﴾

پر مستعمل ہونے کو قطعی دلیل موجود ہو ٭

الفاظ کا مجازی معنوں میں مستعمل ہونا ایک ایسا وسیع امر ہے جس کی نسبت نہ نقل سے اور نہ اہل لغت کے تواتر نقل سے تصفیہ ہو سکتا ہے، اور یہی حال اضمار اور تخصیص اور تقدیم و تاخیر کا ہے ٭

ان سب سے زیادہ ایک اور امر ہے جس پر شارح مواقف اور صاحب مواقف بلکہ اور کسی نے بھی غور نہیں کیا، اور وہ کلام غیر مقصود ہے، مثلاً ایک شخص یہ بات کہے کہ جب آفتاب مغرب سے نکلے یا اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نکل جاوے تب یہ امر واقع ہوگا، اور مخاطب اُس کو یہ جواب دے کہ آفتاب کے مغرب سے نکلنے اور اونٹ کے سوئی کے ناکے میں سے نکلجانے پر بھی یہ امر واقع نہ ہوگا۔ اس کلام میں آفتاب کا مغرب سے نکلنا اور اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا کلام مقصود نہیں ہے، بلکہ عدم وقوع اس امر کا جس کے وقوع کا قائل مدعی تھا مقصود ہے۔ اور اس کلام سے تسلیم اس بات کی کہ درحقیقت کبھی آفتاب مغرب سے نکلیگا، یا اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نکلجاویگا، لازم نہیں آتی، پس دلیل نقلی میں اس بات کا علم بھی کہ وہ کلام غیر مقصود نہیں ہے اشد ضروریات میں سے ہے، اور بغیر اس کے کوئی نقلی دلیل مفید یقین نہیں ہو سکتی ٭

قرآن مجید میں اس قسم کا کلام غیر مقصود نہایت کثرت سے ہے، مشرکین اہل کتاب کے عندیہ میں بہت سی ایسی باتیں سمائی ہوئی تھیں جن کا دراصل کچھ وجود نہ تھا، یا وجود تھا، مگر اُس کی حقیقت کو وہ سمجھے ہوئے تھے دراصل وہ نہ تھی، یا وہ بات ظاہر میں دکھائی دیتی تھی، اور بطور غلط العام یا باعتبار مشاہدہ اُسی کو واقعی سمجھتے تھے، حالانکہ حقیقت اور اصلیت برخلاف اُس کے تھی۔ اور قرآن مجید کو اُس سے بحث مقصود نہ تھی، اس لئے اُس کو اُسی طرح بیان کیا، جس طرح مشرکین اور اہل کتاب خیال کرتے تھے، اور کبھی اُسی پر بطور حجت الزامی کے کلام مقصود کی بناء قائم کی، اور کبھی اُس کو بطور نظیر مسلمہ مخالف، کے اور کبھی بطور ایک مسئلہ غلط العام کے، اور کبھی بلحاظ مشاہدہ ظاہری کے، اس کو بیان کیا، اور کلام مقصود سمجھا یا گیا، پس کلام مقصود کے سوا جس قدر کلام ہے وہ سب کلام غیر مقصود ہے، اور اُس سے کوئی ثبوت کسی امر کی واقعیت کا حاصل نہیں ہوتا، اور نہ وہ کسی امر کے لئے مفید یقین ہوتا ہے، اور اس لئے دلیل نقلی کے مفید بالیقین ہونے کو قطع نظر اُن تمام باتوں کے جو

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ①	ہم آیت میں سے منسوخ کرتے ہیں یا ہم اُس کو بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا اُسی کی مانند لاتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ①

شارح مواقف اور صاحب مواقف نے بیان کی ہیں، اس بات کا علم کہ وہ کلام غیر مقصود نہیں ہے واجب و ضرور ہے۔ یہ امر جو ہم نے بیان کیا اس کو کچھ کلام اللہ ہی سے خصوصیت نہیں ہے، بلکہ عام کلام کا اور خود ہماری روزمرّہ گفتگو کا، بلکہ تمام دنیا اور تمام قوموں کی باہمی گفتگو و کلام کا یہی طریقہ ہے، کہ جو امر بحث سے اور مقصود سے خارج ہے اُس کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے قطع نظر کر کر کبھی بطور حکایت اور کبھی بطور تسلیم فرضی اور کبھی بغیر کسی خیال کے اُس کا ذکر اور بیان آجاتا ہے، اور اُس سے بجز اس کے کہ اُس کے بعد کلام مقصود بنایا جاویگا اور کچھ مقصد نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ بعض اشخاص غلطی سے سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بعض ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں کہ جو حقایق موجودہ کے برخلاف ہیں، اور بعضے اُس سے بھی زیادہ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اُس کو کلام مقصود سمجھ کر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ وہی در اصل حقائق موجودہ ہیں۔ اور در اصل دونوں غلطی پر ہیں، قرآن مجید بلاشبہ کلام اللہ ہے، مگر انسانوں کی زبان اور انسانوں کے کلام کے طرز پر، پس اُس کلام کو مثل ایک انسان کے کلام کے تصور کرنا چاہیئے، اور اُس سے معانی و مطالب و احکام و مقاصد اخذ کرنے اور اُس سے دلیلیں قائم کرنے میں اُس کو انسان کے کلام سے زیادہ کچھ رتبہ دینا نہیں چاہیئے +

اب ہم کو ملک اور ملائکہ کے لفظ سے اور جس طرح پر کہ فرشتوں کا خیال انسانوں کے دل میں پیدا ہوا اور جس طرح کا خیال یہودیوں اور عیسائیوں میں فرشتوں کی نسبت تھا اور جس طرح سے کہ اُن کا بیان قرآن مجید میں ہوا ہے اُس پر بحث کرنی چاہیئے۔ قدیم زمانہ کی تمام دنیا کی قوموں کا یہ حال تھا کہ جو امور عجیب و غریب اُن کے سامنے ایسے پیش آتے تھے جس کی علت اُن کی سمجھ سے باہر تھی، اُس کو کسی ایسی قوت یا ایسے شخص سے منسوب کرتے تھے جو انسان سے برتر اور خدا سے کمتر تھی، اسی خیال سے تمام بُت پرست قوموں نے اپنے ہاں خیالی دیوتا اور دیبیاں اور خدا پرست قوموں نے اپنے ہاں فرشتے نام کر لیئے +

ملک کے لفظ کی اصل اہل لغت ملاک بتاتے ہیں اور اُس کے معنی رسول یا پیغمبر یعنی پیغام پہنچانے والے کے کہتے ہیں، مگر اس لفظ کا اطلاق اُس شے پر ہوتا ہے جس کو خدا تعالےٰ نے اپنے مقاصد کے انجام کے واسطے یا اپنے وجود یا قدرت کے اظہار کے واسطے معین کیا ہو +

توریت اور صحف انبیا اور انجیل میں فرشتہ کے لفظ کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں آیا ہے

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۱﴾ اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۱۲﴾

کیا تو نہیں جانتا کہ خدا ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور نہ تمہارے لئے خدا کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار (۱۰۱) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے سوال کرو جیسا کہ اُس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیا گیا تھا اور جو کوئی ایمان کو کفر سے بدل لے تو بیشک وہ گمراہ ہوا سیدھی راہ سے (۱۰۲)

کتاب دوم شموئیل باب ۲۴ ورس ۱۶ و ۱۷ میں اور کتاب دوم ملوک باب ۱۹ ورس ۳۵ میں اور زبور داؤد باب ۷۸ ورس ۴۹ میں وبا پر فرشتہ کا اطلاق ہوا ہے، اور زبور داؤد باب ۱۰۴ ورس ۴ میں ہواؤں پر فرشتہ کا اطلاق کیا گیا ہے *

کتاب ایوب باب ۱ ورس ۱۴ و کتاب اول شموئیل باب ۱۱ ورس ۳ اور انجیل لوقا باب ۷ ورس ۲۴ و باب ۹ [illegible] فرشتہ کا لفظ عام ایلچیوں پر بولا گیا ہے، کتاب اشعیاہ باب ۴۲ ورس ۱۹ و کتاب حجی باب ۱ ورس ۱۳ و کتاب ملاکی باب ۳ میں فرشتہ کا لفظ پیغمبر یعنی انبیا کے معنوں میں آیا ہے، اور کتاب واعظ باب ۵ ورس ۶ و کتاب ملاکی باب ۲ ورس ۷ میں فرشتہ کا لفظ بمعنی کاہن یا امام کے مستعمل ہوا ہے، مشاہدات یوحنا باب ۱ ورس ۲۰ میں اور انجیل کے اور چند مقاموں میں فرشتہ کا لفظ حضرت عیسیٰ کے رسولوں پر بولا گیا ہے *

توریت میں بہت جگہ فرشتوں کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے پاس آئے اور ملاقات کرے اور باتیں کریں، توریت کی پہلی کتاب مسمّٰی بہ کتاب پیدائش باب ۳۲ میں فرشتہ کا بطور ایک شخص کے تمام رات حضرت یعقوب سے کشتی لڑنے کا اور اخیر کو اُن کی ٹانگ مروڑ ڈالنے کا ذکر لکھا ہے، اور ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے حضرت یعقوب کو بیماری نقرس یا وجع الورک کا ہونا مراد ہے، پس اگر یہ خیال صحیح ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ مرض پر بھی فرشتہ کا اطلاق ہوا ہے، اور اسی کتاب کے باب ۱۹ میں حضرت لوط کے پاس دو فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے جو مسافر آدمیوں کی صورت میں آئے تھے، اور حضرت لوط نے اپنے گھر میں اُن کو مہمان رکھا اور اُن کی ضیافت کی اور نان فطیری اُن کے لئے پکائی اور اُنہوں نے کھائی۔ بااینہمہ بہت جگہ فرشتہ کا لفظ ایسے وجود ہائے روحانی یا عقول فلکی کی نسبت مستعمل ہوا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس کے احکامات بجا لانے کے واسطے مامور ہیں *

ارواح کی نسبت قدیم یہودیوں کا خیال اس زمانہ کے خیال سے کسی قدر مختلف تھا، اس زمانہ

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۳﴾	اہل کتاب میں سے اکثر چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لے آنے کے بعد پھیر کر کافر بنا دیں اپنے جی سے آپ (تم پر) حسد کر کے بعد اس کے کہ اُن پر حق بات ظاہر ہوگئی پھر معاف کرو اور درگذر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم بھیجے بیشک اللہ سب چیز پر قادر ہے ﴿۱۰۳﴾

میں روح سے غیر مادی چیز خیال کی جاتی ہے، اور مادہ کو ضد روح اور روح کو ضد مادہ سمجھا جاتا ہے، مگر یہودی عبری لفظ ،، روح ،، سے غیر مادی شے مراد نہیں لیتے تھے، بلکہ غیر مرئی جسم سمجھتے تھے، اور اُن کے جوہر کو خالص ہوا یا رقیق آگ تصوّر کرتے تھے، اور اس لئے جب قدیم یہودی فرشتوں کو ارواح کہتے تھے تو اُن کے ذی جسم ہونے سے اُن کو انکار نہ تھا، بلکہ صرف مادہ غلیظ کی نجاستوں سے مبرّا ہونا سمجھتے تھے، سنٹ پال نے جو اپنے نامہ اول موسومہ کرنتھیاں باب ۱۵ ورس ۴۴ میں لکھا ہے، اُس سے پایا جاتا ہے کہ وہ بھی روحانی اجسام کو تسلیم کرتے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں روحانی عقول کا اکثر ذکر پایا جاتا ہے جن کی حالت وجود جداگانہ ہے، اور ایک آسمانی جماعت قرار دی گئی ہے جس کا سردار خود خدا ہے، کتاب دانیال باب ۷ ورس ۱۰ و انجیل متی باب ۲۶ ورس ۵۳ و انجیل لوقا باب ۲ ورس ۱۳ و نامہ عبرانیاں باب ۱۲ ورس ۲۲ و ۲۳ سے کروڑہا بلکہ کروڑہا در کروڑہا فرشتوں کا ہونا معلوم ہوتا ہے، اتنے بڑے جم غفیر کے اندر مختلف درجے اور مختلف صفتیں موجود ہونی ضرور ہیں، تاکہ انسان سے لیکر خدا تک ایسا سلسلہ وجود قائم ہو جاوے جو خالق اور کمترین ذی عقل مخلوق کی تفاوت کو مربوط کر دے، یہودیوں کی مقدس کتابوں میں فرشتوں کا ایسی جماعتوں میں منقسم ہونا مذکور ہے جن کی عزت اور قوت اور صفت غیر مساوی ہے، اور اُن پر سردار اور حکّام بھی ہیں ✦

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہودیوں کی قدیم کتب مقدسہ میں یعنی اُن کتابوں میں جو قید بابل سے بیشتر لکھی گئی ہیں یہ خیال صاف صاف بیان نہیں ہوا، بلکہ جو کتابیں جلاوطنی کے زمانہ میں اور اس کے بعد کو لکھی گئی ہیں اُن کتابوں میں اس خیال نے صورت پکڑی ہے، اور خصوصاً حضرت دانیال اور حضرت زکریا کی تحریرات میں اس خیال کا پتہ ملتا ہے، کتاب زکریا باب ۱ ورس ۱۱ میں ایک فرشتہ سب سے اعلےٰ درجہ کا ہے جو خدا کے روبرو کھڑا رہتا ہے، اور اَوْر فرشتوں سے بطور اپنے کارندوں کے کام لیتا ہے، حضرت دانیال نے حضرت میکائیل فرشتہ کو بہت بڑے بڑے لقب عطا فرمائے ہیں، نامہ یہودہ ورس ۹ اور اول نامہ تھسلینی کے باب ۲۱ ورس ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رائے کہ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۰۴﴾	پڑھتے رہو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ تم اپنے لئے نیکیوں میں سے آگے بھیجو گے تو اُس کو اللہ کے پاس پاؤ گے بیشک جو تم کرتے ہو اللہ اُس کو دیکھتا ہے ﴿۱۰۴﴾

فرشتے مختلف درجہ رکھتے ہیں صرف یہودیوں کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی، بلکہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کا بھی یہی خیال تھا، ہاں اس قدر ٹھیک ہے کہ متاخرین یہودیوں نے جو رتبے کی تقسیم فرشتوں میں قائم کی ہے وہ حواریوں کے وقت میں نہ تھی +

یہودیوں کی کتب مقدسہ میں فرشتے ہمیشہ مجسم ہو کر انسانی صورت میں دکھائی دیتے تھے، اور کسی جگہ اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ یہ اجسام حقیقی نہ تھے متقدمین یہودی بیشک یہ جانتے تھے، کہ ان اجسام کا مادہ ہمارے اجسام کے مادہ کی مانند نہیں ہے، کیونکہ فرشتوں میں یہ قدرت ہے کہ جب چاہیں اپنے تئیں لوگوں کو دکھلا دیں اور جب چاہیں نگاہوں سے غائب ہو جاویں عیسائی بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ یقین کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد اُٹھے تو کبھی اُن کا جسم حواریوں کو دکھائی دیتا تھا اور کبھی نگاہ سے غائب ہو جاتا تھا، اگرچہ وہ ہمیشہ انسان ہی کی صورت پر دکھائی دیتے تھے، مگر یہودیوں نے اس سے یہ بات لازم نہیں تصور کی تھی، کہ فرشتے انسان ہی کی صورت رکھتے ہیں، بلکہ متقدمین یہودی یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو چیز خالص روح نہیں ہے کوئی نہ کوئی شکل ضرور رکھیگی، ممکن ہے کہ اُن کی صورت انسان ہی کی سی ہو یا اور کسی شکل کی +

یہودیوں کی کتب مقدسہ میں اناث ملائکہ کا ذکر نہیں پایا جاتا، اور عیسائی بھی بدلیل انجیل متی باب ۲۲ ورس ۱۳ بطور استنباط کے یہی سمجھتے ہیں، کہ فرشتوں میں ذکور و اناث کی کچھ تمیز نہیں ہے۔ کتب مقدسہ میں غالباً اس وجہ سے کہ مذکر کا صیغہ زیادہ معزز ہے، فرشتوں کی نسبت مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، مگر اکثر بُت پرست قومیں فرشتوں کو ذکور اور اناث قرار دیتی ہیں، اور دیوتا اور دیبی کا ماننا اُن خیالات کو ظاہر کرتا ہے +

عیسائی اور یہودی دونوں، فرشتوں میں ان صفات کو تسلیم کرتے ہیں۔ انسان سے اُنکا عقل کا زیادہ ہونا۔ اُن کا قوت اور قدرت میں زیادہ ہونا۔ اُن کا پاک اور برگزیدہ ہونا۔ اور یہ بات کہ فرشتے خدا تعالیٰ کے منشا اور مرضی کے اظہار کے ذریعے ہیں، کتب مقدسہ یہودیوں اور عیسائیوں سے بخوبی معلوم ہوتی ہے، اور اسی سبب سے بعض کاموں کو اُن کتابوں میں بالکل فرشتوں ہی کی طرف منسوب کیا ہے، انسانوں کے معصوم کے متعلق امورات میں بھی اُن کی وساطت ہوتی ہے۔ یہودی اور

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵﴾ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۶﴾	اور اُنھوں نے کہا کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہیں جانے کا بجز یہودیوں اور عیسائیوں کے، یہ اُن کی تمنا ہے (اے پیغمبر تو اُن سے) کہدے کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو ﴿۱۵﴾ یہ نہیں ہے جو انھوں نے کہا، ہاں جس کسی نے تابعداری سے اپنا مُنہ خدا کے سامنے کیا اور وہ نیکی کرنے والا ہے تو اُس کا ثواب اُس کے پروردگار کے پاس ہے، اور نہ اُن پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے ﴿۱۶﴾

عیسائی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ گو فرشتوں کی وساطت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو، تب بھی اُن کی وساطت تسلیم ہوسکتی ہے، کیونکہ عبرانیوں کے خط کے باب اول ورس ۱۴ و زبور داؤد باب ۳۴ ورس ۷ و باب ۹۱ ورس ۱۱ و انجیل متی باب ۸ ورس ۱۰ میں لکھا ہے، کہ خدا تعالیٰ فرشتوں کو نجات کے وارثوں کی خدمت کے لئے بھیجتا ہے ❖

قدیم عیسائی سمجھتے تھے کہ ہر فرد بشر کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اُس کی حفاظت پر متعین ہے، مشرکین کا بھی اسی کے قریب قریب عقیدہ تھا، یونانی اپنے محافظ دیوتا کو "ڈیمن" اور رومی "جینیس" کہتے تھے، اور یہودی اور قدیم عیسائی یہ بھی سمجھتے تھے، ہر انسان پر دو فرشتے متعین ہوتے ہیں ایک نیکی کا، اور ایک بدی کا، عام یہودی بھی فرشتوں کی نسبت یہی اعتقاد رکھتے ہیں، مگر ایک فرقہ یہودیوں کا جو صدوقی نام سے مشہور تھا وہ فرشتوں کا منکر تھا ❖

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ یہودیوں کا یہ دستور ہے، کہ خدا کی عظمت اور قدرت کے ہر ظہور کو فرشتوں کی وساطت کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اس لئے وہ فرشتوں کے وجود اصلی کو نہیں مانتے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی قدرت کی غیر معلوم قوتوں کا نام فرشتہ رکھ دیا ہے، جیسے کہ مشرک ہر چیز کو جو عجیب و غریب ہوتی ہے، اور جس کی علت اُن کے فہم سے باہر ہوتی ہے، دیوتاؤں کے کاموں کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر عیسائی مذہب کے عالم اس کی تردید میں یہودیوں کی کتب مقدسہ اور انجیل کی وہ[1] آیتیں پیش کرتے ہیں، جن میں فرشتوں کے ایسے کام بیان کئے گئے ہیں جو کسی طرح اس رائے کے مطابق نہیں ہوسکتے، وہ بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ فرشتوں سے برتر ہیں، پس اگر فرشتوں کا کوئی وجود اصلی نہ ہو تو یہ

[1] کتاب پیدایش باب ۱۹ ورس ۷ و ۱۲ کتاب قضاۃ باب ۱۳ ورس ۱۰ و ۲۱ انجیل متی باب ۲۸ ورس ۲ و ۴ و باب ۲۲ ورس ۳ و اعمال باب ۱۸ ورس ۸ ❖

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور یہودیوں نے کہا کہ عیسائی کسی چیز پر نہیں ہیں، اور عیسائیوں نے کہا کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں، حالانکہ وہ (دونوں) کتاب (یعنی توریت) پڑھتے ہیں، اسی طرح اُن کے قول کی مانند اُن لوگوں نے کہا جو نہیں جانتے (یعنی مشرکین نے جو توریت کو نہیں جانتے یہ کہا کہ یہودی اور عیسائی دونوں کسی چیز پر نہیں ہیں) پس اللہ اُن میں قیامت کے دن اُس چیز کا فیصلہ کریگا جس میں کہ وہ اختلاف کرتے ہیں ﴿۱۰۷﴾

کہنا مہمل ہو جاتا ہے *

اب ہم کو اس بات کی تلاش کرنی ہے، کہ قدیم مشرکین عرب کا یعنی اُس زمانہ کے عربوں کا جب کہ یہودیوں کا میل جول عرب میں نہیں ہوا تھا، فرشتوں کی نسبت کیا خیال تھا، اور آیا وہ لفظ ملک اور ملائکہ کو اُنہیں معنوں میں خیال کرتے تھے جن معنوں میں کہ یہودی خیال کرنے تھے یا نہیں،

جہاں تک کہ ہم نے تفتیش کی ہے قدیم عربوں کا لفظ ملک اور ملائکہ کی نسبت ایسا خیال جیسا کہ یہودیوں کا ہے ثابت نہیں ہوا، مشرکین عرب بلاشبہ ارواح فلکی کو یا ارواح فرضی کو یا ارواح اشخاص متوفی کو بطور خدا کے پوجتے تھے اور اُن کو مجسّم و متحیز سمجھتے تھے، اور اُن کے بت اور اُن کے نام کے تھان اور اُن کے نام سے ہیکل اور مندر بناتے تھے، مگر اُن پر کبھی لفظ ملک یا ملائکہ کا اطلاق نہیں کرتے تھے، جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اشعار جاہلیت پر بھی جس قدر کہ ہم کو دستیاب ہوئے غور کی، ہم کو کوئی شعر بھی ایسا نہیں ملا جس میں لفظ ملک یا ملائکہ کا ان ارواحوں پر جن کو وہ پوجتے تھے اطلاق کیا گیا ہو، ہم کو قرآن مجید میں بھی کوئی ایسی سند نہیں ملی جس میں منقولاً زبان مشرکین لفظ ملک یا ملائکہ کا اُن ارواحوں پر اطلاق کیا گیا ہو، ہاں یہ بات تو تسلیم کی جا سکتی ہے کہ لغت کی کتابوں میں لفظ ملک کے معنی ایلچی یا رسول یا پیغامچی کے لکھے ہیں، مگر یہ تسلیم نہیں ہو سکتا کہ قدیم مشرکین عرب اُس کا اطلاق اس قسم کے رسولوں پر کرتے ہیں جن کو یہودی ملک یا ملائکہ کہتے تھے، ہاں اس قدر بات تسلیم ہو سکتی ہے کہ قدیم عرب اور نیز رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے عرب بھی ملائکہ کا اطلاق اُن قوا پر جن سے از روے قانون قدرت دنیا کے امورات انجام پاتے ہیں کرتے تھے، جیسے کہ ابو عبیدہ جاہلی کے اس شعر میں ہے:-

لست لانسی ولکن لملاك تنزل فی جو السماء یصوب

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۹)	کون اُس سے زیادہ ظالم ہے جس نے روک دیا اللہ کی مسجدوں کو اس بات سے کہ اُن میں اللہ کے نام کی یاد کی جاوے، اور اُن کے خراب کرنے میں کوشش کی، یہی لوگ ہیں جن کے لئے نہیں ہے کہ اُن میں جاویں مگر ڈرتے ہوئے، اُن کے لئے دنیا میں خرابی ہے اور اُن کے لئے آخرت میں بڑا عذاب (۱۰۸)

صوب کہتے ہیں مینہ کو اس لئے اس شعر سے پایا جاتا ہے کہ مینہ برسانے کی جو قوت ہے اُس کو فرشتہ سمجھتے تھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب فرشتوں کو متحیز بھی سمجھتے تھے جیسے کہ اُمیۃ ابن صلت جاہلی کے اس شعر میں :-

فکان برقع والملائک حولہ   سد دنوا کلہ القوائم اجرب

مگر اس بات کا کہ وہ اُنہی معنی اور مراد میں استعمال کرتے تھے، جن میں کہ یہودی استعمال کرتے تھے، ہنوز ثبوت طلب ہے، اس خیال کے ثبوت پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ فرشتوں کا کوئی نام عربی زبان کا نہیں ہے، اور جبریل و میکائیل یہ دو نام جو قرآن میں آئے ہیں وہ عبری ہیں اور اسرافیل و عزرائیل اور اور نام جو مسلمانوں میں مشہور ہیں سب عبرانی زبان کے ہیں، پس انہی اصول پر جو شارح مواقف اور صاحب مواقف نے قرار دئے ہیں، اہل لغت کا یہ لکھنا کہ "الملائک الملائک لانہ یبلغ عن اللہ تعالیٰ" مفید یقین نہیں ٭

فقہ اللغۃ میں ملائکہ کی نسبت اہل عرب کا جو خیال لکھا ہے وہ بالکل ہمارے اس بیان کے مطابق ہے، اُس میں ابی عثمان الجاحظ کا قول لکھا ہے "کہ عرب جن کے درجے قرار دیتے تھے، جب کہ وہ عام طور پر جن کا ذکر کرتے تھے تو صرف لفظ جن بولتے تھے، اور جب ایسے جن کا ذکر کرتے تھے جو انسانوں کے ساتھ رہتا ہو تو اُس کے لئے عامر کا لفظ بولتے تھے جس کی جمع عمار ہے، اور جب ایسے جن کا ذکر کرتے تھے جو بچوں کو ستاتا ہے تو اُس کے لئے ارواح کا لفظ بولتے تھے، اور جب کہ وہ خبیث ہوتا اور تکلیف دیتا تھا تو اُس پر شیطان کا اطلاق کرتے تھے، اور جب اِس سے بھی سخت تکلیف دیتا تھا تو اُس کو مارد کہتے تھے اور جو اُس سے بھی زیادہ قوی ہوتا تھا اُس کو عفریت کہتے تھے، اور اگر وہ پاک ستھرا ہوتا تھا اور بالکل بھلائی اُس سے پہنچتی تھی تو

عن ابی عثمان الجاحظ قال ان العرب تنزل الجن مراتب فاذا ذکروا الجن قالوا جن واذا ارادوا انہ یسکن مع الناس قالوا عامر والجمع عمار فان کان ممن یتعرض للصبیان قالوا ارواح فان خبث وتعرم قالوا شیطان فان زاد علی ذلک قالوا مارد فان زاد علی القوۃ قالوا عفریت فان طہر ونظف وصار خیرا کلہ قالوا ملک (وفی مقام آخر) روی الحکم بن ابان عن عکرمۃ عن ابن عباس ان ابلیس کان یقول سروات الجن بنات الرحمن ٭

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۱﴾	اور خدا کے لئے ہے مشرق اور مغرب، پس جدھر منہ کرو پھر اُدھر ہی خدا کا مُنہ (یعنی اُس کی ذات) ہے، بیشک اللہ (سب طرف) پھیلنے والا ہے جاننے والا ﴿۱۰۹﴾ اور اُنہیں نے کہا کہ اللہ نے بنا لیا ہے بیٹا، پاک ہے وہ بلکہ اُسی کے لئے ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُس کے لئے فرمانبردار ہیں ﴿۱۱۰﴾ پیدا کرنیوالا ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب کرنا چاہتا ہے کوئی کام تو صرف اُس کو کہتا ہے کہ ہو، پھر وہ ہو جاتا ہے ﴿۱۱۱﴾

تو اُس کو ملک کہتے تھے، اور ایک اور مقام میں لکھا ہے، کہ حکم بن ابان نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے "کہ قریش جن کے سرداروں کو بنات الرحمٰن یعنی خدا کی بیٹیاں کہتے تھے" اِس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عرب اُن غیر مرئی چیزوں کو جن کو نیک و پاکیزہ سمجھتے تھے، اور جنسے خلقت کو بھلائی اور نیکی پہنچنے کا خیال کرتے تھے اُن کو ملک کہتے تھے، مگر وہ معنی اور مراد جو ملک کے لفظ سے یہودیوں نے مقرر کئے تھے یا جو زمانہ اسلام کی کئی صدی بعد کی مصنفہ کتب لغت میں لکھ دئے گئے ہیں اُس معنی و مراد میں عرب لفظ ملک کو استعمال نہیں کرتے تھے۔

قرآن مجید میں کلام مقصود میں کسی جگہ لفظ ملک یا ملائکہ کا اُس مراد سے استعمال نہیں ہوا ہے جو مراد کہ یہودیوں نے قرار دی تھی، جس کی تفسیر ہم ہر ایک مقام پر لکھینگے، بلکہ برخلاف اُس کے ملائکہ کا اطلاق اُن قدرتی قوا پر جن سے انتظام عالم مربوط ہے، اور اُن شیون قدرت کاملہ پر ہوا ہے جو اُس کی ہر ایک مخلوق میں بہ تفاوت درجہ ظاہر ہوتی ہیں ملائکہ کا اطلاق ہوا ہے، سورۂ والنازعات سے اس کا بخوبی ثبوت ہوتا ہے، اُس کے پہلے چار جملوں کی نسبت مفسرین میں اختلاف ہے، مگر پانچویں جملہ "فالمدبرات امرا" کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں، اور جملہ مفسرین متفق ہیں کہ "مدبرات" سے ملائکہ مراد ہیں، پس اب غور کرنا چاہئے کہ مدبرات امور کون ہیں، یہی قوا ہیں جن کو خدا تعالےٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے تمام امور عالم کا مدبر مخلوق کیا ہے۔

ان آیتوں میں جن کی تفسیر ہم لکھتے ہیں کلام مقصود صرف اس قدر ہے، کہ جو شخص اُس وحی کا عدو ہو جو خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالی ہے، اور جو کوئی خدا اور اُس کے فرشتوں اور اُس کے رسولوں کا دشمن ہو، تو بیشک اللہ اُن کافروں کا دشمن ہے، یہودیوں

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور اُن لوگوں نے کہا جو نہیں جانتے، کیوں نہیں خدا ہم سے کلام کرتا، یا کیوں نہیں ہمارے پاس کوئی نشانی آتی، اسی طرح اُن کے قول کی مانند اُن لوگوں نے کہا جو اُن سے پہلے تھے ایک سے ہو گئے اُن کے دل، بیشک ہم نے بیان کیں نشانیاں اُن لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں ﴿۱۱۲﴾

نے اپنے عندیہ میں دو جداگانہ فرشتے ٹھیرا رکھے تھے، ایک جبرئیل، اور ایک میکائیل، پچھلے کو اپنا دوست جانتے تھے اور پہلے کو اپنا دشمن، اور جو کہ دین محمدی کو وہ اپنے برخلاف خیال کرتے تھے تو یہ سمجھتے تھے کہ جبرئیل جو ہمارا دشمن ہے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں سکھاتا ہے خدا نے پیغمبر سے کہا کہ،، تو کہہ دے کہ ہاں جبرئیل ہی اللہ کے حکم سے میرے دل میں یہ باتیں ڈالتا ہے، مگر جو کوئی کہ اُن باتوں کا اور فرشتوں کا اور جبرئیل و میکائیل کا اور رسولوں کا دشمن ہے، خدا اس کا دشمن ہے "۔ فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل اور میکائیل کا بالتخصیص نام لینا گویا یہودیوں کے خیالات کا اعادہ ہے، اور وہ نام مقصود بالذات نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہودیوں کا یہ خیال نہ ہوتا تو غالباً وہ نام نہ لئے جاتے۔ پس اُن دونوں کے نام قرآن مجید میں آنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ درحقیقت اس نام کے دو فرشتے مع تشخص یا علیحدہ علیحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے کہ زید و عمر، بلکہ انہی آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ جس شے کو یہودی جبرئیل تعبیر کرتے تھے وہ کوئی جداگانہ مخلوق مع تشخص نہ تھی کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ،، بیشک اُس نے (یعنی جبرئیل نے) ڈالا ہے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے (وہ کلام جو) سچ بتاتا ہے اُس چیز کو جو اُس سے پیشتر ہے،، دل میں ڈالنے والی کوئی ایسی مخلوق جو اُس شخص سے جس کے دل میں ڈالا گیا ہے، جداگانہ ہو، نہیں ہوتی۔ پس درحقیقت یہودی جس کو جبرئیل کہتے تھے اور جس کا نام حکایتاً خدا نے بیان کیا ہے، وہ ملکۂ نبوت خود آنحضرت میں تھا جو وحی کا باعث تھا، اس سے اگلی آیت میں خدا تعالےٰ نے بلا ذکر جبرئیل کے فرمایا ہے ،، کہ بیشک ہم نے بھیجی ہیں تیرے پاس کھُلی ہوئی نشانیاں،،۔ ان وجوہات سے یہ بات کہ جبرئیل درحقیقت کسی فرشتہ کا نام ہے ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اس قدر تسلیم ہو سکتا ہے کہ اُسی ملکۂ نبوت پر جبرئیل کا اطلاق ہوا ہے۔ کیا یہ عجب کی بات نہیں ہے، کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتوں کے سوا اور بھی بہت سے فرشتے ہیں، مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں، کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا۔ حضرت عزرائیل بھی بڑے مشہور فرشتے ہیں، جو سب کے پاس آوینگے اور کسی کو نہیں چھوڑینگے، اگرچہ اُن کا ذکر بلفظ ملک الموت قرآن میں آیا ہے، مگر اُن کا کچھ نام

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿۱۱۳﴾ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُم بَعْدَ ٱلَّذِى جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۱۴﴾

بیشک ہم نے تجھ کو بھیجا ہے، سچ بات سے خوشخبری دینے والا، اور ڈرانے والا، اور تجھ سے باز پرس نہ ہوگی دوزخ میں پڑنے والوں کی ﴿۱۱۳﴾ اور ہرگز تجھ سے یہود راضی نہ ہونگے، اور نہ عیسائی، یہاں تک کہ تو اُن کے مذہب کی پیروی کرے، کہہ دے کہ بیشک اللہ کی ہدایت وہی ہدایت ہے، اور اگر تو اُن کی خواہشوں کی پیروی کرے، اُس چیز کے بعد جو آگئی ہے تیرے پاس علم کی نہیں تیرے لیئے اللہ سے (بچانے کو) کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۱۴﴾

نہیں بیان ہُوا ہے۔ ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کئے ہوئے ہیں، جو مختلف قوا کے تعبر کرنے کو اُنھوں نے رکھ لئے تھے *

(۹۹) (واتبعوا) اس آیت سے ستانویں آیت تک دو زمانے کے لوگوں کا ذکر ہے ایک اُس زمانہ کے یہودیوں کا جو حضرت سلیمان کے وقت میں اور اُن کے بعد تھے، اور ایک اُن لوگوں کا جو ہاروت وماروت کے زمانہ میں تھے، مگر سب سے اول پہلی آیت کے معنی سمجھنے چاہئیں خدا نے فرمایا، "کہ پیروی کی اُس چیز کی جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کی نسبت پڑھتے تھے، اور سلیمان نے کفر نہیں کیا،" اس آیت میں تین لفظ ہیں، ما۔ تتلوا۔ کفر، تتلو کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ اور اسی لفظ سے بعض مفسرین نے۔ ما۔ کے لفظ سے جھوٹی کتابیں یا جھوٹی تحریریں مراد لی ہیں، اور کفر، کے لفظ سے لکھنا مراد لیا ہے، اور اس تفسیر کے مطابق آیت کا ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ، "پیروی کی اُن جھوٹی کتابوں یا تحریروں کی جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کی نسبت پڑھتے تھے، اور سلیمان نے کوئی کفر کی بات نہیں لکھی، بلکہ شیاطین نے کفر کی باتیں لکھی تھیں" اس طرح پر آیت کے معنی قرار دینے بالکل صحیح ودرست ہیں، مگر چونکہ آیت میں کوئی قید نہیں ہے اور۔ تتلو۔ کے لفظ سے لکھے ہوئے ہی کا پڑھنا لازم نہیں آتا، بلکہ زبانی پڑھنے پر بھی اطلاق ہوسکتا ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بھی اُسی طرح عام لفظ سے کیا ہے جیسے کہ قرآن میں ہے *

لیکن خدا نے جو یہ فرمایا ہے کہ، "وماکفر سلیمان" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ لوگ پڑھتے تھے اُس کی نسبت سمجھتے تھے کہ سلیمان نے اُس کو کیا یا کہا یا لکھا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ سمجھتے، بلکہ شیطانوں ہی کا فعل سمجھتے، تو سلیمان کو اُس سے بری کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، پس تقدیر آیت کی یوں ہوئی کہ، "واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک سلیمان"

الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۱۵﴾	وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب (یعنی توریت) دی ہے، اُس کو پڑھتے ہیں جیسا پڑھنے کا حق ہے وہی لوگ اُس پر یقین رکھتے ہیں، اور جو اُس کے منکر ہیں، وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں ﴿۱۱۵﴾

نظھم انہ من سلیمان۔" وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا"، یعنی اور پیروی کی اُس چیز کی جو شیاطین ملک سلیمان کی نسبت پڑھتے تھے یہ سمجھ کر کہ سلیمان نے اُس کو کیا ہے، حالانکہ سلیمان نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین نے کفر کیا +

اس کے آگے لفظ ہے"، وما انزل علی الملکین"، مگر بسیاق اس کلام کے جو اُس کے اُوپر ہے، اُس کا صاف یہ مطلب پایا جاتا ہے کہ" واتبعوا ما انزل بظنھم علی الملکین " یعنی پیروی کی اُس چیز کی جس کی نسبت وہ گمان کرتے تھے کہ دو فرشتوں پر اُتاری گئی ہے، پس اُس سے یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ درحقیقت خدا کی جانب سے کوئی چیز اُن فرشتوں پر اُتاری گئی تھی، بلکہ صرف یہ پایا جاتا ہے، کہ جس طرح وہ لوگ اُن چیزوں کو سمجھتے تھے کہ وہ سلیمان سے ہیں، حالانکہ سلیمان سے نہیں تھیں، اسی طرح دونوں فرشتوں کی نسبت بھی سمجھتے تھے، کہ خدا کی طرف سے وہ علم اُن کو دیا گیا ہے، حالانکہ خدا کی طرف سے کچھ نہیں دیا گیا تھا +

یہ معنی جو ہم نے بیان کئے ہیں ایسے صاف اور صریح ہیں، کہ کوئی شخص بھی اُن کے صاف اور صریح اور سیدھے ہونے میں کلام نہیں کر سکتا، اور کسی قسم کی تاویل بھی اس میں نہیں ہے، الفاظ سے اور عبارت سے وسیاق کلام سے جو صریح معنی نکلتے ہیں، وہ بیان کئے ہیں، پس مخالفین قرآن نے جو یہ اعتراض کیا ہے، کہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے، کہ خدا لوگوں کو جادو بھی سکھاتا ہے، اور ایسا ناپاک کام خدا نازل کرتا ہے، وہ ایک لغو وبیہودہ ناسمجھی کا اعتراض ہے، ہاں اس میں کچھ شک نہیں، کہ ہمارے مفسرین نے بہت سی لغو باتیں اور جھوٹی روایتیں اور یہودیوں اور مجوسیوں کی حکایتیں اپنی تفسیروں میں بھر دی ہیں، جن کا الزام خود اُن مفسروں پر ہے نہ قرآن پر +

حضرت سلیمان کا زمانہ ایک ابتر حالت میں ہو گیا تھا۔ کافروں کو موافق اپنے مذہب اور عقائد کے پوجا پاٹ اور بُت پرستی کرنے سے کچھ ممانعت نہ تھی، خود حضرت سلیمان نے نہایت کثرت سے بیویاں کر لی تھیں، اور بُت پرست عورتوں کو بھی اپنی بیویاں بنایا تھا۔ عمونی قوم کی اور موابی قوم کی اور صیدانی قوم کی بیویاں اُن کے گھر میں تھیں، اور وہ اپنے محلوں میں بُت پرستی کرتی تھیں، اور اس سبب سے گویا شاہی محل میں بُت پرستی ہونے لگی تھی،

ترجمہ	آیت
اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تم کو دی ہیں، اور میں نے تم کو تمام عالموں پر بزرگی دی ہے (۱۱۶)	یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (۱۱۶)

مگر خود حضرت سلیمان خدا کا نہایت ادب کرتے تھے، اور اُس کے نام کی کسی چیز کو بُت پرستی کی آلایش میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے، یہاں تک کہ اُس محل میں جس میں حضرت داؤد رہتے تھے ایک دفعہ تابوت سکینہ آیا تھا تو اُس کے ادب سے اُنہوں نے اپنی ایک بت پرست بیوی کو وہاں رکھنا پسند نہیں کیا، اور اُس کے لئے جُدا محل بنایا +

سلیمان کی سلطنت اگرچہ بہت بڑی اور قوی تھی، لیکن اُس میں بھی خرابیاں ہو گئی تھیں، حضرت داؤد جب نہایت ضعیف ہو گئے تو ادونیاہ اُن کے بڑے بیٹے نے یواب اور ابیاتار کی سازش سے تخت پر بیٹھنا چاہا، مگر حضرت سلیمان کی ماں نے جاکر حضرت داؤد کو خبر کی، اور سلیمان کو تخت پر بٹھلانے کی درخواست کی، اور حضرت داؤد نے سلیمان کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت دیدی، اور بنایاہ اور صادوق اور ناتان نبی نے حضرت سلیمان کو تخت پر بٹھادیا، مگر ادونیاہ اور یواب اور ابیاتار دلوں میں مخالف تھے، اور گویا دو گروہ خدا پرستوں کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں قائم ہو گئے تھے، اور تیسرا گروہ بت پرستوں کا موجود تھا، اور گویا حضرت سلیمان کے تیرگروں میں یا ساتھیوں میں شمار ہوتا تھا +

یہ سب واقعات تاریخی ہیں، اور ایسے واقعات کا مقتضا یہ ہے کہ ہر ایک گروہ کے مجمعے جدا جدا قائم ہو گئے ہونگے، اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے اپنے رازوں کو مخفی رکھتا ہوگا۔ یہی بنا معلوم ہوتی ہے جس کے سبب حضرت سلیمان کے وقت میں وہ مجمع قائم ہو گیا تھا جس کو اس زمانہ میں فری میسن کہتے ہیں، اور ہمارے ملک کے لوگوں نے جادوگھر اُس کا نام رکھا ہے اس قسم کا مجمع راز حیرام بادشاہ صور کے ہاں بھی تھا۔ یہ بادشاہ حضرت داؤد کا بہت دوست تھا، اور کچھ عجب نہیں کہ وہیں سے اس مجمع راز کے قائم کرنے کو اخذ کیا ہو، اور فیثا غورث حکیم نے بھی اسی قسم کا ایک مجمع راز اپنے شاگردوں کے لئے قائم کیا تھا۔ ان تمام حالات کا مقتضا یہ تھا، کہ کچھ پوشیدہ راز آپس میں ہوں، اور کچھ پوشیدہ تحریریں بھی ہوں، اور اُن میں کچھ اصلی ہوں اور کسی وقت میں لوگوں نے جعلی اور مصنوعی باتیں اور تحریریں اُس میں ملادی ہوں، اور اُن کو بھی اصلی تحریریں ظاہر کیا ہو۔ جھوٹی تحریروں کے اس اختلاط کا حضرت سلیمان کے گروہ میں پیدا ہونا زیادہ تر احتمال رکھتا ہے، کیونکہ اُن کے محل میں بُت پرست عورتیں موجود تھیں، اور تمام بُت پرست قومیں اُن کی حامی اور مددگار تھیں، اور وہ اپنے مذہبی رسم و رواج اور پوجا پاٹ

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۱۱۷) وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ (۱۱۸)

اور ڈرو اُس دن سے جب کہ کوئی کچھ بھی کسی کے کام نہ آویگا، اور نہ کچھ اُس کے بدلے میں قبول کیا جاویگا، اور نہ اُس کے لئیے کوئی سفارش فائدہ دیگی، اور نہ اُن کی مدد کی جاویگی (۱۱۷) اور جب مُبتلا کیا ابراہیم کو اُس کے پروردگار نے چند باتوں میں، پھر اُس نے اُن کو پورا کیا (خدا نے) کہا کہ بیشک میں تجھ کو لوگوں کے لئیے پیشوا کرنے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری اولاد میں سے (خدا نے) کہا کہ میرا وعدہ ظالموں تک نہیں پہنچتا (۱۱۸)

کے قائم رکھنے کو زیادہ راغب ہونگے، اور سلیمان کے بعد اُن جھوٹی تحریروں کو جن میں کفر کی باتیں بھی ہونگی، لوگوں نے سلیمان کی تحریریں گمان کرکے اختیار کیا ہوگا اور اُن کی پیروی کرتے ہونگے، اسی امر کی نسبت خدا نے فرمایا ہے، کہ وہ سلیمان کی تحریریں نہیں تھیں، بلکہ شیطانوں یعنی کافروں کی تحریریں تھیں۔ اور اُنہوں نے ہی اُن میں کفر کی باتیں لکھی تھیں سلیمان نے نہیں لکھی تھیں، پس یہ ایک تاریخی[1] واقعہ ہے جس کا اشارہ قرآن میں ہے ✤

شیاطین کے معنی ہم نے کافروں کے لئیے ہیں، بیضاوی میں لکھا ہے کہ "الشیاطین من الجن والانس اومنهما"، یعنی شیاطین کے لفظ سے یا تو شیاطین جن مراد ہیں یا شیاطین انس یعنی شریر آدمی یا دونوں۔ تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے، کہ اکثر مفسر شیاطین سے شیاطین جن مراد لیتے ہیں، اور معتزلے شیاطین انس، اور بعضے دونوں کو قرار دیتے ہیں، لیکن ہر ایک سمجھدار آدمی سمجھ سکتا ہے، کہ شیاطین سے شیاطین الجن مراد لینا مذہب کو ایک عجوبہ بنانا ہے، اور شیاطین سے شیاطین الجن مراد لینے پر نہ کوئی تاریخی دلیل ہے نہ کوئی عقلی دلیل ہے، اور نہ اس آیت میں کوئی اس قسم کا اشارہ ہے بلکہ جو تاریخی واقعہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اُس سے صاف پایا جاتا ہے، کہ وہی کافر مراد ہیں جنھوں نے کفر کی جھوٹی تحریریں یا جھوٹی باتیں بنائی تھیں ✤

ہاروت اور ماروت دو تاریخی شخص ہیں، یعنی اُن کا، جو تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں شخص شام کے رہنے والے تھے، قرآن مجید میں اُن کا کوئی قصہ بجز اس کے جو یہاں ہے بیان

[1] اس زمانہ میں بھی ایسی تحریریں موجود ہیں جو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب ہیں، مگر خود یہودی اور عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مصنوعی تحریریں ہیں، سلیمان کی نہیں ہیں ✤

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۱۹﴾	اور جب ہم نے کعبہ کو آدمیوں کے لئے مرجع اور امن کی جگہ بنایا، تو اختیار کرو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ اور ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل سے عہد لیا کہ پاک رکھیں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجود کرنے والوں کے لئے ﴿۱۱۹﴾

نہیں ہوا ہے، تمام قصے جو مفسرین نے اُن کی نسبت اپنی تفسیروں میں بھر لئے ہیں، اُن کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ جتنی روایتیں اُن کی نسبت مذکور ہیں وہ سب مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔ مسٹر ہائڈ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں اُن کی نسبت بہت سے قصے لغو مشہور تھے، ہمارے مفسرین کی یہ عادت ہے کہ کسی کے ہاں کا قصہ ہو جب وہ اپنی تفسیروں میں اُس کو داخل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک ایسی مصنوعی روایت داخل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ مسلمانی روایت ہے، مگر اس جھوٹ کا جو الزام ہے وہ مفسروں یا راویوں پر ہے قرآن اُس سے بری ہے ✤

یہ دونوں فرشتے نہیں تھے بلکہ آدمی تھے۔ ہمارے ہاں کے بعض مفسروں نے بھی اُن کو آدمی قرار دیا ہے، چنانچہ حسن نے ملکین کے لفظ کو لام کے زیر سے پڑھا ہے، جس کے معنی دو بادشاہوں کے ہیں۔ اور ضحاک سے اور ابن عباس سے بھی لام کی زیر سے پڑھنا روایت کیا گیا ہے۔ پھر اُن میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ کون تھے حسن کا قول ہے، کہ وہ دونوں بابل میں عجم کے کافروں میں سے تھے، بغیر ختنہ کئے ہوئے، کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے، کہ وہ دونوں بادشاہوں میں سے صالح آدمی تھے ✤

> قرء الحسن ملكين بكسر اللام وهو مروي عن الضحاك وابن عباس ثم اختلفوا فقال الحسن كانا علجين اقلفين ببابل يعلمان الناس السحر وقيل كانا رجلين صالحين من الملوك ۔ تفسیر کبیر

ہم ملکین کے لفظ کو مطابق قراءت مشہورہ لام کے زبر سے پڑھتے ہیں، مگر فرشتے مراد نہیں لیتے بلکہ آدمی مراد لیتے ہیں۔ جس کو لوگ نہایت نیک سمجھتے ہیں، اُس پر فرشتہ کا اطلاق کرتے ہیں، قرآن مجید سے بھی کافروں میں اُس محاورہ کا ہونا پایا جاتا ہے، جس طرح کہ زلیخا کی سہیلیوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر کہا تھا کہ "ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم" اور مجوسیوں میں بھی ایسا استعمال تھا، اور ہائڈ صاحب کی کتاب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجوسی ہاروت ماروت کو فرشتہ کہتے تھے۔

پس اس آیت میں جس طرح کہ لوگوں کے اس گمان کو کہ، جو علم اُن کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اُتارا گیا تھا، بیان کیا گیا ہے، اُسی طرح پر جس خیال سے کہ وہ اُن کو فرشتہ کہتے تھے ملکین کا لفظ لام کے زبر سے لایا گیا ہے، یعنی اُن لوگوں نے اُس چیز کی پیروی کی جس کی نسبت وہ کہتے تھے کہ بابل میں

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲﴾

اور جب ابراہیم نے کہا، اے پروردگار اس جگہ کو ایک شہر پُرامن کر دے اور رزق دے اُس کے رہنے والوں کو پھلوں کا اُن میں سے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور اخیر دن پر (خدا نے) کہا اور (یہ بھی کہو کہ اُس کو بھی) جو کافر ہو، پھر میں اُس کو تھوڑا سا فائدہ مند کرونگا، پھر اُس کو مجبور کرونگا آگ کے عذاب میں، اور بُری جگہ میں جانے کو ﴿۱۲﴾

ہاروت اور ماروت پر جن کو وہ فرشتہ کہتے تھے خدا کی طرف سے اُتاری گئی ہے، پس خدا نے نہ فرمایا ہے کہ جو علم اُن کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اُتارا ہوا تھا، اور نہ یہ فرمایا ہے، کہ وہ دونوں فرشتے تھے، بلکہ جو جو عقیدہ ان دونوں باتوں کی نسبت کافروں یا یہودیوں کا تھا وہ بیان کیا ہے +

اب ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جادو سیکھنے والوں کو منع کیوں کرتے تھے، کہ تم مت سیکھو، اور کافر مت بنو، یعنی بُرا کام کرنے والے مت بنو۔ یہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے۔ جادو سے اپنے خیال میں نقصان پہنچانا، خواہ فی الحقیقت اُس سے نقصان پہنچتا ہو یا نہیں، ہر کوئی یہاں تک کہ جادوگر بھی بُرا جانتا ہے، اور اسی وجہ سے وہ سیکھنے والے کو منع کرتے تھے، اس زمانہ میں بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو کوئی بُرا کام جانتے ہیں، مگر جب کوئی اُن سے سیکھنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں، کہ یہ خراب کام ہے کیوں سیکھتے ہو، لیکن جب سیکھنے والا اصرار کرتا ہے تو سکھا دیتے ہیں، پس ہاروت اور ماروت کا سیکھنے والوں کو ایسا کہنا ایک عام مجرا طبعی کے موافق تھا +

اسی آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ سحر باطل ہے، یعنی سحر کچھ مؤثر نہیں ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی کو بسبب اپنے سحر کے کچھ نقصان پہنچانے والے نہ تھے، اور یہ کہنا نص صریح اس بات پر ہے کہ سحر کچھ اثر نہیں رکھتا، اور یہی معنی سحر کے باطل ہونے کے ہیں آگے جو خدا نے فرمایا کہ، ”اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ“ اس کے یہ معنی سمجھنا کہ اُن کا سحر خدا کے حکم سے اثر کرتا تھا، محض غلطی اور ناسمجھی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عامل یا جادوگر کسی کام کے لئے عمل یا جادو پڑھتا ہے اور وہ کام اتفاقیہ اُس کی خواہش کے مطابق ہو جاتا ہے اور شبہ پڑتا ہے کہ عمل یا جادو کے اثر سے ہوا ہے، اس شبہ کے مٹانے کو خدا نے فرمایا، ”اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ“ یعنی ایسی حالت میں جو کام ہو جاتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہو جاتا ہے۔ کچھ جادو یا عمل کے سبب سے نہیں ہوتا +

ہم نے اوپر بیان کیا تھا کہ ان آیتوں میں دو زمانہ کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک اُس زمانہ کے یہودیوں کا جو حضرت سلیمان کے وقت میں اور اُن کے بعد تھے، اور ایک اُن لوگوں کا جو ہاروت اور ماروت کے زمانہ میں تھے۔ بس جان لینا چاہئے کہ پہلی آیت کے شروع سے ان لفظوں تک

اور جب ابراہیم کعبہ کی بنیادیں اُٹھاتا تھا اور اسمٰعیل (اُس کے ساتھ تھا تو اُن دونوں نے کہا) اے ہمارے پروردگار اس کو ہم سے قبول کر بیشک تو سننے والا جاننے والا ہے (۱۲۱)	وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۱)

کہ " بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر اُتاری گئی ہے " اُن لوگوں کا ذکر ہے، جو حضرت سلیمان کے وقت میں اور اُن کے بعد تھے۔ اور ان الفاظ سے کہ " اور وہ کسی کو نہیں سکھلاتے " ان الفاظ تک کہ " اور اُن سے سیکھتے تھے وہ چیز جو اُن کو نقصان دیتی تھی اور نفع نہ پہنچاتی تھی " اُن لوگوں کا ذکر ہے جو ہاروت و ماروت کے زمانہ میں تھے، اور اُس کے بعد عام یہودی مخاطب ہیں جو توریت سے جانتے تھے کہ جادو گناہ اور کفر ہے *

(۱۰۰) (ما ننسخ)۔ اس آیت کی تفسیر میں ہمارے ہاں کے مفسروں نے بے انتہا کج بحثیاں کی ہیں، اور مذہب اسلام کو بلکہ خدا کو بدنام کیا ہے، اور قرآن مجید کو ایک شاعر کی بیاض بنادیا ہے، اُنھی کج بحثیوں میں بعض مفسروں نے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے سیدھی راہ بھی اختیار کی ہے، ہر ایک شخص جس کے مزاج میں کج بحثی نہیں ہے وہ اس آیت کو اور اس سے پہلی آیت کو پڑھ کر سیدھا اور صاف مطلب سمجھ سکتا ہے، اِس آیت سے پہلی آیت میں خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے، کہ اہل کتاب اس بات کو دوست نہیں رکھتے کہ خدا کی طرف سے تم پر کچھ بھلائی اُترے، اور بھلائی سے علانیہ مراد قرآن اور احکام شریعت ہیں۔ اہل کتاب جو اِس بات کو دوست نہیں رکھتے تھے اُس کی صاف صاف دو وجہیں تھیں۔ اول یہ کہ تمام انبیا بنی اسرائیل میں گذرے تھے، اور اُن کو پسند نہیں تھا کہ بنی اسمٰعیل میں جن کو وہ بالطبع حقیر بھی سمجھتے تھے کوئی نبی پیدا ہو۔ اُس کی نسبت خدا نے فرمایا کہ اللہ مخصوص کرتا ہے اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ احکام شریعت محمدی کے موسوی شریعت کے احکام سے کسی قدر مختلف تھے، اور یہودی اپنی شریعت کی نسبت سمجھتے تھے کہ وہ دائمی ہے، اور کبھی کوئی حکم اُس کا تبدیل نہیں ہونے کا۔ اس کی نسبت خدا تعالےٰ نے فرمایا، کہ جو آیت کہ ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اُس کی جگہ اُسی کی مانند یا اُس سے بہتر آیت دیتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام میں آیت کے لفظ سے قرآن کی آیت مراد نہیں ہے بلکہ موسوی شریعت کے احکام جو شرع محمدی میں تبدیل ہو گئے، یا جن احکام شریعت موسوی کو یہودیوں نے بھلا دیا تھا وہ مراد ہیں۔ ہمارے اکثر مفسرین نے نہایت کج بحثی سے اس آیت میں جو لفظ " آیۃ " ہے اُس کو قرآن مجید کی آیتوں پر محمول کیا ہے، اور یہ سمجھا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو جاتی ہے، اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ " ننسھا " کے لفظ سے یہ قرار دیا، کہ پیغمبر خدا

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۲﴾	اے ہمارے پروردگار اور ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا، اور ہماری اولاد کو اپنی فرمانبردار امت، اور دکھا ہم کو ہماری (عبادت کے) طریقے، اور ہم کو معاف کر بیشک تو ہی بڑا معاف کرنیوالا ہے مہربان ﴿۱۲۲﴾

صلے اللہ علیہ وسلم بعض آیتوں کو بھول بھی گئے تھے، اور اُن دو لفظوں یعنی نسخ اور نسیھا کی بناء پر جھوٹی اور مصنوعی روایتوں کے بیان کرنے سے اپنی تفسیروں کے ورق کے ورق سیاہ کر دئیے ہیں، مگر اُن میں کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، انہی جھوٹی روایتوں کی بنا پر اُنہوں نے قرآن کی آیتوں کو چار قسم کی آیتوں پر تقسیم کیا :-

اول۔ وہ آیتیں جن کی تلاوت اور احکام دونوں بحال ہیں اور وہ سب آیتیں قرآن میں موجود ہیں ❖

دوم۔ وہ آیتیں جن کی تلاوت بحال ہے اور احکام منسوخ ہو گئے ہیں۔ ان آیتوں کی نسبت بھی کہتے ہیں کہ قرآن میں موجود ہیں ❖

سوم۔ وہ آیتیں جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے مگر احکام بحال ہیں ❖

چہارم۔ وہ آیتیں جن کی تلاوت اور احکام دونوں منسوخ ہو گئے ہیں۔ اور تیسری اور چوتھی قسم کی آیتوں کی نسبت کہتے ہیں کہ قرآن میں موجود نہیں ہیں، مگر اُن جھوٹی روایتوں میں اُن کا موجود ہونا بیان کرتے ہیں ❖

ہم ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتے، اور یقین جانتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے اُترا وہ بے کم و کاست موجودہ قرآن میں جو درحقیقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں تحریر ہو چکا تھا موجود ہے، اور کوئی حرف بھی اُس سے خارج نہیں ہے، اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہے، بلکہ احکام ادیان سابقہ کی نسبت بھی لفظ نسخ کا مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے نہ حقیقی معنی میں۔ اس کی تشریح کے لئے ہم کو منسوخ کے معنوں سے بحث کرنی پڑیگی، اور جو احکام کہ تبدیل ہو گئے ہیں اُن کی بھی حقیقت بیان کرنی ہوگی، لیکن قبل اس کے ہم کو اُن مفسروں کی رائے کا بیان کرنا مناسب ہے، جنہوں نے آیت کے لفظ سے جو اس آیت میں ہے، قرآن کی آیتیں مراد نہیں لی ہیں ❖

ابو مسلم ایک شخص ہے جو خلاف جمہور مفسرین کے ہماری رائے سے متفق ہے۔ اس کا بھی یہی عقیدہ ہے، کہ قرآن میں نسخ واقع نہیں ہوا، اور اُس کا قول ہے کہ آیات منسوخہ سے مراد وہ شریعتیں ہیں، جو کتب متقدمہ

قال ابو مسلم۔ ان المراد من الآیات المنسوخة هي الشرائع التي في الكتب

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۳﴾

اے ہمارے پروردگار اُن میں اُنہی میں سے ایک رسول مبعوث کر کہ اُن کو تیری نشانیاں سناوے، اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاوے اور اُن کو پاک رکھے، بیشک تو ہی بڑا ہے حکمت والا ﴿۱۲۳﴾

القدیمۃ من التوراۃ والانجیل کالسبت و الصلوٰۃ الی المشرق و المغرب مما وضعہ اللہ تعالیٰ عنا وتعبد بغیرہ فان الیہود والنصاریٰ کانوا یقولون لا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم فابطل اللہ علیہم ذلک بھذہ الآیۃ +

یعنی توریت اور انجیل میں تھیں، جیسے کہ سبت کا ماننا اور مشرق اور مغرب کی طرف نماز کا پڑھنا، اور اسی قسم کے حکموں کی مانند جو اللہ نے ہم سے دُور کردئیے ہیں، اور ہم بغیر اُس کے عبادت کرتے ہیں، یہود اور نصاریٰ کہتے تھے کہ بجز اُس کے جو ہمارے دین کا تابع ہو اور کسی پر ایمان نہ لاؤ، پس اللہ نے اس آیت سے اُس کو باطل کردیا +

ومن الناس من اجاب بان الآیۃ اذا طلقت فالمراد بھا آیات القرآن لانہ ھو المعھود عندنا +

بعض آدمیوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے، کہ آیت کا لفظ جبکہ اطلاق کیا جاتا ہے تو اُس سے قرآن ہی کی آیتیں مراد ہوتی ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک وہی آیتیں مقرر ہیں +

ولقائل ان یقول لا نسلم ان لفظ الآیۃ مخصوص بالقرآن بل ھو عام فی جمیع الدلائل (تفسیر کبیر صفحہ ۴۷۶ جلد ۱) +

لیکن کوئی شخص اس کا جواب دے سکتا ہے کہ ہم یہ بات نہیں مانتے، کہ آیت کا لفظ قرآن کی آیتوں سے مخصوص ہے، بلکہ وہ عام ہے اور ہر دلیل پر بولا جاتا ہے +

امام فخر الدین رازی نے یہ بات تسلیم کرلی ہے، کہ قرآن مجید میں منسوخ آیتیں ہونے پر اس آیت سے استدلال کرنا ٹھیک نہیں ہے، اور اس لئے انہوں نے اور آیتوں سے استدلال کیا ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں وہ لکھتے ہیں، کہ ہم نے کتاب محصول میں جو اصول فقہ میں ہے، تمام بحثیں جو عدم نسخ پر دلالت کرتی ہیں، بیان کرکے، ہم نے وقوع نسخ پر اسی آیت ما ننسخ پر استدلال کیا ہے۔ مگر اس آیت پر استدلال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے کہ ما کا لفظ اس جگہ بطور شرط اور جزا کے ہے، جیسے کہ تم کسی کو کہو، کہ جو شخص تیرے پاس آئے تو اُس کی تعظیم کر، تو یہ کہنا کسی شخص کے آنے پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ صرف اتنا نکلتا ہے، کہ جب کوئی آوے تو اُس کی تعظیم کرنی واجب ہے۔

واعلم انا بعد ان قررنا ھذہ الجملۃ فی کتاب المحصول فی اصول الفقہ تمسکنا فی وقوع النسخ بقولہ تعالیٰ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا، الاستدلال بہ ایضاً ضعیف

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور کون ابراہیم کی ملت سے منہ پھیرتا ہے، بجز اس کے جو خود بیوقوف بنا ہو، اور بیشک ہم نے اُس کو برگزیدہ کیا ہے دنیا میں، اور بیشک وہ آخرت میں نیک لوگوں میں ہے ﴿۱۲۴﴾ جب اُس کے پروردگار نے اُس کو کہا کہ فرمانبردار ہو، اُس نے کہا فرمانبردار ہوا میں پروردگار عالموں کا ﴿۱۲۵﴾

اسی طرح یہ آیت بھی حصول نسخ پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی آیت منسوخ ہو، تو اُس کے بدلے دوسری آیت جو اُس سے اچھی ہو لانی واجب ہے۔ پس ٹھیک بات یہ ہے کہ نسخ کے ثبوت میں ہم اور آیتوں کو اختیار کریں، یعنی اس آیت کو "واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ" اور اس آیت کو "یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب" ✦

لانما ھھنا تقیید الشرط والجزاء وکما ان قولک "من جاءک فاکرمہ" لا یدل علی حصول المجیٔ بل علی انہ متی جاء وجب الاکرام فکذا ھذہ الاٰیۃ لا تدل علی حصول النسخ بل علی انہ متی حصل النسخ وجب ان یاتی بما ھو خیر منہ فالاقوی ان نعول فی الاثبات علی قولہ تعالیٰ "واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ" وقولہ "یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب" واللہ اعلم۔ تفسیر کبیر صفحہ جلد ۱

ہم امام فخر الدین رازی کا شکر کرتے ہیں، کہ انہوں نے اس قدر تو ہم سے اتفاق کیا، کہ اس آیت سے قرآن مجید میں آیت منسوخ کا موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا، مگر خدا نے چاہا تو ہم بتا دینگے کہ اُن آیتوں سے بھی جن پر امام رازی نے منسوخ ہونے کا استدلال کیا ہے حقیقتاً منسوخ ہونا آیتوں کا ثابت نہیں ہوتا ✦

ناسخ و منسوخ کی بحث درحقیقت ایک لغو بحث ہے، اس پر بحث کرنے کی ضرورت صرف اس وجہ سے ہوگئی ہے، کہ فقہائے اسلام نے نہایت غلط قیاس اور بیجا استدلال سے اور صرف اپنے دل کے پیدا کئے ہوئے خیالات سے، قرآن کی آیتوں کا اس طرح پر منسوخ ہونا قرار دیا ہے، جو خدا کی شان اور قرآن کے ادب کے بالکل برخلاف ہے، اور ہرگز مذہب اسلام کا وہ مسئلہ نہیں ہے، اور نہ اُن فقہا کے استنباط کے لئے کوئی دلیل ہے۔ انہوں نے جو آیات منسوخہ کو تین قسم، یعنی منسوخ الحکم و ثابت التلاوت اور منسوخ التلاوت و ثابت الحکم، اور منسوخ التلاوت و الحکم قرار دیا ہے، یہ محض جھوٹی تقسیم ہے، اور خود اُن کے دل کی بنائی ہوئی ہے، اور مفسرین نے جھوٹی اور بے سند روایتیں اپنی تفسیروں میں بھر دی ہیں، اور اگر ناسخ اور منسوخ کی بحث صرف اتنی بات پر منحصر رہتی، کہ آیا شرائع سابقہ میں کوئی ایسے احکام تھے جو اب شریعت اسلام میں نہیں رہے، یا اُن کے عوض دوسرے احکام آئے، اور شرائع سابقہ کے احکام منسوخ ہو گئے یا نہیں۔ یا یہ کہ خود اسلام

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے وصیت کی کہ اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے تمہارے لئے اس دین کو برگزیدہ کیا ہے، پس تم مت مرنا بجز اس کے کہ تم مسلمان مرو ﴿۱۲۶﴾ (اے بنی اسرائیل) کیا تم موجود تھے جس وقت یعقوب کو موت آئی، جب کہ اُس نے اپنے بیٹوں کو کہا کہ میرے بعد کس کو پوجوگے، انہوں نے کہا کہ ہم عبادت کرینگے تیرے خدا کی، اور تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق کے خدا کی، جو خدائے واحد ہے، اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں ﴿۱۲۷﴾

میں کوئی ایسے احکام تھے جو بعد کو قائم نہ رہے، یا اُس کے بدلے اور احکام آئے، اور پہلے احکام منسوخ ہوگئے یا نہیں، تو یہ بحث البتہ دلچسپ اور ذی عقلوں کی سی بحث ہوتی، اور اس پر مباحثہ کرنے کی کچھ ضرورت نہ پڑتی۔ کیونکہ جو لوگ احکام کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں، اور جو ان کے منسوخ ہونے کے قائل نہیں ہیں، جب اُن دونوں کی بحثوں پر غور کیا جاوے، تو بجز نزاع لفظی کے یا ناسخ و منسوخ کو بطور ایک علمی اصطلاح کے قرار دینے کے، اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، پس ہم اس بات سے کہ قرآن کی آیتوں میں سے کوئی آیت منسوخ التلاوت و ثابت الحکم، یا منسوخ التلاوت والحکم ہے، انکار کرکے اس بات کی بحث پر متوجہ ہوتے ہیں، کہ آیا قرآن میں ایسی آیتیں جن پر ثابت التلاوۃ و منسوخ الحکم ہونے کا اطلاق ہوسکے موجود ہیں یا نہیں۔ نتیجہ اس بحث کا صرف یہ ہوگا کہ آیا قرآن میں احکام منسوخہ ہیں یا نہیں، یا ایک آیت کا حکم دوسری آیت کے حکم کو منسوخ کرتا ہے یا نہیں، اور نتیجہ اس بحث کا بجز نزاع لفظی کے اور کچھ نہ ہوگا ✦

نسخ کے معنی لغت میں کسی شے کے دور کردینے کے اور متغیر کردینے اور باطل کردینے کے ہیں، خواہ اُس کی جگہ کوئی دوسری چیز قائم ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اور نقل و تحویل کے معنی بھی ہیں، اور اس بحث سے کہ ان معنوں میں اصلی کون سے ہیں اور مجازی کون سے ہم کو چنداں فائدہ نہیں ہے، مگر جب اس لفظ کو کسی خاص علم میں استعمال کیا جائیگا مثلاً شرع میں، تو اُس کی تعریف میں کچھ ایسے الفاظ بڑھانے ہونگے جس سے وہ معنی اُس علم کے مناسب ہوجاویں۔ پس شرع میں نسخ کے معنی یہ ہونگے کہ ایک شرعی حکم کا کسی دوسرے شرعی حکم سے زائل یا متغیر یا باطل ہونا، پہلا حکم منسوخ کہلائیگا اور دوسرا

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۸﴾ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۹﴾

یہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی، اُن کے لئے وہ چیز ہے جو اُنھوں نے کمائی، اور تمہارے لئے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، اور تم سے اُس چیز کی پرسش نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے ﴿۱۲۸﴾ اور (یہودیوں نے کہا) کہ یہودی ہوجاؤ (اور عیسائیوں نے کہا کہ) یا عیسائی (ہوجاؤ) تو تم راہ پاؤگے (اے پیغمبر) کہدے کہ نہیں بلکہ (میں پیروی کرتا ہوں) ملت ابراہیم کی جو خالص ہے، اور وہ مشرکوں میں نہیں تھا ﴿۱۲۹﴾

حکم ناسخ ✦

ناسخ کے معنی علماء نے یہ قرار دئے ہیں، کہ ناسخ سے مراد ایک ایسے شرعی قاعدہ سے ہے جو اس بات پر دلالت کرے، کہ اس سے پہلے جو حکم بقاعدۂ شرعی ثابت ہوچکا تھا، اس کے بعد نہیں رہا، ایسی حالت میں کہ اگر یہ پچھلا حکم نہ ہوتا تو وہ پہلا حکم ثابت اور قائم رہتا ✦

> ان الناسخ فی اصطلاح العلماء عن طریق شرعی یدل علی ان الحکم الذی کان ثابتا بطریق شرعی لا یوجد بعد ذلک مع تراخیہ عنہ علی وجہ لولاہ لکان ثابتا
> (تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۴۵۹) ✦

اس تعریف میں جو قیدیں علماء نے لگائی ہیں اُس کے یہ فائدے بتائے ہیں، کہ قاعدہ شرعی کی جو قید لگائی ہے وہ اِس لئے لگائی ہے کہ اُس میں خدا اور رسول کے قول و فعل شامل ہوجائیں، اور اجماع امت علی احد القولین خارج ہوجائے، کیونکہ جو طریق شرعی کی تفسیر یہاں بیان ہوئی ہے، اُس میں اجماع داخل نہیں ہوتا اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ شرع عقلی حکم کی ناسخ ہو، کیونکہ حکم عقلی کا ثبوت شرعی قاعدہ پر نہیں ہوتا، اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ معجزہ شرعی حکم کا ناسخ ہو، کیونکہ وہ معجزہ شرعی طریق سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ حکم کسی مدت یا شرط یا استثنا پر مقید ہو، کیونکہ ایسی حالت کی جو شرط لگائی ہے، اُس سے یہ سب خارج ہوجاتی ہیں، اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اگر خدا نے ہم کو کسی ایک کام کرنے کا ایک دفعہ حکم دیا، اور پھر اُس کام کی مانند دوسرا کام کرنے کو منع کیا تو یہ حکم اُس کا ناسخ ہوگا، کیونکہ اگر یہ منع نہ ہوتا تب بھی وہ حکم ثابت نہ تھا ✦

یہ تعریف ناسخ کی جو گویا ناسخ و منسوخ دونوں کی تعریف ہے، ظاہر ہے کہ منصوص نہیں ہے یعنی ظاہر ہے کہ یہ تعریف ناسخ و منسوخ کی نہ خدا نے بتائی ہے نہ رسول نے بتائی ہے، بلکہ علما نے خود اپنے قیاس اور خیال اور استنباط سے قائم کی ہے، اور کسی مسلمان پر واجب نہیں ہے، کہ خواہ نخواہ اس تعریف کو تسلیم کرے، ہمارے نزدیک جس وقت نسخ کو شرع سے متعلق کیا جائیگا تو اس وقت

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

کہو ایمان لائے اللہ پر، اور (اُس پر) جو اُتارا گیا ہے ہم پر، اور جو اُتارا گیا ہے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اُس کے پوتوں پر، اور (اُس پر) جو دیا گیا ہے موسیٰ اور عیسیٰ کو اور اُس پر جو دیا گیا ہے نبیوں کو اُن کے پروردگار سے ہم فرق نہیں کرتے کسی ایک میں اُن میں سے، اور ہم اُس کے (یعنی خدا کے) فرمانبردار ہیں ﴿۱۳۶﴾

حیثیت کو اُس کا جزو قرار دینا واجب اور لازم ہوگا، کیونکہ جس قدر احکام شرعی ہیں وہ سب کسی نہ کسی حیثیت پر مبنی ہیں۔ پس اگر باوجود بقا اُس حیثیت کے جس پر وہ حکم صادر ہوا تھا، دوسرا حکم برخلاف پہلے حکم کے صادر کیا جاوے، تو کہا جاویگا کہ دوسرا حکم ناسخ ہے اور پہلا منسوخ، اور اگر وہ حیثیت جس کی بناء پر پہلا حکم صادر ہوا تھا موجود نہ رہے، تو دوسرا حکم پہلے حکم کا حقیقتاً ناسخ نہیں ہے گو مجازاً ایک کا دوسرے کو ناسخ کہیں +

ذات باری کے تنزّہ اور اُس کے تقدّس اور اُس کے علم و دانش میں نقصان اُسی وقت لازم آتا ہے، جبکہ ایک حیثیت کے لحاظ سے کوئی حکم دیا ہو، اور پھر باوجود موجود ہونے اُسی حالت حیثیت کے دوسرا حکم اُس کے مخالف دیا ہو، لیکن اگر حالت اور حیثیت مختلف ہوگئی ہو، تو دوسرا حکم دینا اُس کے تقدّس کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا، بلکہ نہ دینا اُس کے تقدّس اور علم و دانش کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پس ہم قبول کرتے ہیں کہ ایسے احکام بھی موجود ہیں، جو شرایع سابقہ میں مامور بہ تھے، اور شرایع مابعد میں مامور بہ نہیں رہے، یا بالفرض ہم تسلیم کرلیں، کہ خود مذہب اسلام ہی میں اول کوئی حکم مامور بہ تھا، اور پھر بعد کو مامور بہ نہیں رہا، اور یہ بھی ثابت ہو کہ حیثیت اور حالت متحد نہیں رہی تھی، تو ہم ایک دوسرے کا ناسخ نہیں قرار دینے کے، اور ہم کیا کوئی ذی عقل بھی ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی، دہریہ، اُن میں سے کسی کو ناسخ و منسوخ نہیں کہنے کا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم مجازاً، یا بطور ایک اصطلاح کے اُن کو ناسخ و منسوخ کہنے لگیں۔ ہم نے تمام قرآن میں کوئی ایسا حکم نہیں پایا، اور اس لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے۔ علما اور فقہا نے جن آیتوں کو ایک دوسرے کے مخالف خیال کیا ہے، اور ایک کو ناسخ اور ایک کو منسوخ ٹھہرایا ہے، تو ہم ہر موقعہ پر ثابت کرینگے کہ وہ باہم مخالف نہیں ہیں، اور تفاوت حیثیت بھی ظاہر کردینگے، جس کے بغیر لحاظ کے ناسخ و منسوخ کا قرار دینا محالات سے ہے +

ناسخ اور منسوخ کے باب میں لوگوں نے بہت سی بحثیں کی ہیں، اور ابو مسلم نے جو ناسخ و منسوخ

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۳۱)	پھر اگر ایمان لائے اُس چیز کی مانند جس پر تم ایمان لائے ہو پھر بیشک اُنھوں نے راہ پائی، اور اگر پھرے تو اُس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہی مخالفت میں ہیں، پھر کافی ہوگا تیری طرف سے اُن کو اللہ، اور وہ سننے والا ہے جاننے والا (۱۳۱)

ہونے کا قائل نہیں ہے، متعدد دلیلیں اُس کے امتناع پر پیش کی ہیں، اور اُس کے مخالفین نے جو جمہور مفسرین ہیں اُس کی تردید کی ہے، اور اثبات نسخ پر دلیلیں پیش کی ہیں، ہماری سمجھ میں وہ سب قشری بحثیں ہیں، مغز سخن تک کوئی نہیں پہنچتیں، اور جو اصل بات اتحاد حیثیت کی ناسخ و منسوخ میں تھی، اُس پر کسی کا خیال نہیں گیا ہے، اور اس لئے ہم اُن بحثوں کا اپنی تفسیر میں ذکر کرنا محض بیفائدہ سمجھتے ہیں -

امام رازی صاحب نے جن دو آیتوں سے اپنی دانست میں قرآن مجید میں نسخ کا ہونا قرار دیا ہے، اگرچہ اُن سے بھی نسخ کا ہونا ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ ہم اُن دونوں آیتوں کی تفسیر میں لکھینگے، لیکن ہم اُن سے نہایت ادب سے پوچھتے ہیں، کہ آپ نے اتحاد حیثیت کی شرط کو بھی ملحوظ فرمایا ہے یا نہیں غالباً وہ فرماوینگے کہ نہیں، تو ہم اُن سے عرض کرینگے کہ حضرت ناسخ و منسوخ ہونے کا ثبوت بھی نہیں +

ایک اور بات قابل لکھنے کے ہے کہ حدیث یعنی قول و فعل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم قرآنی کا ناسخ ہے یا نہیں - اس میں علما کے مختلف قول ہیں، مگر جب کہ ہم قرآن سے قرآن کا حقیقتاً منسوخ ہونا نہیں تسلیم کرتے، تو حدیث سے اُس کا حقیقتاً منسوخ ہونا کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں، خواہ وہ حدیث خبر احاد کا درجہ رکھتی ہو، یا حدیث مشہور کا، یا لوگوں نے معناً یا لفظاً اُس کو متواتر کے درجہ تک سمجھا ہو، باقی رہا یہ کہ جس طرح لوگوں نے مجازاً ناسخ و منسوخ ہونے کا اطلاق کیا ہے، اس طرح بھی ہم حدیث کو ناسخ قرآن سمجھتے ہیں یا نہیں، تو ہم اس طرح بھی نہیں سمجھتے، بلکہ اُس کو حدیث کی نامعتبری کی وجہ قرار دیتے ہیں، ہاں احادیث صحیحہ کو جن کا درایتاً صحیح ہونا ثابت ہو گیا ہو، مفسر قرآن سمجھتے ہیں +

(۱۱۹) (واذ ابتلی) اب خدا تعالے اُن بزرگیوں کا ذکر کرتا ہے جو حضرت ابراہیم کو دی تھیں، اور اُن تمام بزرگیوں میں سے جو حضرت ابراہیم کو دی گئی تھیں سب سے بڑی بزرگی وہ ہے جب کہ اُنہوں نے کہا "اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" اسی نعمت کا خدا نے ذکر کیا ہے، "کلمات" کے لفظ سے عجائب صنع باری تعالے مراد ہیں - حضرت ابراہیم ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر عجائب صنع باری تعالے میں متحیر ہو گئے تھے، اور اُنھی پر خدا ہونے کا گمان کیا تھا، لیکن اُنہوں نے اُس کو غلط سمجھا اور پورے طور پر خدا پر یقین کیا - اُسی کی نسبت خدا نے فرمایا "فاتمھن" +

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۸﴾	اللہ کا رنگ (رنگو)، کون بہتر ہے اللہ کے رنگ سے، اور ہم اُسی کی عبادت کرنے والے ہیں ﴿۱۳۷﴾ کہ (اے پیغمبر) کیا تم ہم سے جھگڑا کرتے ہو اللہ میں، حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، اور ہم اُسی کے مخلص ہیں ﴿۱۳۸﴾

کلمات کے لفظ سے ہم نے عجائب صنع الٰہی مراد لی ہے، یہ لفظ سورۂ لقمان میں بھی آیا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے " مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ "، صاحب تفسیر کبیر نے اُس مقام پر بھی عجائب صنع الٰہی مراد لی ہے اور بہت درست ہے۔ لفظ کلمہ اور کلمات کا استعمال اُن تمام چیزوں پر ہوتا ہے جن کو خدا نے پیدا کیا ہے ✦

﴿۱۱۹﴾ (واذ جعلنا البیت) بعد اُس کے کہ کعبہ بن گیا۔ تمام لوگوں میں اُس کی تعظیم اور اُس کی زیارت کو آنا شائع ہوگیا تھا، اور ایک بہت بڑی تجارت گاہ بن گیا تھا، اور تمام قوموں نے آپس میں عہد کرلیا تھا کہ حج کے ایام میں قتل اور غارت اور خونریزی بند رہیگی، اور تمام لوگ جو کعبہ میں آتے ہیں امن میں رہینگے۔ انہی دونوں باتوں کا خدا نے اُس مقام پر ذکر کیا ہے ✦

(وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى) یعنی اختیار کرو مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ۔ یہ ایک جملہ معترضہ واقع ہوگیا ہے، اور اُس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے، یعنی مسلمان کعبہ کو نماز کی جگہ یعنی مسجد اختیار کریں۔ مقام ابراہیم کی نسبت مفسروں نے بہت بحث کی ہے، اور ایسے اقوال نقل کئے ہیں، جن کا کافی ثبوت نہیں ہے، مگر سیاق کلام سے جیسے کہ مجاہد کا بھی قول ہے پایا جاتا ہے، ان مقام ابراهم کلہ وھو قول مجاھد۔ (تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۵۰۱) کہ مقام ابراہیم سے کوئی خاص مقام مراد نہیں ہے، بلکہ کعبہ مراد ہے ✦

اس جملہ کے بعد حضرت ابراہیم کے زمانہ کا ذکر ہے، اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو اس گھر کے آنے والوں اور ٹھیرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کے لئے سُتھرا رکھنے کا حکم دیا ہے ✦

طائفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کعبہ کی زیارت اور حج کو آویں، اور عاکفین سے وہ لوگ مراد ہیں جو وہاں رہتے ہوں، یا آکر سکونت اختیار کریں، اور رُکّع السجود سے وہ لوگ مراد ہیں جو وہاں نماز پڑھیں ✦

﴿۱۲۱﴾ (وَاِذْ يَرْفَعُ) کعبہ درحقیقت نماز پڑھنے کی جگہ یعنی مسجد ہے، جس کو حضرت ابراہیم نے

اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ	کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اُس کے پوتے یہودی تھے یا عیسائی، کہدے (اے پیغمبر) کیا تم زیادہ جاننے والے ہو، یا اللہ،

بنایا تھا۔ خود خدا نے اُس کو مسجد کہا ہے جہاں فرمایا ہے،، انما المشرکین نجس فلا یقربوا المسجد الحرام ،، اور جہاں فرمایا ہے،، لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ ۔،، ابراہیم اور اُس کی تمام اولاد ایسے مقام کو بیت اللہ کہا کرتے تھے اور اس لئے کعبہ کو بھی بیت اللہ کہتے ہیں +

انسان کی ایک جبلّی عادت ہے کہ ایک ایسے وجود کے لئے جو نہ دکھائی دیتا ہے، نہ چھوا جاتا ہے، اور نہ سمجھ میں آتا ہے، اور بجز اس کے کہ ہے، اور کوئی خیال اُس کی نسبت قائم نہیں ہوسکتا، کوئی نہ کوئی محسوس نشان قائم کرلیتا ہے، اور اُس محسوس نشان کے ذریعہ سے اپنا عجز اور نیاز اُس غیر محسوس اور بیچون وبیچگون ذات کے سامنے ادا کرتا ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کو بالطبع ایسے نشان کے قائم کرنے کی زیادہ تر رغبت ہوتی تھی، اور یہی بات ہے جس کے سبب سے ہم قدیم سے قدیم قوموں کا اور وحشی سے وحشی لوگوں کا جب حال تحقیق کرتے ہیں، تو اُن میں بُت پرستی کے یعنی ایک شئے محسوس کے پوجنے کے آثار پائے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال حضرت ابراہیم کے زمانہ تک معدوم نہیں ہوا تھا، اور اسی سبب سے حضرت ابراہیم بھی خدا کی عبادت کے لئے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے، اور یہ رسم حضرت موسٰی کے وقت تک قائم تھی۔ اس فعل میں جو انبیاء نے کیا، اور اُس فعل میں جو بُت پرست کرتے تھے، فرق یہ ہے کہ بُت پرست غیر خدا کے نام محسوس شے قائم کرکے پرستش کرتے تھے، اور اس لئے وہ خدا کی پرستش نہ تھی بلکہ اُس غیر خدا کی پرستش تھی، جس کے نام سے وہ محسوس شئے قائم کی تھی۔ انبیا نے جو محسوس شئے قائم کی وہ خدا ہی کے نام پر قائم کی، اور خدا ہی کی پرستش کی نہ کسی غیر خدا کی، مگر مبارک ہو اُس کو (یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو) جس نے اُن تمام نشانوں کو مٹا دیا، اور اُس بے نشان کی عبادت کو بغیر کسی نشان کے قائم کیا، اور بحر و بر اور پہاڑ اور گھر اور مسجد سب میں یکسان خدا کی عبادت ہونا سکھا دیا۔ کوئی سمت خدا کی عبادت کے لئے مخصوص نہیں کی، یہ سمجھا کہ کعبہ سمت خدا کی عبادت کے لئے مخصوص ہے محض غلطی ہے، اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف، وہ سمت عبادت کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ایک تمیز اور تفرقہ کے لئے مخصوص ہے، جس کو ہم آگے بیان کرینگے +

کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷ میں لکھا ہے کہ،، تب خداوند نے ابراہیم کو دکھلائی دیکر کہا،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾	اور کون زیادہ ظالم ہے اُس شخص سے جو چھپاوے گواہی کو جو اُس کے پاس ہے اللہ سے، اور اللہ بیخبر نہیں ہے اُس سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۳۴﴾

کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دونگا، اور اُس نے وہاں خداوند کے لئے جو اُس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا" اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ پھر وہاں سے ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے نام سے اُس کو موسوم کیا +

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی اٹھارھویں آیت میں ہے، "کہ بلوطستان ممری میں ابراہیم جا رہا اور وہاں خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا" +

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے، کہ خدا کے لئے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اُس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا +

یہ طریقہ اُن کی اولاد میں بھی جاری تھا، چنانچہ کتاب پیدائش باب ۲۶ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ "بیرشبع میں اسحاق پسر ابراہم کو خدا دکھلائی دیا، اور اُس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اُس کو موسوم کیا" +

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا، اُس کی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے +

کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ "اگر تو میرے لئے پتھر کا مذبح بناوے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو کیونکہ اگر تو اسے اوزار لگاویگا تو اُسے ناپاک کریگا" +

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ "اور موسےٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اُٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے عدد کے موافق بارہ ستون بنائے گئے" +

اور کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۸ و ۱۹ و ۲۲ میں لکھا ہے کہ "یعقوب صبح سویرے اُٹھا اور اُس پتھر کو جسے اُس نے اپنا تکیہ کیا تھا لیکے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اُس کے سر پر تیل ڈالا اور اُس کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا، اور کہا کہ یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا" +

جب کہ حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی ہاجرہ کو مع حضرت اسمٰعیل اپنے بیٹے کے جو ہاجرہ بیوی کے پیٹ سے تھے نکال دیا، اور وہ اُس کوہستان مکہ میں آکر ٹھیرے، تو حضرت ابراہیم نے اُن کی عبادت کے لئے اُسی طرح جیسا کہ وہ کیا کرتے ایک پتھر

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ	یہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی، اُن کے لئے وہ چیز ہے جو اُنہوں نے کمائی ،

کھڑا کر کے مذبح بنایا ہوگا، جو اب ہم مسلمانوں میں حجرِ اسود اور یمین الرحمٰن کے نام سے مشہور ہے۔ اس حجرِ اسود کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک جزو کعبہ کا ہوگیا تھا، مگر وہ ایک ایسی شے ہے جو اب تک موجود ہے، جہاں اس طرح پر مذبح بنایا جاتا تھا وہاں کوئی عمارت بنا دینے کا بھی دستور تھا، جس کا اشارہ توریت کی اُن آیتوں سے بھی پایا جاتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ پس بعد اس مذبح بنانے کے حضرت ابراہیم نے وہاں کعبہ بنایا، جو اب بیت اللہ کہلاتا ہے، اور اُسی کے ایک کونے میں وہ پتھر لگا دیا۔ اس آیت میں اسی تعمیر کا ذکر ہے +

اگرچہ ڈایوڈورس یونانی مؤرخ کی تاریخ میں کعبہ کا ذکر ہے، اور اُس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُس کے اعلےٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے، مگر بعض ناسمجھ آدمی یہ اعتراض کرتے ہیں، کہ توریت میں کہیں اس مقام پر حضرت ابراہیم کے مذبح بنانے یا کعبہ کی تعمیر کرنے کا ذکر نہیں ہے، مگر اُن کا یہ اعتراض محض لغو اور بے بنیاد ہے، توریت میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو مذکور نہیں، حالانکہ اُن کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ اور توریت میں ذکر نہ ہونے سے اُس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ توریت اور جو کتابیں اُس سے متعلق ہیں، وہ خاص بنی اسرائیل کے حالات میں لکھی گئی ہیں، اس لئے ان میں بنی اسمٰعیل کا وہاں تک کا ذکر ہے جہاں تک کہ بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے مشترک حالات رہے ہیں، اور جہاں سے بنی اسمٰعیل کے حالات علیحدہ ہو گئے ہیں وہاں سے بنی اسمٰعیل کا ذکر اُن کتابوں میں نہیں ہے، الا ماشاء اللہ کہیں کہیں کسی سبب اور کسی تعلق سے آجاتا ہے۔ مکہ میں بنی اسمٰعیل کے لئے حضرت ابراہیم کا مذبح یا کعبہ بنانا بنی اسرائیل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا،

مقامات مشہورہ مکہ معظمہ

مقامات میقات۔ ذوالحلیفہ۔ مدینہ منورہ کے رستہ پر +

ذات عرق۔ عراق کے رستہ پر +

جحفہ۔ شام کے رستہ پر +

قرن۔ نجد کے رستہ پر +

یلملم۔ یمن کے رستہ پر +

حجرِ اسود۔ کعبہ کے شرقی و شمالی کونے میں یہ پتھر لگا ہوا ہے +

مقام ابراہیم۔ عام لوگوں کے نزدیک وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم نے کھڑے ہو کر کعبہ کی دیوار چُنی تھی۔ اور جو پتھر حانہ کعبہ کے شمال میں لگا ہوا ہے اور اس پر ایک قبہ بنا ہوا ہے اور روشن شافعی امام کھڑا ہوتا ہے اُسی کو وہ پتھر بتاتے ہیں +

صفا۔ کعبہ سے جنوب شرق میں ایک پہاڑی ہے اور اب اُس پر آبادی ہوگئی ہے +

مروہ۔ کعبہ سے شرق و شمال میں ایک چھوٹی پہاڑی ہے اب وہاں بھی آبادی ہے +

منیٰ۔ کعبہ سے گوشہ شرق و شمال میں چار کوس کے فاصلہ پر ہے +

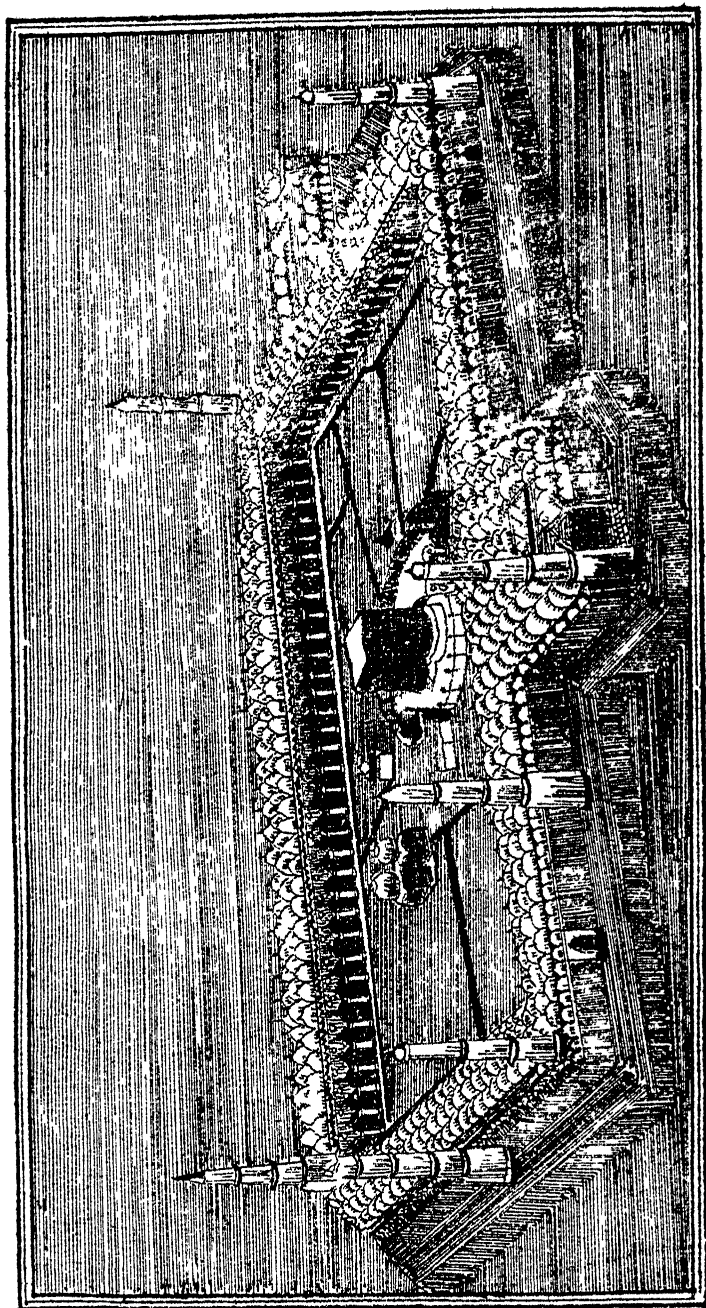
عرفات۔ کعبہ سے جانب شرق آٹھ کوس کے فاصلہ پر ایک میدان ہے +

مزدلفہ۔ کعبہ سے جانب شمال و مشرق ایک میدان و پہاڑ ہے +

زمزم۔ مشہور کنواں حرم کے اندر ہے +

میزاب رحمت۔ کعبہ کی چھت کا پرنالہ ہے +

نقشہ کعبہ محترم یعنی مسجد الحرام



اور تمہارے لئے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی، اور تم سے اُس چیز کی پرسش نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے (۱۳۵)	وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۳۵)

اور اُن کتابوں میں اُس کا ذکر نہ ہونے کی یہ کافی وجہ ہے۔ مگر ہر زمانہ کے عرب کی متواتر روایتوں سے جن سے کسی امر کے ثبوت میں کچھ شبہ نہیں رہتا، اور نیز غیر قوموں کی کتابوں سے، اور نیز قدیم جغرافیہ سے، اور خود مکہ کے گرد کی قدیم ویران بستیوں سے، جو حضرت اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام پر آباد ہوئی تھیں، کچھ شبہ نہیں رہتا کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا ہے +

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ بنایا تو صرف اُس کی دیواریں بنائی تھیں چھت اُس پر نہیں تھی۔ بنی جرہم کے زمانہ میں پہاڑی نالہ کے سبب سے حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا کعبہ ڈھے گیا، تب بنی جرہم نے اُس کو تعمیر کیا۔ پھر وہ عمالیق کے زمانہ میں جو ایک قبیلہ بنی حمیر کا تھا ڈھے گیا، تب عمالیق نے اُس کو بنایا، پھر اُس میں کچھ نقصان آ گیا تو قصی نے اُس کو تعمیر کیا۔ پھر آگ لگنے کے سبب کعبہ جل گیا اور قریش نے اُس کو تعمیر کیا، اُس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کی عمر تخمیناً بارہ چودہ برس کی تھی۔ یزید کے زمانہ میں جب کعبہ پر فوج کشی ہوئی تو پھر کعبہ جل گیا، اور عبداللہ ابن زبیر نے اُس کو تعمیر کیا، مگر حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے وقت میں عبداللہ بن زبیر کی عمارت کو ڈھا ڈالا، اور از سرِ نو اُس کو اُسی طرح پر بنا دیا، جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھا، اور اب جو عمارت موجود ہے وہ حجاج بن یوسف کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر اُس کے گرد کی جو عمارتیں ہیں اور جو عمارات حرم کعبہ کہلاتی ہیں اُن کو بہت سے بادشاہوں نے بنایا ہے، اور وہ نہایت عالیشان عمارتیں ہیں، جیسے کہ نقشہ سے معلوم ہوتی ہیں +

(۱۳۱) (بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ) یہ جو خدا نے فرمایا کہ ،، اگر ایمان لائے اُس چیز کی مانند پر جس پر تم ایمان لائے ہو ،، اس پر علما و مفسرین نے بحث کی ہے کہ مانند سے کیا مطلب ہے، اور اس کا حل اس طرح پر کیا ہے کہ مانند کے لفظ سے کوئی دوسری چیز اُس کے مشابہ مقصود نہیں ہوتی، بلکہ وہی شے مقصود ہوتی ہے، جیسے کہ کوئی کہے کہ ایسا کر جیسا کہ اُنہوں نے کیا ہے، تو اُس سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہی کر جو اُنہوں نے کیا ہے، مقصود صرف اس قدر ہے کہ خدا پر اور انبیا پر ایمان لانا ٹھیک ٹھیک ہدایت پانی ہے، اور اُس کے ماننے سے انکار کرنا مخالفت کرنی ہے +

(۱۳۲) (صِبْغَةَ اللّٰهِ) یہودی اور عیسائی دونوں میں اصطباغ کی رسم جاری تھی، ابتدا میں یہودیوں میں کسی بنا پر یہ رسم شروع ہوئی ہو، مگر کچھ شبہ نہیں کہ بعد تباہی بیت المقدس کے یہودیوں میں یہ رسم مستحکم ہو گئی تھی، اور مذہب میں داخل ہونے کو عیسائی مذہب کے رُو سے بھی اصطباغ لازمی قرار پایا تھا، خود حضرت عیسیٰ نے بھی حضرت یحییٰ سے اصطباغ لیا تھا، اس مقام پر خدا نے فرمایا

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۳۶)	اب کہینگے بیوقوف لوگ کس چیز نے اُن کو پھیر دیا اُن کے قبلہ سے جس پر کہ وہ تھے کہ (اے پیغمبر) اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے کی (۱۳۶)

کہ خدا کا اصطباغ لو، اس سے بہتر کوئی اصطباغ نہیں، یعنی خدا پر دل سے، جان سے، روح سے، یقین کرو، یہی خدا کا اصطباغ ہے، پس دین محمدی میں اسلام میں داخل ہونے کو ظاہری اصطباغ موقوف ہوگیا، اور روحانی اصطباغ قائم ہؤا، اور صرف دل سے خدا پر اور اُس کی وحدانیت پر یقین کرنا ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کو کافی ہؤا، جیسا کہ خدا کا اصطباغ دینے والا فرماتا ہے، ”ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علی ذٰلك الا دخل الجنۃ“ اور اپنے خادم ابوہریرہ سے کہا کہ ”من لقیك یشھد ان لا الٰہ الا اللہ مستیقنًا بھا قلبہ فبشرہ بالجنۃ“ پس دین محمدی میں یہی روحانی اصطباغ ہے، جس میں نہ اصطباغ دینے والے کی ضرورت ہے، نہ پانی کی رنگت کی، بلکہ صرف دل کا یقین کافی ہے، وھذا ھو صبغۃ اللہ ❊

(۱۳۶) (سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ) اس مقام سے تحویل قبلہ کا ذکر شروع ہوا ہے۔ مگر پہلے ہم کو یہ بات بتانی چاہئے کہ حضرت ابراہیم کے وقت میں قبلہ یا سمت قبلہ کا کیا حال تھا، اس امر کا بیان اس بات پر موقوف ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں نماز کے کیا ارکان تھے، غالبًا اُس نماز میں بھی رکوع و سجدہ ہو، مگر ہمارے پاس کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں نماز کے بعینہ یہی ارکان تھے، جو اب مذہب اسلام میں ہیں، نہ یہ ثابت ہے کہ اُس نماز میں جیسے کہ وہ ہو اُسی طرح پر رکوع و سجدہ تھا جیسے کہ ہماری نماز میں ہے۔ بلکہ اگر اُس زمانہ کے حالات اور اُس زمانہ کی وحشی قوموں کی عبادت پر خیال کریں تو بجز اس کے اور کچھ نہیں پایا جاتا، کہ وہ لوگ آپس میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور کودتے اور اُچھلتے تھے، اور وہ سارا حلقہ کا حلقہ اُسی طرح جھک کر کھاتا جاتا تھا، اور اُسی جوش و خروش میں کھڑے ہو جاتے تھے، اور سر ٹیک دیتے تھے، اور اُس کا نام پکارتے جاتے تھے، یا اُس کی تعریف کے گیت گاتے تھے، جس کی وہ عبادت کرتے تھے، اسی نماز کا نشان اسلام میں طریقۂ ابراہیمی پر موجود ہے، جس کا نام مذہب اسلام میں طواف کعبہ قرار پایا ہے، ابن عباس سے مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ ”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الطواف حول البیت مثل الصلوٰۃ الا انکم تتکلمون فیہ فمن تکلم فیہ فلا یتکلمن الا بخیر“، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعبہ کے گرد طواف کرنا مثل نماز کے ہے، گو یہ طریقہ نماز کا وحشیانہ ہو مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حال کی مؤدب اور باوقار نمازوں سے زیادہ

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴿۱۳۷﴾ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۳۸﴾

اور (جس طرح کہ ہم نے تم کو سیدھے رستے کی ہدایت کی ہے) اُسی طرح ہم نے تم کو اچھی خصلت کی اُمت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو ﴿۱۳۷﴾ اور نہیں مقرر کیا ہم نے اُس قبلہ کو جس پر تو تھا بجز اس کے کہ ہم جان لیں اُس شخص کو جو پیروی کرتا ہے رسول کی اُس شخص سے جو پھر جاتا ہے اپنی ایڑیوں پر، اور البتہ (لوگوں پر) یہ بات بڑی دشوار ہے بجز اُن لوگوں کے جن کو اللہ ہدایت کرے، اور یہ نہیں ہے کہ اللہ ضائع کرے تمہارا ایمان، بیشک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا ہے مہربان ﴿۱۳۸﴾

پُرجوش، اور زیادہ تر محبت معبود کا برانگیختہ کرنے والا، اور معبود کے شوق کو زیادہ تر جوش میں لانے والا، اور دل کو خالص اُس کی یاد میں مشغول کرنے والا تھا۔ یہ حرکتیں انسان میں بالطبع مجنون کا سا جوش پیدا کر دیتی ہیں، اور جس طرح مجنون کسی بات میں مشغول ہو اُسی طرح خدا کی یاد میں انسان کو مشغول کر دیتی ہیں، حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو طریقہ نماز کا ہو اُس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کوئی سمت قبلہ کی معین نہیں ہوتی، بہ تمام ذوق و شوق اور اُچھل کود اُس شے کے گرد ہوتا تھا جس کو وہ بطور خدا کی نشانی کے قائم کرتے تھے۔ اسی قسم کی پرستش اب بھی بعضی بعضی وحشی قوموں میں پائی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم خدا کی نشانی کے لئے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے، اور جو عبادت یا نماز ہوتی تھی وہ اُسی کے گرد ہوتی تھی، اس لئے حضرت ابراہیم کے زمانہ میں کوئی خاص سمت قبلہ کا ہونا بجز اُس نشان کے جس کو وہ قائم کر لیتے تھے اور کچھ نہیں پایا جاتا ✦

حضرت ابراہیم کی اولاد کا حال جہاں تک ہم کو ملا ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ وہ بھی کعبہ کی جانب کو سمت قبلہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ہر جگہ پتھر کھڑا کر کے اُسی کے گرد اُسی وحشیانہ طریقہ پر عبادت کرتے تھے، چنانچہ ازرقی نے کتاب اخبار مکہ میں لکھا ہے کہ بنی اسمٰعیل اور جرہم جو مکہ میں رہتے تھے اُن کو گنجائش نہ ہوئی تو وہ ملک میں نکلے، اور معاش کی تلاش میں پڑے، پس لوگ خیال کرتے ہیں کہ اولاً پتھر کا پوجنا بنی اسمٰعیل میں اس طرح شروع ہوا کہ جب اُن میں سے کوئی مکہ سے جاتا تو حرم کے پتھروں میں سے ایک پتھر

ان بنی اسمٰعیل وجرهم من ساكني مكة ضاقت عليهم مكة فتفسحوا في البلاد والتمسوا المعاش ليزعمون ان اول ما كانت عبادة الحجارة في بني اسمٰعيل انه كان لا يظعن من مكة ظاعن منهم الا احتملوا معهم من حجارة الحرم تعظيماً للحرم و

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

البتہ ہم نے دیکھا تیرے مُنہ کا پھیرنا آسمان کی طرف پھر ہم تجھ کو ایک قبلہ کی طرف پھیرینگے کہ تو اُس کو پسند کریگا۔ پھر پھیرا اپنا مُنہ مسجد حرام کی طرف، اور جہاں تم ہو، پس پھیرو اپنے منھوں کو اُسی کی طرف اور بے شبہ جن لوگوں کو کتاب دیگئی ہے البتہ جانینگے وہ حق ہے اُن کے پروردگار سے اور اللہ بیخبر نہیں ہے اُس چیز سے جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۳۹﴾

صبابه بمكه وبالكعبه حيث ما حلوا وصعوه فطافوا به كالطواف بالكعبه حتى سلخ ذلك بهم الى ان كانوا يعبدون ما استحسنوا من الحجارة واعجبهم من حجارة الحرم خاصة حتى خلف الخلوف بعد الخلوف ونسوا ما كانوا عليه واستبدلوا بدين ابراهيم واسمعيل غيره وعبدوا الاوثان الخ —

(صفحہ ۲،)

اُٹھا لینا، حرم کو بزرگ سمجھ کر اور مکّہ اور کعبہ کے شوق میں جہاں اُترتے، تو اُس پتھر کو رکھ لیتے، اور اُس کے گرد مثل کعبہ کے طواف کرتے، پھر اُس کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جو پتھر اچھا دیکھتے، اور جو حرم کا پتھر عجیب اور اچھا معلوم ہوتا اُس کی عبادت کرتے، اسی طرح پشتوں پر پشتیں گذر گئیں اور بھول گئے جو بات پہلی تھی، اور ابراہیم اور اسمٰعیل کے دین کو بدل دیا اور بتوں کو پوجنے لگے ❊

اِس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اسمٰعیل اور جرہم کی اولاد میں پشت در پشت کبھی کعبہ کی جانب سمت قبلہ نہیں قرار پائی تھی، اور اُن کا طریقہ عبادت ہی کا ایسا تھا کہ کوئی سمت قبلہ قرار نہیں پا سکتی تھی قرآن مجید میں بھی کہیں اِس بات کا ذکر نہیں ہے کہ خدا نے اسمٰعیل یا اُس کی اولاد کے لیئے کعبہ کو سمت قبلہ مقرر کرنے کا حکم دیا تھا، زمانہ جاہلیت میں جب کہ عرب کی قوم نے کعبہ میں بُت رکھ دیئے تھے، اُس زمانہ میں بھی جو کچھ اُن کی پوجا ہوتی ہوگی، وہ کعبہ میں ہوتی ہوگی، لیکن یہ بات کہ جب وہ کعبہ سے دُور چلے جاتے تھے اور مقاموں میں ہوتے تھے جب بھی کعبہ کی طرف مُنہ کر کے پوجا کرتے تھے کسی طرح ثابت نہیں ❊

بنی اسرائیل میں جب بیت المقدّس کی تعمیر ہوگئی تو وہ بھی بطور ایک مسجد کے بنائی گئی تھی، اور تمام رسومات عبادت کی جو کچھ کہ بنی اسرائیل ادا کرتے تھے اُسی معبد یا مسجد میں جا کر ادا کرتے تھے۔ مگر اس زمانہ تعمیر بیت المقدس میں اُن کے وحشیانہ طریق عبادت یا نماز میں کافی اصلاح ہوگئی، اور ایک باقاعدہ ارکان نماز کے جس میں قیام اور رکوع بھی تھا قرار پائے۔ ہم کو عہد عتیق کی کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ خدا نے بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تم بیت المقدس میں

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾	اور اگر تو اُن لوگوں کے لئے جن کو کتاب دیگئی ہے تمام نشانیاں لے آوے تب بھی تیرے قبلہ کی پیروی نہ کرینگے، اور تو بھی اُن کے قبلہ کی پیروی کرنیوالا نہیں ہے، اور نہ اُن میں کے بعضے پیروی کرنے والے ہیں بعضوں کے قبلہ کی، اور اگر تو ان کی خواہشوں کی پیروی کرے بعد اس کے کہ تجھ کو علم آگیا ہے تو بیشک تو اس وقت ہوگا ظالموں میں ﴿۱۴۰﴾

سے دور ہو تو اُس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ مگر جب کہ بنی اسرائیل کی نماز ایک باقاعدہ ہو گئی تھی، اور اُس کے ادا کرنے میں کسی نہ کسی طرف مُنہ کا ہونا ایک لازمی امر تھا، اِس لئے بالطبع بنی اسرائیل اس بات پر مائل ہوئے ہونگے کہ بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھیں، اور اس طرح پر بیت المقدس اُن کا سمتِ قبلہ قرار پاگیا ✦

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت قریب تیرہ برس کے مکہ میں تشریف رکھی۔ اس بحث کو چھوڑ دو کہ نماز پنجگانہ فرض ہو چکی تھی یا نہیں، اور جو ارکان نماز کے بالفعل مسلمانوں میں مقرر ہیں وہ مقرر ہو چکے تھے یا نہیں، مگر اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اُس زمانہ دراز میں بھی کوئی طریقہ عبادت کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ضرور اختیار کیا تھا، خواہ یہی ارکان نماز کے اختیار کئے ہوں جو بالفعل موجود ہیں خواہ بعد کو اُن میں کچھ اصلاح ہو گئی ہو، لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے کہ ایسے حالتوں میں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے بعید ہوں تو اُنھوں نے نماز یا عبادت ادا کرنے میں کعبہ کی طرف مُنہ کر کے ادا کرنا بطور ایک امر لازمی کے جس سے ثبوت سمت قبلہ کا ہو اختیار فرمایا ہو، بلکہ ہر طرح قرینہ و قیاس اس بات کا مقتضی ہے کہ جب تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تشریف رکھی کوئی سمت قبلہ اختیار نہیں کی ✦

جب کہ حضرت مکہ سے مدینہ میں تشریف لے گئے جہاں یہودی کثرت سے تھے، اور اُن کی نماز بھی قریباً قریباً اُسی قسم کی تھی جیسی کہ مسلمانوں کی تھی، تو بالطبع آنحضرت کو اُسی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے کی رغبت ہوئی جس طرف کہ یہودی متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ بلا شبہ یہ امر مشرکین کو شاق گذرا ہوگا، لیکن بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے میں ایک بڑی حکمت یہ تھی کہ مشرکین میں سے جو لوگ منافق تھے وہ اصلی ایمان والوں سے بالکل ممیز ہو جاتے تھے۔ یہی بات خدا تعالےٰ نے بھی فرمائی ہے کہ،، وما جعلنا القبلة التی کنت علیہا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ،، یعنی ہم نے اُس قبلہ کو جس پر تو تھا بجز اس مطلب کے

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّیۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ اَیۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیۡعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَاِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾	وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے اُس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور بیشک اُن میں سے ایک فریق البتہ چھپاتا ہے حق کو اور وہ جانتے ہیں ﴿۱۴۱﴾ حق (بات) ہے تیرے پروردگار (کی طرف) سے، پھر تو مت ہو شک کرنے والوں میں ﴿۱۴۲﴾ اور ہر ایک کے لئے ایک طرف ہے کہ وہ اُس طرف مُنہ کرتا ہے، پس تم دوڑ کر بھلائی کو لو جہاں کہیں تم ہو گے تم کو اللہ لے آویگا اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۴۳﴾ اور جہاں کہیں تم جاؤ پھر اپنے مُنہ کو مسجد الحرام کی طرف پھیرو، اور بیشک وہی حق ہے تیرے پروردگار کی طرف سے اور اللہ بیخبر نہیں ہے اُس چیز سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۴﴾

اور کسی لئے نہیں مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں اُس شخص کو جو پیروی کرتا ہے رسول کی اُس شخص سے جو پھر جاتا ہے اپنی ایڑیوں پر +

مدینہ میں اور اُس کے گرد نواح میں کثرت سے یہودی رہتے تھے، اور اُنہوں نے بھی اسلام کی طرف رغبت ظاہر کی، چند نے دل سے اسلام کو برحق جانا، اور بہت سے ایسے تھے جو بطور منافقوں کے مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتے تھے، پس جو ضرورت منافقین مشرکین کو اصلی ایمان والوں سے ممیز کرنے کی پیش آئی تھی۔ وہی ضرورت منافقین یہود کو اصلی ایمان والوں سے ممیز کرنے کی پیش آئی۔ ہر ایک شخص ظاہر داری کے لئے دوسرے مذہب کی جس کو کہ وہ حق نہیں سمجھتا چھوٹی باتوں میں منافقانہ طور پر شریک ہو سکتا ہے، لیکن کسی ایسی بات میں جو ایک امر عظیم ہو، اور خاص عبادت سے علاقہ رکھتا ہو، اور ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہونے کی بطور ایک نشانی کے ہو، اُس کو بطور ایک نفاق کے ادا کرنے سے بالطبع نفرت اور پرہیز کرتا ہے، اور جب تک کہ دل ہی سے اُس دوسرے مذہب کو نہ قبول کر لیا ہو اُس وقت تک اُس کو ادا نہیں کرتا۔ اس لئے آنحضرت کو فکر ہوئی کہ سمت قبلہ کو تبدیل کیا جائے، اور اُس پر خدا سے وحی آئی کہ کعبہ کی طرف سمت قبلہ بدل دو، اُسی کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے،، قد نری تقلب وجھك فی السماء فلنولینك قبلة ترضٰھا فول وجھك شطر

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۴۵﴾

اور جہاں کہیں تم جاؤ پھر پھیرو اپنے مُنہ کو مسجد الحرام کی طرف، اور جہاں کہیں تم ہو پھر پھیرو اپنے مُنہوں کو اسی طرف تاکہ نہ ہو لوگوں کو تم پر کچھ حجّت، بجز اُن لوگوں کے جنہوں نے اُن میں سے ظلم کیا ہے، پس اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اور تاکہ پوری کروں میں تم پر اپنی نعمت، اور تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۱۴۵﴾

المسجد الحرام"۔ یعنی ہم نے دیکھا تیرا مُنہ کا پھرنا آسمان کی طرف پھر ضرور ہم تجھ کو ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیریں گے جس کو تو پسند کریگا، پس پھیر اپنا مُنہ مسجد حرام کی طرف۔ بیت المقدس اور بیت الحرام دونوں مسجدیں تھیں، اور دونوں میں سے کسی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنا برابر تھا، مگر ایسا کرنے سے منافقین یہود کی اصلی ایمان والوں سے تمیز ہو گئی، یہ امر ایک ایسا ممیز قرار پایا کہ آنحضرت نے فرما دیا کہ "من استقبل قبلتنا فھو مسلم" یعنی جس شخص نے کہ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھی وہ مسلمان ہے، اور درحقیقت یہ امر ایسا ہے کہ جب تک کوئی یہودی دل سے مسلمان نہ ہو گیا ہو بیت المقدس چھوڑ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے پر بالطبع اُس کو جرأت نہیں ہو سکتی ✦

اسی نشان کے قائم اور مستحکم رہنے کو خدا نے یہ حکم دیا کہ جہاں کہیں تم ہو اور جہاں کہیں جاؤ تو کعبہ ہی کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھو، مگر سمت قبلہ قرار دینے میں ایک بڑا نقص بہ لازم آتا ہے کہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جمتی ہے کہ اُس سمت کو یا اُس مکان کو جو سمت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے خدا کی ذات سے کوئی خاص خصوصیت ہے، اور اُس سمت میں یا اُس مکان میں بالتخصیص خدا ہے۔ اس خیال کے باطل کرنے کو صاف صاف ہدایتیں خدا نے تحویل قبلہ کے ساتھ ہی ساتھ بتلا دیں، جہاں فرمایا کہ "وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ" یعنی خدا کے لئے ہے مشرق اور مغرب، پس جدھر مُنہ کرو اُدھر ہی خدا کا مُنہ یعنی اُس کی ذات ہے۔ اس ہدایت نے صاف صاف لوگوں کو شرک سے نجات دی، اور جس طرح کہ مشرکین اپنے بتوں یا معبدوں کو سمت قبلہ بناتے ہیں، اور جس طرح کہ مسلمانوں نے سمت قبلہ ٹھیرایا ہے اُن دونوں کے فرق کو بخوبی سمجھا دیا ہے، اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مشرکین کی سمت قبلہ اور مسلمانوں کی سمت قبلہ میں کیا فرق ہے، مسلمانوں کے مذہب کے مطابق کوئی خصوصیت یا وقعت بیت المقدس یا بیت الحرام کو قبلہ ہونے کے لئے نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ صرف ابتداءً واسطے تفریق درمیان منافقین اور مومنین کے ٹھیرا یا گیا، اور انتہاءً بطور مسلمانوں کی ایک نشانی کے قرار پایا ✦

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۱۴۶) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۱۴۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۴۸) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۴۹)

جس طرح کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے رسول بھیجا ہے سُناتا ہے تم کو میری نشانیاں، اور تم کو پاک کرتا ہے، اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اور وہ ہر چیز تم کو سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے (۱۴۶) پھر مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کرونگا، اور میرا شکر کرو اور ناشکری مت کرو (۱۴۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو مدد چاہو صبر کرنے سے اور نماز پڑھنے سے بیشک اللہ تعالےٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (۱۴۸) اور مت کہو اُن لوگوں کو جو مارے جاویں اللہ کی راہ میں مُردے، بلکہ وہ زندے ہیں ولیکن تم نہیں جانتے (۱۴۹)

کعبہ کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھنا اسلام کا کوئی اصلی حکم نہیں ہے۔ جو احکام اسلام میں ہیں لوگ اُن کو بخوبی نہیں سمجھتے۔ اس بات میں تو بہت لوگوں نے کوشش کی ہے کہ کونسا حکم فرض ہے، اور کونسا واجب، اور کونسا سنت، اور کونسا مستحب، جو صرف ایک فرضی یا خیالی یا اصطلاحی امور ہیں، اور اس تفریق کو اصل مذہب اسلام سے کچھ چنداں تعلق نہیں ہے، اسلام کی حقیقت اور اس کے اسرار جاننے والے کو صرف اُسی تفریق کا جاننا کافی نہیں ہے، بلکہ اُس کو اس امر کا جاننا اور اس امر کا تحقیق کرنا ضرور ہے کہ درحقیقت اصلی احکام اسلام کے جن پر اسلام قائم ہے کون سے ہیں اور اُن کے سوا کون سے +

بالفعل مذہب اسلام جو ایک مجموعہ حقیقی اور فرضی یا واقعی اور قیاسی یا اجتہادی اور استنباطی احکام کا گنا جاتا ہے، وہ دو قسم کے احکام پر منقسم ہوسکتا ہے۔ اول حقیقی اور واقعی۔ دوم فرضی اور قیاسی اور اجتہادی اور استنباطی۔ پچھلی قسم کو مذہب اسلام کے احکام قرار دینا صرف ایک فرضی یا اصطلاحی بات ہے اور صرف اس وجہ سے کہ ائمہ اسلام اور علمائے اعلام نے اُن کو استخراج کیا ہے احکام اسلام کا بطور ایک اصطلاح کے اُن پر اطلاق ہوتا ہے، ورنہ درحقیقت وہ اصلی احکام مذہب اسلام کے نہیں ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اُن احکام کو تسلیم کرے خواہ نہ کرے، دونوں حالتوں میں اُس کے اسلام میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اگر درحقیقت وہ واقعی اصلی احکام اسلام کے ہوتے تو اُن کے نہ ماننے سے اسلام سے خارج ہونا ایک امر لازمی ہوتا۔ جہاں تک کہ خراساں مذہب اسلام میں مخالفین بیان کرتے ہیں وہ اسی غلطی پر مبنی ہیں کہ اُنہوں نے اُن احکام اور مسائل کو جن کو علما اور ائمہ نے استنباط اور استخراج کیا ہے جزو اسلام

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾ الَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾

اور ہم تمہارا امتحان کرینگے ایک چیز سے، ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور خوشخبری دے صبر کرنے والوں کو (۱۵۰) وہ لوگ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں، اور ہم اُسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں (۱۵۱) یہی لوگ ہیں کہ اُن پر اُن کے پروردگار کی طرف سے درود اور رحمت ہے، اور وہی لوگ ہدایت پائے ہوئے ہیں (۱۵۲)

سمجھا ہے، حالانکہ اسلام کو اُن سے کچھ علاقہ نہیں۔ اگر وہ صحیح اور ٹھیک ہیں فہو المراد، اور اگر اُن میں کوئی غلطی اور خطا ہے تو وہ اُن کی ہے جنہوں نے اُن کو استخراج کیا ہے، نہ مذہب اسلام کی۔ ہمارا مقصد اس بیان سے کسی عالم یا امام کی حقارت کرنے کا، یا کسی شخص کی جو اُن کی پیروی کرتا ہے تحقیر کرنے کا، یا اُس کو بُرا جاننے کا نہیں ہے۔ بلکہ صرف احکام اصلی اور استخراجی میں فرق بتانا، اور اُن لوگوں کو جو حقائق یا اسرار اسلام پر غور کرنا، یا مخالفین اسلام کو جو اُس پر اعتراض کرنا چاہتے ہیں، حقیقت احکام اور تفرقہ اُن دونوں قسم کے احکام میں بتانا مقصود ہے، تاکہ پہلے تحقیق حقائق یا اسرار اسلام میں اور پچھلی غلط بنا پر اعتراض کرنے میں غلطی نہ کریں *

پہلی قسم البتہ بیان کے لائق ہے۔ مذہب اسلام میں جو اصلی اور واقعی احکام ہیں وہ دو قسم ہیں، ایک اصلی اور دوسری محافظ احکام اصلی، جس کو ہم اس زمانہ میں قانون اور ضابطہ کارروائی سے اصطلاح قانونی میں تعبیر کرتے ہیں۔ مذہب اسلام کے احکام اصلی جس قدر ہیں اُنہی پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور اُن میں سے کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جو قانون قدرت اور انسان کے نیچر کے برخلاف ہو، بلکہ اُن پر غور کرنے سے اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ مذہب انسان کے لئے بنایا گیا ہے نہ انسان مذہب کے لئے۔ احکام محافظ سے صرف اُن احکام اصلی کی حفاظت مقصود ہے، اور وہ خود مقصود بالذات نہیں ہیں۔ یہ احکام ایسے عام قاعدہ پر صادر ہوئے ہیں جو قریباً کل افراد کے مناسب حال ہیں، اور ممکن ہے کہ کسی شاذ و نادر فرد کے مناسب حال نہ ہوں، مگر ایسا ہونا اُن احکام کے نقصان کا باعث نہیں ہے، کیونکہ تمام احکام عام کا یہ خاصہ ہے کہ قریباً کل افراد کے مناسب حال ہوتے ہیں، گو کہ کوئی شاذ و نادر فرد ایسے بھی نکلتے ہیں کہ اُس کے مناسب حال نہ ہوں، مگر اس مطلب سے کہ قاعدہ کلیہ ٹوٹنے نہ پائے تمام افراد کے ساتھ یکساں عمل کرنا واجب ہوتا ہے *

احکام محافظ کی نسبت کسی نادان کا کوئی اعتراض کرنا، اور اُن کی نسبت اس بحث کا پیش کرنا

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿۱۵۴﴾

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پھر جس نے حج کیا خانہ کعبہ کا یا عمرہ ادا کیا پھر اُس پر گناہ نہیں ہے کہ اُن دونوں کا طواف کرے، اور جس نے اپنی خوشی سے ادا کیا نیکی کو پھر بیشک اللہ شکر کرنیوالا ہے جاننے والا ﴿۱۵۳﴾ ہاں جو لوگ کہ چھپاتے ہیں اُس چیز کو جو ہم نے اُتاری ہے نشانیوں اور ہدایت سے بعد اس کے کہ ہم نے اُس کو لوگوں کے لئے کتاب میں بیان کر دیا ہے، وہی لوگ ہیں کہ اُن پر خدا لعنت کرتا ہے اور اُن پر لعنت کرتے ہیں لعنت کرنے والے ﴿۱۵۴﴾

کہ اُن میں نیچر کی کیا مطابقت ہے، اور اُن احکام کو قانون قدرت سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا، ایک محض بیوقوفی کا اعتراض ہوگا، کیونکہ وہ احکام بالذات اس اعتراض اور بحث کے کہ وہ نیچر کے مطابق ہیں یا نہیں مورد نہیں ہو سکتے، بلکہ اُن پر یہ بحث ہو سکتی ہے کہ آیا وہ احکام اُن اصلی احکام کے جو بالکل قانون قدرت کے مطابق ہیں محافظ ہیں یا نہیں، اگر اُن کا محافظ ہونا ثابت ہو تو وہ بھی ضمناً داخل احکام اصلی اور مطابق قوانین قدرت اور صحیح تصور ہونگے، اور اگر اُن سے اصلی احکام کی محافظت ثابت نہ ہو تو بلاشبہ وہ غلط ہونگے ✤

ہاں ایک بحث اُن پر اور ہو سکتی ہے کہ جو طریقہ اُن احکام اصلی کی حفاظت کا احکام محافظ میں قرار دیا ہے مثل اُس کے دوسرا طریقہ بھی حفاظت کا موجود تھا، حالانکہ اُس کے ترک اور اُس کے اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ اُن احکام اصلی کی حفاظت کا دوسرا طریقہ اُس سے بھی اچھا موجود تھا۔ پہلا شبہ اگر وہ تسلیم بھی کر لیا جاوے تو بھی لغو اور مہمل ہوگا، کیونکہ یہ شبہ بطور ایک شبہ عامۃ الورود کے ہوگا جس کو تمام عقلا لغو اور بیہودہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر بالفرض دو مساوی چیزوں میں سے ایک کے ترک اور ایک کے اختیار کی کوئی وجہ نہ ہو تو جو شبہ اُس پر وارد ہوتا ہے وہی شبہ اُس وقت بھی وارد ہوگا، جب کہ مختار کو ترک اور متروک کو اختیار کیا جاوے۔ دوسرا شبہ اگر وارد ہو تو البتہ تسلیم کے قابل ہوگا، لیکن ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ مذہب اسلام میں جو طریقہ حفاظت احکام اصلی کا قرار دیا گیا ہے اُس کے مساوی بھی کوئی طریقہ اُن کی حفاظت اصلی کا نہیں ہے، چہ جائے اس کے کہ اُس سے افضل کوئی طریقہ دوسرا ہو ✤

ہم اِس مطلب کو دو ایک مثالوں سے سمجھاتے ہیں مثلاً نماز۔ قرآن مجید میں صرف نماز کا مقرر ہونا آیا ہے۔ اصلی حکم خدا کا اُس سے صرف اُس کے بندہ کا خدا کی طرف خلوص اور خضوع اور خشوع سے

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاَنَا
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۵۶﴾
خَالِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ
فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ
وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

بجز اُن لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور نکوکاری
اختیار کی اور ظاہر کردیا، پھر وہی لوگ ہیں کہ میں اُن کو
معاف کرونگا، اور میں بڑا معاف کرنے والا ہوں
مہربان ﴿۱۵۵﴾ ہاں جو لوگ کافر ہوئے اور مرگئے اور وہ کافر
رہے، وہی ہیں کہ اُن پر اللہ کی اور فرشتوں اور
آدمیوں کی سب کی لعنت ہے ﴿۱۵۶﴾ ہمیشہ اُسی میں
رہینگے، نہ اُن پر سے عذاب کی تخفیف ہوگی اور نہ اُن
کو مُہلت دی جاویگی ﴿۱۵۷﴾ اور تمہارا خدا خدائے
واحد ہے، نہیں کوئی خدا بجز اُس کے، بخشنے
والا ہے مہربان ﴿۱۵۸﴾ بیشک آسمانوں اور
زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور
دن کے اختلاف میں، اور کشتی میں جو دریا
میں چلتی ہے، جو نفع پہنچاتی ہے آدمیوں کو،
اور اُس چیز میں جس کو اللہ نے آسمان سے اُتارا ہے،
یعنی پانی پھر زندہ کردیا اُس سے زمین کو اُس کے
مرنے کے بعد، اور پھیلائے اُس میں ہر طرح کے
چلنے والے جانور، اور ہواؤں کے چلانے میں، اور
بادلوں کو آسمان اور زمین کے درمیان تابعدار کرنے میں، البتہ
نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں ﴿۱۵۹﴾

متوجہ ہونا، اور عجز و عبدیت کا ظاہر کرنا، اور شانِ خالقیت کا تسلیم کرنا، اور اُس کے سامنے اپنے تئیں عاجز اور ذلیل اور مسکین بناتا ہے، ارکان نماز کے جو قرار دئیے گئے ہیں وہ اُس تمام خضوع و خشوع ظاہری اور باطنی کے محافظ ہیں، بس اِن احکام محافظ پر یہ اعتراض کرنا کہ نماز میں اُٹھنا اور بیٹھنا اور سر جُھکانا نیچر کے برخلاف ہے ایک بیوقوفی کا اعتراض ہے، کیونکہ اِن احکام میں ایک یہ بات دیکھنی ہے کہ درحقیقت وہ اصلی حکم کے محافظ ہیں یا نہیں ٭

ان احکام اصلی اور احکام محافظ کا تفرقہ ایسے مقام پر بخوبی واضح ہوجاتا ہے جب کہ کوئی حکم احکام محافظ میں سے ساقط ہوجاتا ہے، اور اس کا سقوط ثابت کرتا ہے کہ وہ اصلی حکم نہیں تھا، جیسے نماز میں قیام اور قعود اور رکوع اور سجود اور قرأت، یہ سب احکام محافظ ہیں، جب انسان ان پر

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ
أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ
وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ
وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ
يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ
لِلّٰهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ
الْعَذَابِ (۱۶۰) إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا
مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ (۱۶۱)

اور لوگوں میں سے کوئی ٹھیراتا ہے اللہ کے سوا اللہ کی مانند، محبت کرتے ہیں اُن سے اللہ کی محبت کی مانند، اور جو لوگ ایمان لائے ہیں بہت زیادہ ہیں اللہ کی محبت میں اور اگر کوئی دیکھے اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ہے جب کہ وہ عذاب کو دیکھینگے، تو (جانیگا کہ) بیشک ساری طاقت اللہ کے لئے ہے، اور بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (۱۶۰) جب بیزار ہونگے وہ لوگ جنکی پیروی کی گئی تھی اُن لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی تھی، اور دیکھینگے عذاب کو اور کٹ جاوینگے اُنکے ذریعے (۱۶۱)

قادر نہیں ہوتا تو کسی کا ادا کرنا بھی اُس پر لازم نہیں ہوتا، برخلاف اُس اصلی نماز کے کہ وہ کسی حالت میں انسان سے جب تک کہ اُس پر مکلف ہونے کا اطلاق کیا جاتا ہے ساقط نہیں ہوتا، اس سے جو تمیز کہ ان دونوں قسم کے احکام میں ہے وہ بخوبی واضح ہوتی ہے، یا مثلاً اسلام نے ایک اخلاقی امر کی نسبت یہ حکم دیا ہے کہ جو عورت کہ اُس کا خاوند مر جاوے یا اُس کو طلاق دے تو اُس کو دوسرا شوہر کرنے میں اس قدر توقف کرنا چاہیئے جس سے معلوم ہو جاوے کہ وہ اُس شوہر سے حاملہ ہے یا نہیں، اور اس امر کے دریافت کرنے کو ایک معیاد مقرر کی ہے جو عورتوں کے تجربہ سے مناسبت رکھتی ہے۔ یہ حکم احکام محافظ میں سے ایک حکم ہوگا، اور بلاشبہ ایسی عورت نے جس نے اُس مدت سے بھی زیادہ عرصہ سے اپنے شوہر سے مقاربت نہ کی ہو مناسب حال نہ ہوگا، مگر یہ حکم تمام افراد سے از روئے عمل کے اس لیئے متعلق ہوگا کہ عام قاعدہ جو اکثر افراد سے متعلق ہے ٹوٹنے نہ پاوے، پس اس حکم محافظ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ قانون قدرت کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ یہ حکم اُس قانون قدرت کا محافظ ہے جس سے اولاد کو اپنے باپ پر اور باپ کو اپنی اولاد پر قانون قدرت کے موافق حقوق حاصل ہوتے ہیں +

مگر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ اگرچہ احکام اصلی اور احکام محافظ اپنی اصلیت میں مختلف درجہ اور حقیقت رکھتے ہیں، لیکن عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے، اور اس لئے جس طرح احکام اصلی کی تعمیل لازم ہے، اُسی طرح احکام محافظ کی بھی تعمیل لازم ہے، کیونکہ وہ دونوں لازم و ملزوم یا موقوف و موقوف علیہ ہیں، اور اس لئے عملاً دونوں میں کچھ فرق نہیں +

نماز میں سمت قبلہ کوئی حکم اصلی مذہب اسلام کا نہیں ہے، اور اس لئے ایک ادنےٰ سے عذر پر ساقط ہو جاتا ہے، مثلاً سمت مشتبہ ہونے پر، سہواً کسی دوسری سمت نماز پڑھ لینے پر، بعض صورتوں میں گھوڑے کی سواری پر، دریا کے سفروں میں، اور اس چودھویں صدی نبوی میں ریل کے سفر میں اور

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۲﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور کہینگے وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی تھی کاش ہمارے لئے دوبارہ جانا ہو تو ہم بیزار رہینگے اُن سے جس طرح کہ وہ ہم سے بیزار ہوئے ہیں، اِس طرح اُن کو دکھاویگا اللہ اُن کے اعمال، پشیمانیاں (ہونگی) اُن پر اور وہ آگ سے نکلنے والے نہ ہونگے ﴿۱۶۲﴾ اے لوگو کھاؤ اُس چیز کو جو زمین میں ہے حلال پاکیزہ، اور مت پیروی کرو شیطان کے قدموں کی، بیشک وہ تمہارے لئے دشمن ہے علانیہ ﴿۱۶۳﴾ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ تم کو حکم کرتا ہے بُرائی کا اور بیحیائی کا اور اس بات کا کہ تم کہو اللہ پر وہ کچھ جو تم نہیں جانتے ﴿۱۶۴﴾

علیٰ ہذا القیاس۔ مگر چونکہ یہ حکم بطور ایک نشان اور تمیز اُن لوگوں کے قرار دیا گیا ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے، اِس لئے اس کا بھی بجالانا مثل احکام اصلی کے ضرور ہوگا، اور قصداً ترک نہ کیا جائیگا، ہاں اُن لوگوں پر تعجب ہوگا جو غلبہ اوہام سے سمت قبلہ کے لئے دو پہر میں باہر نکلکر سورج کو دیکھتے پھرتے ہیں کہ کس طرف سے نکلا تھا، اور کس طرف ڈوبے گا، اور اپنی جیبوں اور تسبیحوں میں قطب نما یا قبلہ نما رکھے یا لٹکائے پھرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ٹھیک ہماری ناک کعبہ کے سامنے ہوجائے، اور اسی میں ایک بڑا ثواب اور ٹھیک ٹھیک نماز کا ادا کرنا سمجھتے ہیں +

سمت قبلہ کی تحویل پر یہودی جو طعنہ دیتے تھے اُس کا ذکر بھی خدا نے اس مقام پر کیا ہے، اور اُن کی نادانی کو بتلایا ہے کہ باوجود اس بات کے جاننے کے کہ تحویل قبلہ ٹھیک ہے، پھر اُس پر طعنہ کرتے ہیں، جہاں فرمایا ہے کہ، «یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم» یعنی یہودی تحویل قبلہ کا حق ہونا ایسا ہی جانتے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں، «یعرفونہ» میں جو ضمیر ہے اُس کی نسبت مفسرین میں اختلاف ہے، اکثر تو اُس کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہودی توریت کی بشارات سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نبی برحق ہونا ایسا ہی یقینی جانتے تھے جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو جانتے تھے، اور ابن عباس اور قتادہ اور ربیع اور ابن زید کا یہ قول ہے کہ، «یعرفونہ» کی ضمیر امر قبلہ کی طرف راجع ہے، اور یہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے، اِس لئے کہ یہاں اول سے آخر تک امور متعلق قبلہ کا ذکر ہے، نہ آنحضرت ص کے نبی ہونے کی بشارات کا +

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

اور جب اُن سے کہا جاوے کہ پیروی کرو اُس کی جو اللہ نے اُتارا ہے تو کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم پیروی کرینگے اُس چیز کی جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اگرچہ تھے اُن کے باپ دادا کہ نہیں جانتے تھے کچھ بھی، اور نہ ہدایت پائے ہوئے تھے ﴿۱۶۵﴾ اور اُن لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے اُس شخص کی (بھیڑوں کی) مثال کی مانند ہے جو آواز دیتا ہے ایسے بے معنی الفاظ سے کہ بجز بُلانے اور آواز کرنے کے اور کچھ نہیں سُنتا، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پھر وہ نہیں سمجھتے ﴿۱۶۶﴾

توریت میں حضرت ابراہیم کا اور حضرت اسمٰعیل کا اور اُن کے فاران میں یعنی حجاز میں آباد ہونے کا ذکر موجود ہے، جس پر یہودی مذہبی اعتقاد سے بھی یقین رکھتے تھے، یہودی توریت کی رُو سے اس بات کو بھی یقینی جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم کا طریقہ عبادت کے لئے مذبح قائم کرنے اور بیت ایل یعنی بیت اللہ بنانے کا تھا، اُن کو اپنی قومی اور پشتینی روایتوں سے یقین کامل تھا کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا بیت اللہ ہے، اور من وجہ بیت المقدس سے ترجیح رکھتا ہے اور اُس کی طرف سمت قبلہ ہونا عین حق اور درست ہے، انہی وجوہ پر خدا نے پر فرمایا کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" اور یہی وجہ اُن کے الزام کی ہے، کہ باوجود ان سب باتوں کے جاننے کے حق بات کو چھپاتے ہیں، اور پھر تحویل قبلہ پر طعنہ دیتے ہیں +

یہ سب باتیں جو ہم نے بیان کیں ایسی صاف وصریح ہیں کہ ہر شخص جو قرآن مجید کی سیاق وسباق عبارت پر غور کریگا بلاشبہ اُن کو تسلیم کریگا +

﴿۱۴۹﴾ (وَلَا تَقُوْلُوْا) اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد بھی خدا تعالیٰ نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے شدائد پر صبر کرنے کی ہدایت کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں نے سلمانوں کے قتل وقتال پر کمر باندھی تھی، اور یہ آیت بعد وقوع قتل وقتال نازل ہوئی ہے جس میں کچھ مسلمان کام آئے تھے۔ مفسرین کا قول ہے کہ وہ جنگ بدر تھی، جس میں چھ مسلمان مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے کام آئے تھے۔ بہرحال کسی واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہو ہم کو جو بحث ہے وہ اس بات سے ہے کہ اس قول کے کہ " اُن کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں " کیا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۶۷)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں، اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو (۱۶۷)

معنی ہیں ✤

اس کی نسبت مفسرین کے تین قول ہیں، ایک یہ کہ یہ وہ شہید ہوتے ہی اُسی وقت درحقیقت زندہ ہوجاتے ہیں لیکن ہم کو اُن کا زندہ ہونا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ احیاء سے مراد بہجوں ہے، یعنی زندہ ہونگے، یعنی قیامت کے دن۔ اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ خدا نے کہا ہے کہ "اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ"۔ "اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ"۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ" اُن سب کے معنی یہ ہیں کہ، سیصیرون کذلك، یعنی عنقریب ایسے ہوجاویں گے۔ تیسرے یہ کہ اُن کو مردہ مت کہو وہ تو زندہ ہیں، یہ کہنا ایسا ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ "ما مات رجل خلف مثلك" یعنی وہ شخص نہیں مرا جس نے تیرے مانند خلف چھوڑا ہے۔ جو لوگ دین کی اشاعت کے سبب مارے گئے ہیں درحقیقت اُنہوں نے دین حق کے پھیلانے اور اپنے بعد اُس نیکی کو قائم رہنے اور جاری رہنے کے لئے جان دی ہے۔ پس اُنہوں نے اپنے بعد ایسی نیکی چھوڑی ہے جو اس سے بہتر نہیں ہوسکتی، اور اسی اعتبار سے اُن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں جن سے ایسی نیکی قائم و جاری ہے، پس حیات سے اُن کی حیات فی الدین مراد ہے جیسے کہ ایک جگہ خدا نے ایمان والوں کی نسبت فرمایا ہے "او من کان میتا فاحییناہ"، اور سورۂ آل عمران میں جو خدا نے اُن کی حیات کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ "بل احیاء عند ربهم"، اس سے اور زیادہ اس مطلب کو تقویت ہوتی ہے کہ اُن کی حیات سے حیات فی الدین مراد ہے نہ اور قسم کی حیات، میرے نزدیک تیسرے معنی صحیح ہیں ✤

(۱۶۷) (كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ) اس آیت سے پہلے خدا تعالیٰ نے اُن پاکیزہ چیزوں کے کھانے کی اجازت دی تھی جو زمین میں ہیں یعنی جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں، اور اس آیت میں عموماً پاکیزہ چیزوں کے کھانے کی اجازت ہے جس لفظ کا ترجمہ ہم نے پاکیزہ کیا ہے وہ لفظ طیبات ہے، اُس کے معنی مزے دار اور خوشگوار غیر مضر کے ہیں۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ "ان الطیب فی اصل اللغة عبارة عن المستلذ المستطاب"۔ پس ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ تمام چیزیں جو انسان کے لئے مضر نہیں ہیں وہ حلال ہیں، اور وجہ حلت و حرمت اشیاء ماکول جو خدا نے بتائی ہے وہ اُنکے مضر اور غیر مضر یا مضر اور مفید ہونے پر مبنی ہے ✤

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ	اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ حرام کیا ہے تم پر مرا ہوا اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ (جس پر ذبح کرنے میں اور کسی کا نام) سوائے خدا کے پکارا جائے، پھر جو کوئی مضطر ہو نہ زیادتی کرنے والا اور نہ حد سے گذرنے والا، پھر اُس پر گناہ نہیں،

(۱۶۸) (اِنَّمَا حَرَّمَ) اس آیت میں اُن تین مضر چیزوں کا بالتخصیص ذکر کیا ہے جن کے کھانے کا رواج عرب کی قوموں میں تھا۔ عرب کے لوگ مرے ہوئے جانور کو اور سور کو کھاتے تھے، اور جانوروں کا گلا کاٹنے میں جو خون نکلتا ہے اُس کو ایک برتن میں جمع کرتے تھے، اور جب وہ جم کر لوتھڑا ہو جاتا تھا تو بھون کر کھاتے تھے، اور یہ تینوں چیزیں انسان کے لئے مضر ہیں، گو کہ مثل زہر کے فی الفور اُن کی مضرت نہ ظاہر ہو۔

مرے ہوئے جانور کے مضر ہونے میں جو اپنی موت سے مرجاتا ہے کسی کو کلام نہیں، اور دمِ مسفوح کا مضر ہونا بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ سور کے گوشت کے مضر ہونے پر (علی الخصوص گرم ملکوں میں) بہت سے مباحثے ہوئے ہیں اور انجام کار اُس کا مضر ہونا تسلیم ہوا ہے۔ پس ان تینوں چیزوں کے حرام ہونے کی وجہ اُن کے مضر ہونے پر مبنی ہے۔ علاوہ اس کے اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غذا کی تاثیر اُن کے اخلاق پر ضرور ہوتی ہے۔ سؤر میں بعض خصائل ذمیمہ ایسے پائے جاتے ہیں جو عام اخلاق انسانی کے برخلاف ہیں، اور اس لئے اُس کا کھانا بلحاظ حفظ اخلاق انسانی ممنوع کرنا بلاشبہ انسان کو اخلاقِ ذمیمہ سے محفوظ رکھنا ہے۔

البتہ چوتھی چیز یعنی "وما اهلّ به لغیر الله" کی حرمت قابل بحث ہے۔ پس اس کی حرمت نفس مذبوح کے مضر ہونے یا نجس ہو جانے کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ اُس کی حرمت واسطے مٹانے رسم شرک کے ہے۔ مشرکین عرب کا دستور تھا، جیسے کہ ہندوستان میں ہندؤں کا دستور رہے، کہ جانوروں کا گلا بتوں اور دیبیوں کا نام لیکر کاٹتے تھے، جس کا یہ مقصود تھا کہ اُس کی نذر اور اُس کے تقرب کے لئے جانور کو مارا ہے، یہاں تک کہ جو جانور اپنے کھانے کے لئے بھی مارتے تھے اُس کو بھی کسی بت یا دیبی کی نذر مقرر کر کے اور اُسی کا نام لیکر مارتے تھے۔ ہندوستان میں اب تک یہ رسم ہندؤں میں ہے، اور کوئی ہندو کسی بکرے کا بغیر دیبی کے نام کے جھٹکا نہیں کرتا۔ بہت گوشت خور ہندو ایسے ہیں کہ اگر کوئی جانور دیبی کے نام پر جھٹکا نہ کیا جاوے تو اُس کا گوشت نہیں کھاتے۔ اسلام میں تقرب الی غیر اللہ شرک اور کفر قرار پایا ہے۔ پس رسم شرک ہر طرح پر مٹانے کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ جو جانور اس رسم پر مارا جاوے وہ بھی نہ کھایا جاوے، پس حرمت مذبوح لغیر اللہ کی احکام محافظ حکم اصلی میں سے ہے جس کی تفصیل ہم

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۶۸)	بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان (۱۶۸)

اوپر لکھ آئے ہیں ✤

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ علما کا یہ قول ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی جانور کو بقصد تقرب الیٰ غیر اللہ کے

قال العلماء لو ان مسلما ذبح ذبیحه وقصد بذبحها التقرب الی غیر الله صار مرتدا وذبحته ذبیحة مرتد وهذا الحكم فی غیر ذبائح اهل الكتاب اما ذبائح اهل الكتاب فحل لنا لقوله تعالیٰ وطعام الذین اوتوا الكتب حل لكم
(تفسیر کبیر جلد ۱ - صفحہ ۶۱۰)

ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے، اور ذبیحہ اُس کا مرتد کا ذبیحہ ہے، اور یہ حکم اہل کتاب کے ذبایح کے سوا اوروں کے ذبیحہ سے متعلق ہے، اور اہل کتاب کے ذبایح ہمارے لئے حلال ہیں، جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ طعام اُن لوگوں کا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لئے حلال ہے ✤

بس اس آیت سے جس کی ہم تفسیر لکھتے ہیں اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ جو مسلمان کسی جانور کو تقرباً غیر خدا کے نام ذبح کرے اُس کا کھانا اس وجہ سے کہ وہ ایک فعل شرک پر ذبح کیا گیا ہے حفظاً لحکم التقرب الی اللہ وحدہٗ ممنوع و حرام ہے مگر یہ بات باقی ہے کہ اگر غیر مسلم اس طرح پر کرے تو اُس کا کھانا بھی ممنوع و حرام ہے یا نہیں۔ امام فخر الدین رازی نے جو قول علمائے اسلام نقل کیا ہے اُس میں ذبیحہ اہل کتاب کو مستثنے کیا ہے، جس کا یہ مقصد ہے کہ گو اہل کتاب نے تقرباً الیٰ غیر اللہ ہی ذبح کیا ہو مگر وہ حلال ہے، اور یہی قول بعض فقہا کا بھی ہے، اور اُنہوں نے تصریح کر دی ہے کہ "ولو ذبح باسم المسیح" مگر یہاں

ومن الناس من ✤ ✤ ✤ اجازوا ذبیحة النصرانی اذا سمی علیها باسم المسیح وهو مذهب عطاء ومكحول والحسن و الشعبی وسعید بن المسیب
(تفسیر کبیر جلد ۱ - صفحہ ۶۱۶)

یہ سوال باقی رہتا ہے کہ تو جہ دیگر اہل مذاہب کا لغیر اللہ ذبح کیا ہوا کیوں نہ حلال ہو۔ اس کا جواب بقاعدہ اہل نقل یہ ہو سکتا ہے کہ آیت طعام اہل کتاب سے اُن کا ذبیحہ مستثنٰے ہو گیا ہے اور دیگر اہل مذاہب کا ذبیحہ مستثنٰے نہیں ہوا، مگر پھر اس پر یہ سوال ہوگا کہ کیوں دیگر اہل مذاہب کا ذبیحہ مستثنٰے نہیں ہوا ✤

ہاں اگر اس استثنا کی یہ وجہ بیان کی جاوے کہ اہل کتاب میں کبھی لغیر اللہ جانور کے ذبح کرنے کی رسم و عادت نہ تھی، یا وہ خدا کے نام پر قربانی کرتے تھے، یا خدا کا نام لیکر ذبح کرتے تھے، جیسے یہود کی عادت ہے، یا کسی کا نام لئے بغیر ذبح کرتے تھے، جیسے کہ عیسائیوں کی عادت ہے، او صرف ذبایح اہل کتاب کے مستثنٰے کرنے کی اور دیگر اہل مذاہب کے ذبایح کے مستثنٰے نہ کرنے کی وجہ کافی ہوگی، اور اس لئے دیگر اہل مذاہب کا ذبیحہ یا جھٹکا حفظاً لحکم التقرب الی اللہ وحدہ حرام اور ممنوع الاکل رہیگا ✤

البتہ ایک سوال اور باقی رہتا ہے کہ اگر کسی غیر اہل کتاب نے کسی جانور کو لا لغیر اللہ ذبح کیا ہو تو وہ

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۶۹)

ہاں جو لوگ چھپاتے ہیں اُس کو کتاب میں سے جو اُتارا ہے اللہ نے اور لیتے ہیں اُس کے بدلے تھوڑی سی قیمت، وہی لوگ ہیں کہ نہیں کھاتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور نہ کلام کریگا اُن سے اللہ قیامت کے دن اور نہ اُن کو پاک کریگا، اور اُن کے لئے عذاب ہے دکھ دینے والا (۱۶۹)

بھی حرام اور ممنوع الاکل ہے یا نہیں۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہوگا، کیونکہ آیت "کلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ"، کا حکم عام نہیں ہے پس نص صریح قرآن مجید سے اُس کی حرمت ثابت نہ ہوگی الا اجتہاد سے جس کی تسلیم خود مجتہد یا اُس کے متبعوں پر لازم ہوگی نہ ہر شخص پر۔

(أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ) اس کے معنی میں بھی لوگوں نے اختلاف کیا ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کا نام پکارے جانے سے کیا مطلب ہے۔ اصمعی کا قول ہے کہ اہلال کے معنی پکارنے کے ہیں۔ احرام باندھنے والے پر مہل کا لفظ اس لئے بولا جاتا ہے کہ وہ احرام باندھتے وقت لبیک کہہ کر پکارتا ہے، اور ذابح پر بھی مہل کا لفظ بولتے ہیں کیونکہ عرب جانوروں کو ذبح کرتے وقت بتوں کا نام لے کر پکارتے تھے، اور "استہل الصبی" کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد چلاتا ہے اس لئے "ما اھل بہ لغیر اللہ" کے معنی یہ ہوئے کہ جو بتوں کے لئے ذبح کئے جاویں یہ مذہب تو مجاہد ضحاک اور قتادہ کا ہے۔ اور دوسرا قول ربیع بن انس اور ابن زید کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اھل بہ لغیر اللہ" سے یہ مطلب ہے کہ جو خدا کے نام کے سوا اور کسی کے نام پکارا جاوے۔ یعنی وہ ذبح کے وقت پکارے جانے کی قید نہیں لگاتے، بلکہ صرف غیر خدا کے نام موسوم کر دینے ہی کو "اھل لغیر اللہ" میں داخل کرتے ہیں، جیسے کہ ہندوستان میں مسلمان بکرے کو شیخ سدو، اور گائے کو میراں، اور مرغے کو مدار، کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں۔ ان مفسروں کی رائے کے مطابق جو جانور کہ غیر خدا کے نام تقرباً موسوم ہو گیا ہو، اور گو بروقت ذبح خدا ہی کا نام لیا جاوے تب بھی وہ حرام ہو جائیگا، اور پہلی رائے کے موافق حرام نہ ہوگا، بشرطیکہ خدا کا نام لیکر ذبح کیا جاوے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی تفسیر میں پچھلی رائے اختیار کی ہے۔ مگر درحقیقت وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ صرف نام رکھ دینا کہ شیخ سدو کا بکرا ہے اور میراں کی گائے یا مدار کا مرغا، یہ اقدام بالشرک ہے نہ وقوع شرک، اور جب تک شرک کا وقوع مذبوح کے اوپر نہ ہو اُس وقت تک وہ مذبوح ممنوع الاکل نہیں ہو سکتا۔ پس اگر ذبح کے وقت خدا کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہے تو اُس کا کھانا حرام

ترجمہ	آیت
وہی لوگ ہیں جنہوں نے خریدا ہے گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب کو بدلے مغفرت کے پھر کس چیز نے اُن کو صابر کیا ہے آگ پر (۱۷۰) یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب اُتاری ہے برحق، اور بلا شبہ جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے کتاب میں البتہ مخالفت میں (حق سے) دور ہیں (۱۷۱) کچھ یہ نیکی نہیں ہے کہ اپنے مُنہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو،	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۰) ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۱۷۱) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نہیں ہے ✣

(۱۶۹) (إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ) ہمارے مفسرین کی عادت ہے کہ جہاں قرآن میں اہل کتاب کی نسبت ایسا مضمون آیا کہ وہ توریت کی باتیں چھپاتے ہیں اُنہوں نے تفسیر میں لکھا کہ اس سے بشارات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا چھپانا مراد ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ مضامین جن پر بشارات کا اطلاق ہوتا ہے وہ خود توریت و انجیل میں بطور کنایہ اور اشارہ کے قرار پا سکتے ہیں اُن پر اطلاق اخفا کچھ ٹھیک نہیں ہے، اور نہ خدا کو اور نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی ضرورت تھی کہ جا بجا اپنی نبوت کے اثبات کے لئے توریت اور انجیل کے بشارات پر حوالہ کریں سچ ہے کہ لئے بشارت کی ضرورت نہیں، نبی خود نبوت کی دلیل ہے ۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ بلکہ اس اخفا سے صرف احکام توریت کا اخفا مقصود ہے جو یہودیوں میں کثرت سے رائج ہوگیا تھا، اور دنیوی لالچ اور ہوائے نفس سے برخلاف احکام توریت کے فتوے لکھ دیتے تھے اور اصلی احکام کو چھپاتے تھے حسن کا بھی یہی قول ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ " قال الحسن کتموا الاحکام وھو کقولہ تعالیٰ "، وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ " ✣

(۱۷۲) (لَيْسَ الْبِرَّ) اختیار کرنا سمت قبلہ کا گو وہ کیسی ہی خدا پرستی پر مبنی ہو خوف اور اندیشہ سے خالی نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی تردد تھا کہ کہیں کعبہ بُت پرستوں کی مانند نہ پُوجنے لگے اسی وجہ سے خدا تعالےٰ نے متعدد طرح سے اُس کو رفع کیا ہے، ایک جگہ فرمایا کہ " لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ۔ اور اس آیت میں فرمایا کہ " لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ " اور پھر بتایا کہ خدا کو، قیامت کو، فرشتوں کو، نبیوں کی کتابوں کو، نبیوں کو ماننا، خدا کی محبت سے غریب قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۱۷۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى

ولیکن نیکی اُس کو ہے جو ایمان لایا اللہ اور اخیر دن اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر، اور دیا مال اُس کی محبت پر قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرانے میں، اور پڑھی نماز اور دی زکوٰۃ، اور اپنے عہد کے پورا کرنے والوں کو جب کہ وہ عہد کریں اور صبر کرنے والوں کو خوف اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت، وہی لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور وہی لوگ پرہیزگار ہیں (۱۷۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو لکھا گیا تم پر قصاص مقتولوں میں،

سائلوں، اور قیدیوں کو کچھ دینا، غلاموں کو آزاد کرنا، نماز پڑھنی، زکوٰۃ دینی، اقرار پورا کرنا، سختی اور مصیبت میں اور لڑائی میں صبر کرنا دراصل نیکی ہے ❊

(۱۷۳) (کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ) اس آیت میں تین حکم ہیں۔ پہلا حکم اسلام میں قصاص کا قائم کرنا ہے۔ دوسرا حکم جو معاوضۂ خون کا زمانۂ جاہلیت میں یعنی قبل اسلام کے تھا بعد اسلام اُس کا باطل کرنا ہے۔ تیسرا حکم اُن معاہدوں کا قائم رکھنا ہے جو باہم قبل اسلام کے خونوں کی بابت ہوئے تھے ❊

عرب کے مختلف قبیلے جب مسلمان ہو گئے تو اُن میں ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے ایک دوسرے کو مار ڈالا تھا، اور اُس وقت تک مقتول کے لوگوں نے قاتل سے بدلا نہیں لیا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں بدلا لینے کا یہ دستور تھا کہ جو قومیں زبردست اور شریف تھیں وہ اپنے تئیں دوسری قوموں سے اس طرح بدلا لینے کا مستحق سمجھتی تھیں کہ اپنے غلام کے بدلے اُن میں کے ایک حر کو، اور اپنی عورت کے بدلے ان کے مرد کو، اور اپنے مرد کے بدلے اُن کے دو مردوں کو ماریں، اور نیز زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ مقتول کے وارث خون کو معاف کر دیتے تھے، اور کبھی قتل کے بدلے میں کچھ روپیہ یا مال قاتل سے یا قاتل کے قبیلہ سے لیکر راضی ہوتے اور دعوے قتل سے دست بردار ہو جاتے۔ پچھلے دو حکم اسی رسم جاہلیت سے علاقہ رکھتے ہیں (تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۶۳۱ و معالم التنزیل صفحہ ۶۷) ❊

پہلا حکم جو اسلام میں قصاص قائم کرنے کا ہے وہ اس آیت کے پہلے جملہ میں موجود ہے

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴿۱۷۳﴾ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾	آزاد بدلے آزاد کے غلام بدلے غلام کے عورت بدلے عورت کے، پھر جس شخص کو معاف کیا جاوے اپنے بھائی سے کچھ، پھر تابعداری کرنا ہے ساتھ نیکی کے اور اس کو ادا کرنا ہے ساتھ احسان ماننے کے ﴿۱۷۳﴾ یہ آسانی ہے تمہارے پروردگار سے اور رحمت، پھر جس شخص نے زیادتی کی اس کے بعد تو اُس کے لئے عذاب ہے دُکھ دینے والا ﴿۱۷۴﴾

جہاں خدا نے فرمایا ہے،، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی،، یہ جملہ ایک مستقل جملہ ہے اور تفسیر کبیر میں بھی بعض مفسرین کا یہ قول لکھا ہے کہ،، کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی جملۃ تامۃ مستقلۃ بنفسہا،،۔ اور اس جملہ سے مطلقاً یعنی بغیر کسی قید کے قصاص کا حکم پایا جاتا ہے یعنی قاتل بعوض مقتول کے مارا جائیگا، کوئی شخص قاتل ہو، اور کوئی شخص مقتول ہو، مرد ہو عورت ہو، آزاد ہو، کافر ہو، مسلمان ہو، یہ لازمی قصاص غالباً اُن لوگوں کو جو نئے مسلمان ہوئے تھے اور جن کے ہاں معافی اور خون کے بدلے مال لینا بھی جائز تھا سخت گراں گذرا ہوگا، اور اسی لئے اُس کے بعد خدا تعالےٰ نے قصاص میں جو حکمت ہے وہ بتلائی اور فرمایا کہ،، وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ،،۔ اور اس آخر آیت سے زیادہ تر اس رائے کو تقویت ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں صرف خون کے بدلے خون کا حکم ہے۔ اگرچہ مسلمانوں میں دیت اور معافی کا رواج جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا موقوف نہیں ہوا اور اُس کی بنا حدیثوں پر قائم کی ہے، مگر مجھ کو اِس مقام پر اُن سے بحث نہیں ہے، صرف یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت سے کیا حکم نکلتا ہے، سو وہ حکم یہی ہے کہ بلا کسی قید اور تفرقہ کے مقتول کے بدلے قاتل مارا جائے ٭

قصاص کے لفظ سے بعض علماء نے جو یہ مطلب سمجھا ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کو مارا ہے اُسی طرح قاتل بھی مارا جاوے یہ بھی اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف مقتول کے بدلے قاتل کا بے جان کردینا ثابت ہوتا ہے قصاص کے معنی دو آدمیوں کا ایک سا کام کرنے کے ہیں جیسے کہ عرب کہتے ہیں کہ،، اقص فلان اثر فلان،، جب کہ کوئی شخص ویسا ہی کام کرے جیسا کہ دوسرے نے کیا ہو۔ اہل شرع نے اس کے معنی یہ قرار دئیے ہیں کہ کسی انسان کے ساتھ ایسا ہی کیا جاوے جیسا کہ اُس نے دوسرے انسان کے ساتھ کیا ہو۔ مگر ایسی تعمیم قصاص کے معنی کی

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۵﴾	اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والوں تاکہ تم پرہیزگاری کرو ﴿۱۷۵﴾

اِس آیت کے لفظوں سے نہیں پائی جاتی کیونکہ اس آیت میں قصاص کے لفظ کے ساتھ ،، فی القتلیٰ ،، کی بھی قید لگی ہوئی ہے ، اور اس قید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس کے مقتول ہوجانے میں مساوات چاہیئے نہ کیفیت مقتول ہونے میں ، کیونکہ مقتول ہوجانا یعنی جان کا بدن سے مفارقت کرنا ایک چیز ہے اور جس طرح اور جس ذریعہ سے اُس نے مفارقت کی ہے وہ دوسری چیز ہے ، اور اس آیت میں لفظ قصاص سے مقتول ہونے میں یعنی جان کے بدن سے مفارقت کرنے میں مساوات چاہی گئی ہے نہ کیفیت قتل میں ۔ پس آیت کا حکم صرف اتنا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کو بیجان کر دیا ہو تو وہ بھی ویسا ہی یعنی بیجان کر دیا جاوے ٭

اس بیان سے ظاہر ہے کہ بعض علماء کا لفظ قصاص سے یہ سمجھنا کہ اگر کسی نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا ہو تو اُس کو بھی پتھر سے سر پھوڑ کر مارا جاوے ، اور اگر کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو اُس کو بھی آگ سے جلا کر مارا جاوے ، اور اگر کسی نے پانی میں ڈبو کر مارا ہو تو اُس کو بھی پانی میں ڈبو کر مارا جاوے ، صحیح نہیں ہے ۔ معہذا اُن علما کا یہ خیال بھی کہ ایسا کرنے میں ٹھیک ٹھیک مساوات ہوجاویگی غلط ہے ، کیونکہ ان افعال کو اس طرح پر عمل میں لانا کہ بالکل اُن افعال کے فعل میں اور اثر میں مساوی ہوں جو قاتل نے مقتول کے ساتھ کئے ہیں محض ناممکن ہے ۔ منطوق آیت کا صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مقتول کے بدلے قاتل بھی مار ڈالا جاوے ٭

دوسرا حکم جس طرح زمانہ جاہلیت میں معاوضہ خون لیا جاتا تھا اُس کا باطل کرنا ہے ، اور وہ ان الفاظ سے باطل ہوتا ہے ،، اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ،، اگرچہ علمانے ان لفظوں کی نسبت بہت بحث کی ہے جو ایک تطویل لاطائل ہے ۔ مگر صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ اسلام میں قصاص تو لیا جاویگا لیکن یہ طریقہ جو جاہلیت میں تھا کہ قاتل کو چھوڑ کر دوسرے شخص کو مارتے تھے ، اور غلام کے بدلے حُر کو مارتے تھے اور عورت کے بدلے مرد کو مارتے تھے ، اور ایک مرد کے بدلے دو مردوں کو مارتے تھے ، یہ طریقہ اسلام میں نہیں رہا ۔ بلکہ اگر کسی حُر نے حُر کو مارا ہے تو وہ حُر ہی مارا جائیگا ۔ اور اگر کسی غلام نے غلام کو مارا ہے تو غلام ہی مارا جائیگا ۔ اور اگر کسی عورت نے عورت کو مارا ہے تو عورت ہی ماری جائیگی ، اور حُر اور عبد اور انثیٰ پر الف لام ہے ، اُس سے قصاص میں قاتل و مقتول کی تخصیص لازم آتی ہے ۔ اس بیان سے اوپر کے جملہ کی جس میں قصاص کا حکم ہے تفصیل مقصود نہیں ہے ، بلکہ جاہلیت میں جو رواج تھا کہ عورت کے بدلے مرد کو ، اور غلام کے بدلے حُر کو مارتے تھے ، اُس کا موقوف کرنا مقصود ہے ٭

لکھا گیا تم پر کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت آئے اگر وہ مال چھوڑے تو وصیت کرے ماں باپ کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے نیکی سے، یہ کام مقرر کیا گیا ہے پرہیزگاروں پر (۱۷۶)	كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۱۷۶)

جن علماء نے غلطی سے ان الفاظ کو حکم قصاص کی تفصیل سمجھا ہے اُنہوں نے ایک بیفائدہ بحث کی ہے، اور نتیجہ اپنی بحث کا یہ نکالا ہے کہ اگر ایک حر نے کسی عبد کو مار ڈالا ہو، یا ایک عبد نے کسی حُر کو مار ڈالا ہو، یا ایک مرد نے کسی عورت کو، یا ایک عورت نے کسی مرد کو مار ڈالا ہو، تو اُن سے قصاص لینے کا حکم اس آیت میں پایا نہیں جاتا۔ اور اس لئے اُن کی قصاص میں مختلف رائیں ہوگئی ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ اگر کسی عبد نے حُر کو یا عورت نے مرد کو مار ڈالا ہو تو اُن سے قصاص لینا قیاس پر مبنی ہے، کیونکہ ادنٰے نے اعلےٰ کو مارا ہے۔ اور اگر ایک حُر نے عبد کو، یا مرد نے عورت کو مار ڈالا ہو تو اُن سے قصاص لینا اجماع پر مبنی ہے۔ مگر کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ سب رائیں غلط ہیں اور حجۃً اور حقیقۃً عموماً قصاص لینے کا حکم ثابت ہے ✤

تیسرا حکم ایام جاہلیت کے خونوں کی بابت معاہدوں کا قائم رکھنا ہے وہ ان الفاظ سے پایا جاتا ہے کہ، "فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"۔ یہ جملہ بھی اُسی پہلے جملہ کے تابع ہے جو جاہلیت کے خونوں سے علاقہ رکھتا ہے۔ اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ ایام جاہلیت کے خونوں کی بابت اگر کسی نے کچھ معاف کر دیا ہو، یا اُس کے عوض میں کچھ دینے کا اقرار کیا ہو تو وہ اُسی اقرار کے موافق ادا کر دیا جاوے قبل ایک ایسی چیز نہیں ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی اُس کے مواخذہ سے کوئی شخص بری ہو سکے۔ مگر زمانہ جاہلیت میں جو بے انتہا خون ہوئے تھے، اور بدلا لینے کے لئے قتل و قتال قائم تھے، اس لئے ابتداً اسلام میں اُن تمام جھگڑوں کے مٹانے کے لئے وہ معاہدے جو زمانہ جاہلیت میں قصاص سے بری ہونے کی بابت قرار پائے تھے اُسی طرح جائز رکھے گئے۔ اس خاص آیت کے استدلال سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسلام میں بھی قتل عمد کا معاف کر دینا یا دیت کا لینا جائز کر دیا گیا ہے۔ قتل خطا قتل عمد سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور اس میں دیت کا قرار پانا یا اور کسی معاوضہ کا ٹھہرانا انصاف کے برخلاف نہیں ہے ✤

(۱۷۶) (كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ) "کتب" کے لفظ سے علمائے اسلام فرض کے معنی لیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ والدین اور اقارب کے لئے وصیت فرض تھی۔ مگر کہتے ہیں کہ حکم اُس وقت تھا جب کہ آیت توریث نازل نہیں ہوئی تھی۔ اسی بات بلا شبہ تسلیم کے لائق ہے کہ آیت توریث کے نازل

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۷۷) فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۷۸)	پھر جس شخص نے بدل دیا وصیت کو اُس کے سننے کے بعد تو اُس کا گناہ اُنہی پر ہے جنہوں نے اُس کو بدلا ہے، بیشک اللہ سننے والا ہے جاننے والا (۱۷۷) پھر جس شخص کو ڈر ہو وصیت کرنے والے سے کج روی کا یا گناہ کا پھر اُس نے اصلاح کر دی اُن میں، تو اُس پر کچھ گناہ نہیں، بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان (۱۷۸)

ہونے کے بعد جو شدید ضرورت وصیت کی تھی وہ باقی نہیں رہی، کیونکہ ایک عام قاعدہ مقرر ہو گیا اور ہر شخص نے جان لیا کہ میرے بعد میرے اقربا میں اس طرح مال تقسیم ہو جاویگا ❊

لیکن فقہائے اسلام نے دو اور مسئلے وصیت کے متعلق قرار دئیے ہیں۔ ایک یہ کہ آیتِ توریث میں جو لوگ وارث قرار پائے ہیں اُن کے حق میں وصیت جائز نہیں" لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام" ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث" دوسرے یہ کہ ثلث مال سے زیادہ میں وصیت جائز نہیں۔ جو کچھ کہ فقہا نے اپنے اجتہاد سے یا کسی حدیث کی بنا پر مسئلہ ٹھہرایا ہے اُس میں بحث ضرور نہیں ہے، کیونکہ وہ بحث حدیث کی صحت و غیر صحت پر جا پڑتی ہے۔ بحث اس میں ہے کہ قرآن مجید سے وصیت کا کسی قید سے مقید ہونا پایا جاتا ہے یا نہیں، سو نہیں پایا جاتا ❊

قرآن مجید سے وصیت کرنا ایک فعل جائز ثابت ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت کرنے والے کے مرنے کے بعد اس طرح پر کیا جاوے جس طرح کہ خود اُس نے اپنی زندگی میں مقرر کر دیا ہے۔ جب کہ کسی شخص کو کسی سبب سے ہلاک ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جو مطلب "اذا حضر احدکم الموت" کا ہے تو اُس کو ضرور ہے کہ وصیت کر دے کہ اُس کا مال اُس کے والدین اور قرابت مندوں کو کیونکر دیا جاوے۔ آیت توریث سے اُس حکم کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ آیتِ وصیت کے نازل ہونے کے بعد بہ ضرور نہ تھا کہ کوئی شخص بلا وصیت مرے ہی نہیں۔ پس جو لوگ کہ باوجود حکم وصیت کے بلا وصیت مر جاویں اُن کے مال کی تقسیم کے لئے کوئی قاعدہ مقرر ہونا چاہئے تھا، وہ قاعدہ آیت توریث میں قرار پایا۔ پس قرآن مجید کی دونوں آیتوں کے ملانے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مرنے والے نے اگر کوئی وصیت کی ہے تو اُس کا مال اُس کی وصیت کے مطابق تقسیم کیا جاویگا اور اگر اُس نے کچھ وصیت نہیں کی یا جس قدر کہ وصیت کی ہے اُس سے زیادہ مال چھوڑا ہے تو اُس کے مال کی یا اُس قدر کی جو وصیت سے زیادہ ہے آیت توریث کے مطابق تقسیم ہو جاویگی۔ پس

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو لکھا گیا تم پر روزہ جس طرح کہ لکھا گیا اُن لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگاری کرو ﴿۱۷۹﴾ گنے ہوئے دنوں میں پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر تو شمار کرلے اور دنوں میں، اور (لکھا گیا) اُن لوگوں پر جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں بدلا دینا ہے ایک محتاج کی خوراک کا پھر جس شخص نے نیکی سے زیادہ دیا تو وہ اُس کے لئے اچھا ہے، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو ﴿۱۸۰﴾

دونوں آیتوں کا حکم بحال اور قائم ہے۔ ثلث سے زیادہ میں اور وارث کے حق میں وصیت کا جائز نہ ہونا ایک ایسا امر ہے جو قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں پایا جاتا، اور جن حدیثوں سے اُس پر استدلال کیا ہے اگر وہ تسلیم بھی کرلی جاویں تو بھی نہایت شبہ ہے کہ اُن سے اس امر پر استدلال ہوسکتا ہے یا نہیں۔

بلاشبہ وصیت کو غیر مقید رکھنے میں بداخلاقی یا حق تلفی کا احتمال ہوسکتا ہے اُس کا انسداد جہاں تک کہ بمقتضائے فطرت انسانی ممکن تھا وہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا ہے "بالمعروف" یعنی نیکی اور نیک دلی سے وصیت کرے نہ یہ کہ بدنیتی سے کسی کا حق تلف کرنے اور ذی حق کے محروم کرنے کے لئے۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی دیکھے کہ وصیت کرنے والا کسی کے حق میں ظلم اور زیادتی کرتا ہے تو اُس کو سمجھاوے اور اُس کی وصیت کو بااراد کو بدلوادے تاکہ حق تلفی نہ ہو، اور اُس بداخلاقی یا حق تلفی کے روکنے کا طریق بجز اس کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

منقول ہے کہ ایک دفعہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سعد بن مالک کی بیماری میں خبر پرسی کو تشریف لے گئے سعد بن مالک نے عرض کیا کہ میں اپنے کُل مال کی وصیت کردوں (یعنی سوائے اپنے قرابت مندوں کے اوروں کے لئے جیسا کہ حدیث کے مضمون سے پایا جاتا ہے) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ نصف مال کی وصیت کردوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک ثلث مال کی وصیت کردوں۔ آپ نے فرمایا کہ تہائی کی اور تہائی بھی بہت ہے۔ اگر تو اپنے وارثوں کو دولتمند چھوڑے تو اس سے بہتر ہے کہ اُن کو مفلس چھوڑے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر خیرات لیتے پھریں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عایشہ سے ایک شخص نے

ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے ہدایت واسطے لوگوں کے اور علانیہ نشانیاں ہدایت کی، اور حق و باطل کو جدا کرنے والا، پھر تم میں سے جو کوئی اُس مہینہ میں موجود ہو تو چاہیئے کہ اُس میں روزہ رکھے، اور جو کوئی کہ بیمار ہو یا سفر پر ہو تو شمار کر لے اور دنوں میں، اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا، اور تاکہ تم پورا کرو تعداد کو اور تاکہ اللہ کو اُس بات پر جس کی تم کو ہدایت کی ہے بزرگی سے یاد کرو، اور تاکہ تم شکر کرو (۱۸۱)	شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۱)

پوچھا کہ میں اپنے مال کی وصیت کر دینا چاہتا ہوں (یعنی سوائے اولاد کے) حضرت عایشہ نے پوچھا کہ تیرے پاس کتنا مال ہے اور کتنی اولاد ہے۔ اُس نے کہا کہ تین ہزار درم ہیں اور چار اولادیں۔ حضرت عایشہ نے فرمایا کہ یہ تو بہت مال نہیں ہے، بہتر ہے کہ اپنی اولاد کے لئے رہنے دے۔ اور روایتوں میں ہے کہ حضرت علی فرماتے تھے کہ میں پانچویں حصہ مال کی وصیت کرنے والے کو چوتھائی مال کی وصیت کرنے والے سے، اور چوتھائی مال کی وصیت کرنے والے کو تہائی مال کی وصیت کرنے والے سے زیادہ پسند کرتا ہوں، اور جس نے کہ تہائی مال کی وصیت کر دی اُس نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ حسن بصری نے چھٹے حصہ یا پانچویں یا چوتھے تک کی وصیت کو پسند کیا، اور اُس زمانہ کے لوگ اکثر پانچواں حصہ یا چوتھا حصہ وصیت کرتے تھے۔ یہ سب روایتیں اگر صحیح تسلیم ہوں تو بھی ان سے ناجوازی وصیت کی ثلث سے زائد کی نسبت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان روایتوں سے صرف صلاح اور فہمائش پائی جاتی ہے جس کی نسبت خود خدا نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اگر کوئی دیکھے کہ وصیت کرنے والا کسی کے حق میں ظلم اور زیادتی کرتا ہے تو اُس کو سمجھا دے۔ وصیت کو کسی قید سے مقید کرنے سے بد اخلاقی و ظلم کی بندش نہیں ہو سکتی جب کہ ہبہ کرنے میں کچھ قید اور بندش نہیں ہے۔ وصیت و ہبہ درحقیقت ایک شے ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ہبہ عطا بالفعل ہے اور وصیت عطا بعد الموت۔ حدیث ”لا وصیۃ لوارث“ کو تسلیم کرنے کے بعد بھی وارث کے حق میں وصیت کا بطلان تسلیم نہیں ہو سکتا، کیونکہ نفی ضرورت کی طرف منسوب ہوگی نہ نفس وصیت کے بطلان کی طرف۔ علاوہ اس کے حدیث سے نسخ حکم قرآن کسی طرح تسلیم نہیں ہو سکتا ❖

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ	اور جب تجھ سے میرے بندے میرے حال سے سوال کریں تو بیشک میں نزدیک ہوں، جواب دیتا ہوں ہر ایک پکارنے والے کی پکار کا جب وہ پکارتا ہے۔ پس چاہیئے کہ قبول کرو مجھ کو،

آیت وصیت کو آیت توریث سے یا حدیث سے منسوخ قرار دینا ایک ایسا امر ہے جس کو علماے متقدمین سے بھی اکابر علما نے تسلیم نہیں کیا۔ تفسیر کبیر (جلد ۱ صفحہ ۷۴۴) میں لکھا ہے کہ ابو مسلم اصفہانی کا یہ مذہب تھا کہ آیت وصیت آیت توریث سے منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ جو لوگ کہ اس کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں اُن کی بڑی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ اس حدیث کے رُو سے "الا لا وصیة لوارث" آیت وصیت منسوخ و مسترد ہو گئی ہے، اور پھر لکھا ہے کہ اس میں بڑی دقتیں ہیں، کیونکہ یہ حدیث خبر احاد ہے اور خبر احاد سے نسخ قرآن جائز نہیں۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگرچہ خبر احاد ہے لیکن ائمہ نے اُس کو تلقی بالقبول کیا ہے، اور اس لئے یہ حدیث حدیث متواتر سے مل گئی ہے مگر اس جواب پر کوئی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ یہ دعوے کہ ائمہ نے اُس کو تلقی بالقبول کیا ہے بطور ظن کے یا بطور یقین کے ہے۔ پہلی بات مسلّم ہے۔ لیکن اُن کا یہ اجماع خبر احاد کی بنا پر ہو گا اور جو اجماع کہ خبر احاد کی بنا پر ہو اُس سے نسخ قرآن جائز نہیں، اور دوسری بات ممکن نہیں کیونکہ اگر اُنہوں نے اس حدیث کو قطعی سمجھ کر اجماع کیا ہے باوجودیکہ وہ خبر احاد ہے، تو اُن کا اجماع خطا پر مبنی ہو گا جو نا جائز ہے۔ اور اگر یہ کہا جاوے کہ یہ آیت اجماع سے منسوخ ہو گئی ہے تو بھی اجماع سے قرآن کا منسوخ ہونا جائز نہیں ہے، کیونکہ اجماع اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی دلیل آیت کے منسوخ ہونے کی موجود ہے مگر اُنہوں نے اس دلیل کو تو بیان نہیں کیا اور اجماع ہی پر اکتفا کیا، تو وہ کیونکر ناسخ قرآن ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب ایسے لوگ بھی امت میں موجود ہیں جو اس نسخ کے منکر ہیں تو اجماع کا نسخ پر کیونکر دعوے ہو سکتا ہے۔ غرضکہ قرآن کے رُو سے پایا جاتا ہے کہ وصیت کا ہر شخص کو بلا کسی قید کے اختیار ہے اگر اُس نے ظلم اور حق تلفی کے ارادہ سے وصیت کی ہو گی تو اُس کا وبال اُس کی گردن پر ہو گا۔ مگر وصیت کے نافذ ہونے میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا۔ ہاں جن لوگوں نے وصیت نہیں کی یا وصیت سے زیادہ مال چھوڑا تو اُن کا مال مطابق حکم آیت توریث کے وارثوں پر تقسیم ہو گا ۔

(۱۷۹) (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ) اس آیت میں جو یہ حکم ہے کہ "تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح کہ تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا" اس کا مطلب قرار دینے کو چار باتوں کی تنقیح چاہیئے۔ اول یہ کہ اُن روزوں سے کون سے روزے مراد ہیں۔ دوسرے یہ کہ "تم سے پہلوں"

وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ،

اور چاہئے کہ ایمان لاویں مجھ پر تاکہ وہ راہ پاویں ﴿۱۸۷﴾ حلال کیا گیا تمہارے لئے روزہ کی رات کو اپنی بی بیوں سے اختلاط کرنا ، وہ زیبائش ہیں تمہارے لئے اور تم زیبائش ہو اُن کے لئے خدا نے جانا کہ تم اپنے لئے خیانت کرتے تھے، پھر معاف کیا تم کو اور درگذر کی تم سے، پھر اب ان سے مخالطت کرو، اور تابعداری کرو (اُس کی) جو لکھا ہے اللہ نے تمہارے لئے ،

سے کون لوگ مراد ہیں۔ تیسرے یہ کہ اُن پہلوں پر کون سے روزے لکھے گئے تھے۔ چوتھے یہ کہ ''جس طرح'' کے لفظ سے کس بات میں تشبیہ مراد ہے ❖

پہلی بات کی نسبت مفسرین میں اختلاف ہے۔ معاذ وقتادہ وعطا ، اور بموجب ایک روایت کے ابن عباس کے نزدیک یہ روزے ایام بیض کے اور روزہ عاشورہ کا تھا ، یعنی وہ تین روزے تھے جو ہر مہینے کی تیرھویں چودھویں پندرھویں کو رکھے جاتے تھے ، اور ایک روزہ وہ تھا جو دسویں محرّم کو رکھا جاتا تھا۔ اور اکثر محققین کے نزدیک جن میں ابن عباس اور حسن اور ابی مسلم بھی شامل ہیں۔ ان روزوں سے رمضان ہی کے روزے مراد ہیں ، اور اس صورت میں لفظ '' شھر رمضان'' جو اگلی آیت میں ہے وہ بدل واقع ہوگا لفظ '' صیام '' سے جو اس آیت میں ہے یعنی '' کتب علیکم الصیام صیام شھر رمضان'' ❖

جو لوگ کہتے ہیں کہ ان روزوں سے رمضان کے روزے مراد نہیں ہیں وہ یہ دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رمضان کے روزوں سے اور باقی روزوں کے رکھنے کا حکم منسوخ ہوگیا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رمضان کے سوا اور بھی روزے تھے ، اور اس مقام پر '' صیام '' سے وہی روزے مراد ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن روزوں کے ذکر کے بعد بھی مریض اور مسافر کی نسبت حکم بتایا ہے اور اگلی آیت میں جہاں خاص رمضان کے روزوں کا نام لیا ہے اس کے بعد بھی مریض اور مسافر کی نسبت حکم بتایا ہے۔ پس اگر یہ دونوں روزے ایک ہی ہوتے تو دوبارہ حکم بتانے کی کیا حاجت تھی۔ تیسرے یہ کہ ان روزوں کی نسبت اُن لوگوں کو بھی جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں خدا نے اختیار دیا تھا کہ چاہیں روزہ رکھیں اور چاہیں فدیہ دیں ، مگر رمضان کے روزوں کی نسبت یہ اختیار نہیں دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روزے رمضان کے سوا تھے ❖

اس رائے کی تائید اُن روایتوں سے بھی ہوتی ہے جو معالم التنزیل میں لکھی ہیں کہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے ہر مہینے میں تین روزے اور عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ نمودار ہو تم کو صبح کا سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور مت مخالطت کرو بیبیوں سے ایسی حالت میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو، یہ ہیں (مقرر کی ہوئیں) حدیں اللہ کی پھر اُن کے پاس مت جاؤ، اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے اپنی نشانیاں تاکہ وہ پرہیزگاری کریں ﴿۱۸۳﴾

اور سترہ مہینے تک قبل فرض ہونے روزہ رمضان کے، اسی طرح رکھے گئے۔ اور حضرت عایشہ سے ایک روایت لکھی ہے کہ آنحضرت نے مدینہ میں پہنچنے کے بعد عاشورہ کا روزہ رکھا، اور اور لوگوں کو بھی رکھنے کا حکم دیا، اور زمانۂ جاہلیت میں قریش اور آنحضرت بھی عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ چھوڑ دیا گیا۔ اور ابن عباس سے ایک روایت لکھی ہے کہ ہجرت کے بعد جو حکم اول منسوخ ہوئے وہ بیت المقدس کی طرف قبلہ ہونے اور روزہ رکھنے کے تھے۔ مگر یہ روایتیں ایسی ہیں جن کی صحت نہایت مشتبہ ہے *

جو لوگ اس رائے کے برخلاف ہیں، اور لفظ "صیام" سے جو اس مقام پر ہے رمضان ہی کے روزے مراد لیتے ہیں، وہ ان دلیلوں کا اس طرح پر جواب دیتے ہیں کہ اولاً خدا نے فرمایا کہ "تم پر روزے لکھے گئے"۔ یہ ایک مجمل حکم تھا جس سے نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک روزہ یا دو روزے یا کئی روزے۔ پھر اُس کے بعد فرمایا کہ "گنے ہوئے دنوں کے"۔ اس قول سے کچھ احتمال رفع ہوا۔ پھر فرمایا کہ "ماہ رمضان کے" جس سے ہر ایک بات متعین ہو گئی۔ پس اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ "صیام" اور "ایام معدودات" اور "شہر رمضان" تینوں کی ایک ہی مراد ہے، تو لفظ "صیام" سے سوا رمضان کے اور روزوں کے مراد لینے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، اور یہ جو دلیل ہے کہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ "انّ صوم رمضان نسخ کل صوم"۔ اس سے یہ متحقق نہیں ہوتا کہ جو روزے منسوخ ہوئے وہ اسلام میں فرض تھے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ روزے ہوں جو اور شریعتوں میں فرض تھے۔ اور اگر فرض کیا جاوے کہ وہ وہی روزے تھے جو اسلام میں فرض تھے تو یہ کیونکر متحقق ہوگا کہ وہ وہی روزے تھے جو اس آیت کی رُو سے فرض کئے گئے ہیں۔ اور یہ جو دلیل ہے کہ اگر یہ دونوں روزے ایک ہوتے تو بیمار اور مسافر کا حکم مکرر نہ بیان کیا جاتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں رمضان کے روزے رکھنے یا فدیہ دینے کا اختیار تھا۔ مگر یہ حکم

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِىَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَن تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَٰبِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۸۵﴾

اور مت کھاؤ اپنے آپس میں (ایک دوسرے کا) مال ناحق، اور مت ڈالو اُس کا جھگڑا حاکموں تک، تا کہ کھالو ایک ٹکڑا لوگوں کے مال کا ساتھ گناہ کے، حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۱۸۴﴾ پوچھتے ہیں تجھ سے نئے چاندوں (کے حال) سے، تو کہدے کہ یہ مقررہ وقت ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے، اور اس میں کچھ نیکی نہیں ہے کہ گھروں میں آؤ اُن کے پچھواڑے سے، و لیکن نیکی اُس شخص کے لئے ہے جو پرہیزگاری کرے اور آئے گھروں میں اُن کے دروازوں سے اور ڈرو اللہ سے تا کہ تم فلاح پاؤ ﴿۱۸۵﴾

منسوخ ہوگیا اور مسافر اور مریض کے لئے جو حکم تھا وہ بدستور باقی رہا۔ اِس شبہ کے رفع ہونے کے لئے کہ آیا بیمار و مسافر کے حق میں بھی وہ حکم منسوخ ہوگیا ہے یا نہیں اُس حکم کو مکرّر بیان کیا گیا۔ اور جب کہ فدیہ دینے کا حکم منسوخ ہوگیا تو یہ حجت کہ اُن روزوں میں فدیہ دینے کا اختیار تھا اور رمضان کے روزوں میں فدیہ دینے کا اختیار نہیں ہے اس لئے وہ روزے رمضان کے علاوہ تھے پیش نہیں ہوسکتی ✤

ان دونوں رایوں میں سے کوئی سی رائے تسلیم کی جائے اس کا نتیجہ کسی نہ کسی آیت کا منسوخ ماننا ہوگا، کیونکہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لفظ ،، رمضاں ،، سے رمضاں کے سوا اور روزے مراد تھے، تو اُن کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ جس آیت میں خاص رمضان کے روزوں کا ذکر ہے اُس سے پہلی آیت منسوخ ہوگئی اور جو لوگ کہتے ہیں کہ لفظ ،، صیام ،، سے رمضان ہی کے روزے مراد ہیں تو وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جس آیت میں روزے رکھنے یا فدیہ دینے کا حکم تھا وہ رمضان کے روزوں کی آیت سے جس میں یہ اختیار نہیں رہا منسوخ ہوگئی ہے ✤

اس طرح پر ناسخ و منسوخ ماننے میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ایسی آیتوں کو جو بالکل متصل اور سلسلہ وار ہیں کس طرح ایک دوسری کا ناسخ تسلیم کریں۔ اِس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تلاوت میں آیتوں کا متصل ہونا اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ وہ اسی طرح متصل نازل بھی ہوئی ہوں۔ بلکہ ایسا بھی ہے کہ منسوخ آیت نزول میں اول ہے اور ناسخ بعد، مگر تلاوت میں ناسخ مقدم ہوگئی ہے اور منسوخ بعد، وانا اقول فیہ نظر ✤

دوسری بات کی نسبت مفسرین نے ایک مبہم بات لکھدی ہے تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۸۶﴾	اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو تم سے لڑیں، اور زیادتی مت کرو، بیشک اللہ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو ﴿۱۸۶﴾

"من قبلکم" سے مراد "من الانبیاء والامم" ہے۔ اور تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے کہ "من قبلکم" یعنی "الانبیاء والامم من لدن آدم"۔ مگر یہ بیان محض ناکافی ہے، کیونکہ صاف بتانا چاہئے کہ "من قبلکم" سے کونسے نبی یا کونسی امت مراد ہے۔ اس واسطے کہ اس بات کا کچھ ثبوت نہیں ہے کہ حضرت آدم سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک کوئی نبی اور کوئی امت ایسی نہیں گذری جس پر روزہ فرض نہ ہؤا ہو۔ اس لئے اس اُمّت کا تعین کرنا ضرور ہے۔ مشرک قومیں جو روزے رکھتی تھیں، اُن کی نسبت تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ خدا نے اُن پر روزے فرض کئے تھے، کیونکہ اُن کے اکثر روزے غیر خدا کے لئے ہوتے تھے۔ قرآن مجید میں اکثر جگہ "من قبلکم" کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہؤا ہے، یعنی یہود اور نصاریٰ کی طرف، اور اس لئے "من قبلکم" سے اہل کتاب مراد لئے جاتے ہیں اور اُن کی نسبت خدا کی طرف سے کسی حکم کا مقرر ہونا صادق بھی آسکتا ہے ٭

تیسری بات کی نسبت مفسّرین نے یہود اور نصاریٰ کے روزوں کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہود اور نصاریٰ پر بھی خدا تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے تھے۔ نصاریٰ نے اُس مہینے کو بدل کر معین موسم میں روزوں کا رکھنا مقرر کیا، اور اس تبدیل کے معاوضے میں دس روزے بڑھا دئے۔ اُس کے بعد اُن کا کوئی بادشاہ بیمار ہؤا اور اُس کے اچھا ہونے کے لئے سات روزوں کی نذر مانی، جب وہ اچھا ہؤا تو سات روزے اور بڑھا دئے، سینتالیس ہوگئے پھر اُن میں ایک بادشاہ ہؤا اُس نے کہا کہ تین روزوں کے چھوڑنے سے کیا فائدہ ہے۔ اس لئے اُنھوں نے پورے پچاس کر لئے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ نصاریٰ احتیاطاً رمضان کے اول اور رمضان کے بعد بھی ایک ایک روزہ رکھتے تھے تاکہ رمضان کے مہینے میں کچھ نقصان نہ پڑے۔ ان کے بعد کے لوگ اسی طرح ایک ایک بڑھاتے گئے، یہاں تک کہ پچاس تک نوبت پہنچ گئی۔ اور بعضوں کا یہ قول ہے کہ وبا دشاہ نصاریٰ کے مرگئے تھے اس لئے اُنھوں نے رمضان سے پہلے دس روزے اور رمضان کے بعد دس روزے اور بڑھا لئے۔ ایک اور روایت بیان کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ نے رمضان کے روزے یہود اور نصاریٰ پر فرض کئے تھے۔ یہودیوں نے اُس کو چھوڑ دیا، اور بجائے اُن کے برس بھر میں صرف ایک روزہ اُس دن رکھنا اختیار کیا جس دن میں فرعون کا غرق ہونا وہ خیال کرتے تھے، اور اُس دن کے اختیار کرنے میں بھی اُنھوں نے غلطی کی کیونکہ فرعون دسویں محرم کو غرق ہؤا تھا۔ یہ تمام اقوال مفسّرین کے ایسے لغو اور بیہودہ ہیں جیسے کہ اُن کی

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸۷﴾	اور مار ڈالو اُن کو جہاں اُن کو پاؤ اور نکالو اُن کو اُس جگہ سے کہ اُنہوں نے تم کو نکالا ہے، اور (لوگوں کو) مصیبت (میں ڈالنا) زیادہ سخت ہے مار ڈالنے سے اور مت لڑو اُن سے مسجد حرام کے پاس جب تک وہ تم سے اُس میں نہ لڑیں، پھر اگر تم سے وہ لڑیں تو تم اُن کو مار ڈالو، اسی طرح ہے سزا کافروں کی ﴿۱۸۷﴾

اور باتیں متعلق قصص اور حکایات کے لغو اور بے بنیاد ہوتی ہیں، جن کی نہ کوئی سند ہوتی ہے اور نہ کوئی ثبوت ہوتا ہے۔ یہود اور نصاریٰ کے روزوں کے حالات جو اُن کی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں وہ حسب تفصیل ذیل ہیں +

کتاب خروج کے (جو توریت کی دوسری کتاب ہے) باب ۳۴ ورس ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کوہ سینا پر تھے تو چالیس دن اور چالیس رات وہاں رہے، اور نہ روٹی کھائی نہ پانی پیا۔ توریت کی کتاب استثنا باب ۹ ورس ۹ و ۱۸ و ۲۵ کی تفسیر (ہنری اسکاٹ) میں نہ روٹی کھانے اور نہ پانی پینے کی نسبت لکھا ہے کہ لوگوں کی معصیت کی وجہ سے موسیٰ نے دوسری دفعہ چالیس دن کا روزہ رکھا تھا۔ اور بعضوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت موسیٰ نے تین مرتبہ چالیس چالیس دن کا روزہ رکھا ہے +

کتاب لویان کے (جو توریت کی تیسری کتاب ہے) باب ۱۶ ورس ۲۹، اور باب ۲۳ ورس ۲۷ و ۲۹ سے پایا جاتا ہے کہ یہودیوں پر ساتویں مہینے کی دس تاریخ کو کفارہ کے روزے رکھنے کا حکم تھا، اور اُس میں لکھا ہے، کہ جو کوئی اُس دن روزہ نہ رکھیگا اپنی قوم سے منقطع ہو جائیگا اور اعمال حواریان باب ۲۷ ورس ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی بھی یہ روزے رکھا کرتے تھے +

انجیل لوقا باب ۱۸ ورس ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ فروسی ہفتہ میں دو دن روزہ رکھا کرتے تھے، ایک پانچویں دن جب کہ حضرت موسیٰ کوہ سینا پر چڑھے تھے اور ایک دوسرے دن جب کہ اُترے تھے +

کتاب زکریا باب ۸ ورس ۱۹ سے پایا جاتا ہے کہ یہودی چوتھے مہینے اور پانچویں مہینے اور دسویں مہینے میں بھی روزہ رکھتے تھے۔ چوتھے مہینے یعنی تموز میں سترھویں تاریخ کو بیت المقدس کی تباہی کے غم میں جو بخت نصر کے ہاتھ سے ہوئی تھی۔ پانچویں مہینے یعنی آب میں نویں تاریخ کو بیت المقدس کے شہر کے جلنے کے غم میں جس کو بنوزروان شاہ بابل کے افسر نے جلایا تھا۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸۹﴾	پھر اگر وہ باز رہیں تو بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ﴿۱۸۸﴾ اور لڑو اُن سے جب تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین ہو جاوے، پھر اگر وہ باز رہیں تو زیادتی کرنا نہیں چاہیئے مگر ظالموں پر ﴿۱۸۹﴾

ساتویں مہینے یعنی تشری کی دسویں تاریخ کو جدلیاہ کے قتل ہونے کے غم میں جو بمقام مصپاہ مارا گیا تھا۔ دسویں مہینے یعنی تبث کی دسویں تاریخ کو بیت المقدس کے غم میں جس روز بخت نصر نے بیت المقدس کا محاصرہ شروع کیا تھا ✤

کتاب اول ملوک باب ۲۱ ورس ۹ و کتاب دوم تواریخ ایام باب ۲۰ ورس ۳ میں ایک دن کا روزہ ہے جس کو ملکہ ایزبل نے اپنے شوہر احاب کی خاطر سے منادی کرا کے مقرر کرایا تھا ✤

کتاب قضاۃ باب ۲۰ ورس ۲۶ سے ایک اور روزہ مقرر ہونا پایا جاتا ہے، جب کہ بنی اسرائیل نے قوم بنیامین سے شکست پائی تھی اور بیت المقدس میں آن کر فتح کے لئے دُعا مانگی تھی ✤

کتاب اول شموئیل باب ۳۱ ورس ۱۳ سے پایا جاتا ہے کہ شاؤل یعنی طالوت کے مرنے کے غم میں سات روزے مقرر ہوئے تھے، جو اُس کی ہڈیوں کے دفن کرنے کے بعد رکھے گئے تھے ✤

کتاب یوناہ باب ۳ ورس ۵ میں ایک اور روزہ مقرر ہونا پایا جاتا ہے جب کہ نینوہ کے لوگ ایمان لائے تھے ✤

کتاب دانیال باب ۱۰ ورس ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دانیال نے تین ہفتہ تک روزے رکھے تھے ✤

کتاب اول ملوک باب ۱۹ ورس ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت الیاس کوہ حوریب کو گئے تھے تو اُنھوں نے چالیس دن اور رات روزے رکھے تھے ✤

علاوہ ان کے اور روزے بھی مثلاً خدا تعالیٰ کی خفگی دور کرنے کے لئے، یا اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، یا کسی بلا یا مصیبت کو ٹالنے کے لئے، یا کسی ذاتی یا خاندانی امور کے متعلق جس طرح منت وغیرہ کے ایفا میں ہوتا ہے روزے رکھا کرتے تھے ✤

انجیل متی باب ۴ ورس ۱-۱۱ و انجیل لوقا باب ۴ ورس ۱-۱۳ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسےٰ نے بھی جب کہ وہ بیابان میں تھے چالیس دن اور رات روزے رکھے تھے ✤

علاوہ اس کے انجیل متی کے باب ۲۷ ورس ۱۲ سے جس میں یہ لکھا ہے کہ،، بھرنہج اس قسم کا

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

حرمت والا مہینا بدلے حرمت والے مہینے کے، اور حرمتوں کا ایک دوسرے سے بدلا ہوتا ہے، پھر جس نے زیادتی کی تم پر تم زیادتی کرو تم اُس پر جس طرح کہ اُس نے تم پر زیادتی کی، اور ڈرو اللہ سے، اور جان لو کہ بیشک اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹﴾

شیطان بجز نماز اور روزے کے نہیں جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کے زمانہ میں روزہ بعض امور خاص میں اثر بد کے دفع کرنے کا ایک ذریعہ خیال کیا جاتا تھا ❖

انجیل متی باب ۹ ورس ۱۴ کے مضمون سے عیسائی خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ نے روزوں کا رکھنا موقوف کر دیا، مگر اسی کے ساتھ اُس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بعد حضرت عیسےٰ کے رکھتے ہونگے ❖

ان تمام حالات پر جو اوپر بیان ہوئے غور کرنے سے اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ یہودیوں پر ایک روزہ جو ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو رکھا جاتا تھا، اور جو کفارہ کا روزہ کہلاتا تھا بلاشبہ فرض تھا، اور چونکہ عیسائی بھی یہودی شریعت کے تابع ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ روزہ اُن پر بھی فرض تھا۔ چالیس دن کے روزے جو حضرت موسےٰ نے کوہ سینا پر اور حضرت عیسےٰ نے بیابان میں رکھے ممکن ہے کہ فرض ہوں مگر توریت یا انجیل میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے فرضیت اُن روزوں کی ثابت کی جا سکے۔ علاوہ اس کے جس قدر روزوں کا بیان ہے وہ سب روزے کیا یہودی مذہب میں اور کیا عیسائی مذہب میں فرض روزے نہیں معلوم ہوتے، بلکہ بطور نفل روح کے تزکیہ اور عبادت کے ثواب حاصل کرنے کے لئے معلوم ہوتے ہیں ❖

چوتھی بات کی نسبت بھی مفسروں میں اختلاف ہے۔ جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ لفظ "کما" کی تشبیہ سے روزوں کے عدد میں مشابہت مراد تھی اُن کی رائے کی غلطی تو صریح ظاہر ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ پر نہ ایام بیض کے روزوں کا فرض ہونا پایا جاتا ہے، نہ رمضان کے تیس یا انتیس دن کا۔ اور جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اس تشبیہ سے روزے کی مدت میں مشابہت مراد ہے یعنی جس وقت سے جس وقت تک یہودی روزہ رکھتے تھے اُسی وقت سے اُسی وقت تک مسلمانوں پر بھی روزہ فرض ہوا ہے، یہ رائے بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہودی دن کے ختم ہونے کے بعد روزہ کھول کر کچھ کھا پی لیتے تھے، اور پھر اُسی وقت اُن کا روزہ شروع ہو جاتا تھا، اور اسی وجہ سے توریت اور انجیل میں دن رات کا روزہ رکھنا بیان ہوتا ہے، کیونکہ رات بھی روزہ میں داخل تھی۔ مسلمان بھی ان باتوں میں جن کی نسبت کوئی خاص حکم نہیں ہوتا تھا اکثر یہودیوں کی پیروی کرتے

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۹۱) وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور مت ڈالو (اپنے تئیں) اپنے ہاتھوں سے تہلکہ میں اور احسان کرو بیشک اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو (۱۹۱) اور پورا کرو حج کو اور عمرہ کو اللہ کے لئے، پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے (وہ کرلو) اور اپنے سروں کو مت منڈاؤ جب تک کہ پہنچے قربانی اپنی جگہ،

تھے، اور اس لئے وہ بھی یہودیوں کی طرح روزہ رکھتے تھے۔ لیکن کوئی خاص حکم اس طرح پر روزہ رکھنے کا مسلمانوں کے لئے نہ تھا۔ ،،کما،، کے لفظ کے ساتھ جو اس آیت میں ہے کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ مشابہت روزہ کی مدت میں تھی۔ اس آیت میں صرف اس قدر بیان ہوا ہے کہ جس طرح تم سے اگلوں پر روزے مقرر کئے گئے تھے اُسی طرح تم پر بھی مقرر کئے گئے ہیں، اور اس تشبیہ سے مدت میں مشابہت قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ صرف نفس فرضیت میں تشبیہ مراد ہے چنانچہ تفسیر کبیر میں زجاج کا قول لکھا ہے کہ ،،موضع کما نصب علی المصدر لان المعنی فرض علیکم فرضاً کالذی فرض علی الذین من قبلکم،، اور ابو علی کا قول لکھا ہے کہ ،،ھو صفة لمصدر محذوف تقدیرہ کتابة کما کتب علیھم فحذف المصدر واقیم نعتہ مقامہ،، مگر جب کہ یہ بات اب تک ثابت نہیں ہوئی کہ درحقیقت خدا کی طرف سے یہودیوں اور عیسائیوں پر روزے فرض تھے تو ،،کما،، کے لفظ سے نفس فرضیت میں تشبیہ کیونکر تسلیم کیجائے +

ان چاروں مباحثوں کی نسبت جو میری سمجھ ہے وہ یہ ہے کہ (۱) اُن روزوں سے جو کتب علیکم الصیام کی آیت میں ہیں رمضان ہی کے روزے مراد ہیں۔ (۲) ،،من قبلکم،، سے اہل کتاب مراد ہیں۔ (۳) اس آیت میں اس بات کی کہ اہل کتاب پر کوئی روزے فرض تھے یا نہ تھے کچھ علاقہ نہیں ہے (۴) ،،کما،، کے لفظ سے نہ عدد میں تشبیہ مراد ہے، نہ مدت میں اور نہ نفس فرضیت میں بلکہ صرف سبب صیام میں تشبیہ مراد ہے زمانہ نزول وحی میں حضرت موسےٰ نے چالیس دن پہاڑ میں اور حضرت عیسیٰ نے چالیس دن بیابان میں بسر کئے۔ توریت اور انجیل دونوں سے پایا جاتا ہے کہ اُن دنوں میں وہ روزہ دار تھے۔ بعد کو اُن کی امت نے اُن کی متابعت کے خیال سے اُن دنوں میں ہر سال روزے رکھنے اختیار کئے تھے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کو جو نزول وحی کا مہینہ تھا کوہ حرا میں بسر کیا اور آپ بھی اُس زمانہ میں روزہ دار تھے پس خدا نے فرمایا کہ جس طرح یہودیوں اور عیسائیوں [illegible] کے اُس ماہ میں روزے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۲﴾

پھر تم میں سے جو شخص کہ بیمار ہو یا اُس کے سر میں کچھ دُکھ ہو تو اُس کا بدلا ہے روزہ یا صدقہ یا قربانی کے ساتھ پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص فائدہ اُٹھاوے عمرہ کے ساتھ حج کا تو جو کچھ میسّر ہو قربانی سے (وہ کرے) پھر جو شخص کہ نہ پاوے تو تین روزے حج کے دِنوں میں ہیں اور سات جب کہ تم پھرو، یہ پورے دس ہوئے یہ اُس کے لئے ہے جس کے اہل (وعیال) مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں، اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے ﴿۱۹۲﴾

اختیار کئے تھے اُسی طرح تم بھی اختیار کر لیں جو سبب کہ اہل کتاب کے روزے اختیار کرنے کا تھا وہی سبب مسلمانوں پر روزوں کے مقرر ہونے کا ہے، اور "کما" کے لفظ سے اُسی سبب صیام میں تشبیہ دی گئی ہے ❊

مگر میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ ان آیتوں میں سے کوئی آیت منسوخ ہے، یہ کہنا کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ روزے رمضان کے سوا تھے اور پھر یہ تسلیم کرنا کہ اُس کے بعد کی آیت نے جس میں رمضان کے روزوں کا ذکر ہے پہلی آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ اس بات کو تسلیم کر کے کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں مگر پچھلی آیت سے جو اختیار کہ روزہ رکھنے یا فدیہ دینے میں تھا منسوخ ہو گیا ہے تسلیم کرنا مشکل ہے پچھلی آیت میں جس کو ناسخ قرار دیا جاتا ہے کوئی اشارہ کسی قسم کا پہلی آیت کے حکم کے منسوخ ہونے کا نہیں ہے، صرف قیاساً یہ بات قرار دی جاتی ہے کہ پہلی آیت کے روزے رمضان کے روزوں سے علحدہ تھے جن کی نسبت قرآن میں بیان ہے کہ وہ کے تھے اور کو سے تھے، اور اس قیاس کے قرار دینے کے بعد کہا جاتا ہے کہ رمضان کے روزوں کی آیت نے اُس حکم کو منسوخ کر دیا جس میں کچھ بھی اشارہ منسوخ کرنے کا نہیں ہے۔ حدیث پر جو استدلال کیا گیا ہے اول تو اُس کی صحت میں کلام ہے پھر اس بات میں کلام ہے کہ حدیث اور خصوصاً خبر احاد سے قرآن کا حکم منسوخ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ قیاساً یہ بات قرار دی جاتی ہے کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ وہی رمضان کے روزے ہیں جن کا پچھلی آیت میں ذکر ہے اور پھر بغیر کسی اشارہ کے کہا جاتا ہے کہ جو اختیار کہ روزہ رکھنے یا فدیہ دینے میں تھا وہ پچھلی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ اگر قرآن میں اس طرح پر ناسخ و منسوخ کو تسلیم کیا جاوے تو اُس کے احکام کا منسوخ ہونا اور قائم رہنا صرف لوگوں کے قیاس پر منحصر ہوتا ہے جو کسی طرح تسلیم کے لائق نہیں ❊

فدیہ دینے کی آیت میں جو حکم ہے وہ منسوخ نہیں ہوا، اور وہ آیت یہ ہے، "وعلی الذین یطیقونه

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۳﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۴﴾

حج کے لئے مہینے معلوم ہیں پس جس شخص نے کہ اُن مہینوں میں اپنے پر حج فرض کیا تو حج میں نہ عورتوں سے مخالطت کرنی چاہئے اور نہ بدکاری اور نہ لڑائی اور جو کچھ تم نیکی کرتے ہو اُس کو اللہ جانتا ہے اور توشہ لو پھر بیشک اچھا توشہ پرہیزگاری ہے اور مجھ سے ڈرو اے عقل والو ﴿۱۹۳﴾ تم پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ (موسم حج میں) تلاش کرو فضل (یعنی روزی) اپنے پروردگار سے پھر جب کہ تم پھرو عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (یعنی مسجد حرام) کے پاس اور اللہ کا ذکر کرو جس جس طرح کہ تم کو ہدایت کی ہے اور اگرچہ اُس سے پہلے البتہ تم گمراہوں میں سے تھے ﴿۱۹۴﴾

فدیہ طعام مسکین فمن تطوع خیرا فھو خیر لہ وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون"۔

اِس آیت میں جو لفظ "یطیقون" کا ہے اُس کی اور بھی قراتیں مثلاً "یُطَوِّقُوْنَہٗ" یے کے پیش اور واؤ کے تشدید سے، یا یے کے زبر اور طا اور واؤ دونوں کی تشدید سے، جس کے معنی کسی کام کے تکلیف اُٹھا کر ہونے کے ہیں، اگرچہ مشہور قرات ہے ہم اُسی کو اختیار کرتے ہیں بعض علمائے مفسرین کی یہ رائے ہے کہ فدیہ کا حکم بھی مسافر اور مریض سے متعلق رکھتا ہے کیونکہ بعض مریض اور مسافر ایسے ہوتے ہیں جو مطلق روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ پہلی قسم کے مسافر اور بیمار کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اور دنوں میں روزہ رکھ لیں، اور دوسری قسم کے مسافر اور بیمار کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ چاہیں روزہ رکھیں اور چاہیں فدیہ دیدیں۔ مگر یہ معنی صحیح نہیں ہو سکتے، کیونکہ "عَلَى الَّذِيْنَ" سے بتخصیص بیمار اور مسافر مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور جو رعایت اول قسم کے بیمار اور مسافر کی ہونی چاہئے تھی وہ دوسری قسم کے بیمار اور مسافر کی ہوتی ہے۔

بعض علما کا یہ قول ہے (تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۵۰) کہ "یطیقون" معنی بھی مشکل اور تکلیف سے کسی کام کے انجام ہونے کے ہیں۔ دو لفظ ہیں ایک "وسع" اور ایک "طاقت"۔ "وسع" اُس شخص کی نسبت بولا جاتا ہے جو کسی کام کرنے پر آسانی سے اور بغیر تکلیف کے قادر ہو۔ اور "طاقت" اُس شخص کی نسبت بولا جاتا ہے جو کسی کام کرنے پر مشکل سے تکلیف اُٹھا کر قادر ہو، اور شاذ فرائین خطا کر کے اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں پس "یطیقونہ" کے معنی "یستصعبونہ" کے ہونگے۔ جو لوگ کہ روزہ رکھنے کی نہایت تکلیف اور سختی اُٹھا کر طاقت رکھتے ہیں ان کو اجازت ہے کہ روزہ رکھنے کے بدلے فدیہ دیدیں۔ پس

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۹۵﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۱۹۶﴾

پھر پھرو جہاں سے لوگ پھرتے ہیں اور اللہ سے بخشش چاہو بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ﴿۱۹۵﴾ پھر جب تم پورے کر چکو اپنے ارکان حج، پھر یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ یاد کرتے ہو تم اپنے باپ دادا کو یا اُس سے زیادہ یاد کرنا، پھر لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دے دنیا میں، اور نہیں ہے اُس کو آخرت میں کچھ حصہ ﴿۱۹۶﴾

یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور اپنے حکم پر بحال ہے ⁂

بعض علمائے مفسرین نے بھی جیسا کہ تفسیر کبیر میں مندرج ہے اس بات کو تسلیم کیا ہے، مگر یہ بحث یں کی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو نہایت تکلیف اور سختی اُٹھا کر روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ سدی کا قول ہے کہ وہ لوگ وہ ہیں جو بہت بڈھے ہو گئے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ اپنے مرنے سے پہلے روزہ نہیں رکھتے تھے اُن کو روزہ رکھنے میں سختی اور دشواری معلوم ہوتی تھی، اور ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتے تھے۔

مگر میں نہیں سمجھتا کہ بڈھے آدمی کی کیوں قید لگائی ہے۔ قرآن مجید میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے ,,الذین" سے صرف بڈھا ہی آدمی مخصوص کیا جائے۔ تمام انسان بڈھے ہوں یا جوان اُن کی حالت باعتبار خلقت اور موسم اور ملک کے مختلف ہوتی ہے۔ بہت سے جوان آدمی بلحاظ اپنی خلقت کے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو روزہ میں نہایت تکلیف و مشقت ہوتی ہے۔ اور بعضے بڈھے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو روزہ معلوم بھی نہیں ہوتا، پھر موسم کے اختلاف کے سبب سے بہت اختلاف پڑ جاتا ہے۔ وہی لوگ جو ایک موسم میں نہایت آسانی سے روزہ رکھ سکتے ہیں دوسرے موسم میں روزہ رکھنے میں نہایت سختی اور تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ ایک ملک کے لوگ جب کہ دن ایک معتدل مقدار کا ہوتا ہے آسانی سے روزہ رکھیں گے اور وہی لوگ جب کہ دن بڑا ہوتا ہے نہایت تکلیف و سختی روزہ رکھنے میں اُٹھاتے ہیں بلکہ بعض ملکوں میں کبھی دن اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ انسان کی طاقت سے روزہ رکھنا خارج ہوتا ہے۔ جیسے کہ عرض تسعین میں جہاں چھ مہینے کا دن ہوتا ہے، اور عرض ستین میں جہاں بعض موسموں میں غروب اور طلوع میں اس قدر فاصلہ ہوتا ہے جس کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ رات ہوتی ہی نہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے ان تمام حالات کے لحاظ سے جو اُس کے علم میں تھے نہایت عمدہ ترتیب سے جو فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے یہ حکم دیا ہے کہ ,,وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین"۔ پھر اس کو شخص دون شخص سے مقید کرنا ایک غلطی اور زیادتی علی الکتاب ہے ⁂

پہلی آیتوں میں جہاں بیمار اور مسافر کا اور اُن لوگوں کا جو بدشواری روزہ برداشت کر سکتے ہیں حکم ہے اُن تو کا علانیہ یہ منشا تھا کہ مریض اور مسافر کو روزے کا نہ رکھنا بہتر ہے۔ مگر اُن لوگوں کی نسبت جو بدشواری روزہ رکھ سکتے تھے یہ منشا تھا کہ اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے، جیسا کہ ان لفظوں سے کہ ,,وان تصوموا خیر لکم" پایا جاتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۷)	اور اُن میں سے کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دے دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی، اور بچا ہم کو آگ کے عذاب سے (۱۹۷)

اسی شان سے پچھلی آیتوں میں جن میں روزوں کو رمضان کے ساتھ مخصوص کیا ہے مریض اور مسافر کا مکرر ذکر کیا، اور اُن لوگوں کا جو بدشواری روزہ برداشت کر سکتے تھے ذکر چھوڑ دیا ہے، کیونکہ اُن کے حق میں فدیہ دینے سے روزہ رکھنا بہتر تھا۔

ان تمام بحثوں کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ پہلی آیت میں جن روزوں کا ذکر ہے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں اور کوئی حکم اور کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اور تمام آیتوں پر لحاظ کرنے کے بعد روزوں کی نسبت مفصلہ ذیل حکم پائے جاتے ہیں۔

۱۔ روزے رمضان کے ہر مسلمان پر لکھے گئے ہیں جس کو شرعی اصطلاح میں فرض کہتے ہیں۔

۲۔ روزوں کے رکھنے سے یہ فرض ادا ہوتا ہے۔

۳۔ اگر رمضان کے مہینے میں کوئی شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اُس کو روزہ رکھنا نہیں چاہیئے اور دنوں میں جب کہ وہ تندرست ہو اور سفر ختم ہو جاوے تو اُس کے بدلے روزے رکھ دے۔

۴۔ جن لوگوں کو روزہ رکھنے میں نہایت سختی اور تکلیف ہوتی ہے وہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں اُن کو اجازت ہے کہ روزوں کے بدلے فدیہ دیں۔ مگر اُن کے حق میں فدیہ دینے سے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

جو لوگ کہ روزہ پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ انسان کی تکلیف کا باعث ہے اور صحت جسمانی کا نہایت مضر ہے اور بعض ملکوں میں اُس کا ادا کرنا غیر ممکن ہے، اُن کو تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس ترتیب اور خوبی سے خدا نے روزوں کا حکم دیا وہ نہ تکلیف کا باعث ہے، اور نہ صحت جسمانی کو مضر ہے، اور نہ خلاف فطرت انسانی ہے، اور نہ کسی ملک کے رہنے والوں کے خلاف طاقت ہے۔ مگر ایک بحث البتہ باقی ہے کہ آیا وہ فی نفسہ عبادت بھی ہے یا نہیں، اور اگر عبادت ہے تو کیوں؟ چنانچہ اس بحث کو ہم شروع کرتے ہیں۔

جس قدر کثرت سے ہنود اور متقدمین عیسائی روزے رکھتے تھے اُس سے ظاہر ہے کہ اُن کا خیال روزہ رکھنے میں بجز تکلیف نفس اور خدا کی رضامندی اور خدا کی عبادت کا تھا۔ ابتدائے زمانہ میں جبکہ انسان نے شائستگی کی طرف میلان شروع کیا تھا تمام لوگوں کو یہ خیال تھا کہ خدا اپنی مخلوق سے نہایت راضی ہوتا ہے اگر مخلوق قصداً اپنے بدن کو اپنی روح کو خدا کی خوشنودی کی نیت سے تکلیف و مصیبت میں ڈالے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قوموں نے تکالیف شاقہ اپنے پر گوارا کی ہیں۔ کسی نے ایک غار میں اپنی تمام زندگی بسر کر دی۔ جب ہم ہندو جوگیوں اور قدیم عیسائی فقیروں کے رہنے کے غار اور پہاڑوں کی تنگ و تاریک کھوئیں دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے، اور مذہبی خیالات کا جو غلبہ انسان پر ہوتا ہے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے، اور دیکھا جاتا ہے کہ اُنہی خیالات کے سبب سے انسان نے کس قدر تکلیفیں اپنے پر گوارا کی ہیں۔ کوئی اپنا ہاتھ اونچا کر کے سکھا دیتا ہے، کوئی بیٹھنا اور لیٹنا چھوڑ دیتا ہے اور تمام عمر کھڑے رہ کر گذار دیتا ہے۔ کوئی لذیذ غذا چھوڑ دیتا ہے، اور تمام عمر صرف نہایت حقیر اور کثیف غذا پر زندگی

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۸﴾ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۱۹۹﴾

یہی لوگ ہیں کہ اُن کے لئے حصہ ہے اُس میں سے جو اُنہوں نے کمایا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۹۸﴾ اور یاد کرو اللہ کو گنے ہوئے دنوں میں (یعنی ایام تشریق میں جو پانچ دن ہیں ۹ سے ۱۳ تک) پھر جس شخص نے کہ جلدی کی (کوچ کرنے میں) دو دن میں تو اُس پر کچھ گناہ نہیں، اور جس نے کہ تاخیر کی (کوچ کرنے میں) تو اُس پر بھی کچھ گناہ نہیں اُس شخص کے لئے جو پرہیزگاری کرتا ہے، اور ڈرو اللہ سے، اور جان لو کہ بیشک تم اُس کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے ﴿۱۹۹﴾

بسر کرتا ہے۔ کوئی بلنگ پر سونا اور شادی کرنا چھوڑ دیتا ہے، جس کی بہت سی مثالیں اب بھی ہم کو ہزاروں عیسائی مانک اور نن میں دکھائی دیتی ہیں۔ غرضکہ تمام جسمانی ریاضتوں کا اسی غلط خیال پر رواج ہوا ہے۔ اسی خیال سے جان کی قربانی مروّج ہوئی، اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ انسان نے اپنی جان کی اور اپنی اولاد کی جان کی گناہ سے روح کو پاک کرنے کے خیال سے قربانی کی۔ یہ ایک عجب خیال تھا کہ خدا یا دیوتا انسان کی زندگی کو آسائش سے بسر کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمام یونانی اور رومی مذہبی افسانوں سے یہ خیال مترشح ہوتا ہے کہ دیوتا یا خدا انسان کے عیش کو روا نہیں رکھتا ✦

ابتدا میں جب کہ انسان کی غذا صرف زمین کی قدرتی پیداوار اور جنگل کے جانوروں کے شکار پر منحصر تھی کبھی کبھی فاقہ گذر جانا لازمی امر ہوگا۔ نیم وحشی انسانوں کو غذا سے زیادہ کوئی چیز حظ دینے والی نہ ہوگی۔ جب انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دیوتا یا خدا انسان کی جسمانی تکلیف سے راضی ہوتا ہے تو اُس وقت روزے نے مذہبی امر ہونے کا درجہ پایا ہوگا۔ توریت میں جہاں روزہ رکھنے کا حکم ہے وہاں بھی حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ "اپنی روحوں کو مبتلا کرو" عبری زبان کے قدیمی محاورہ کے موافق روح کے مبتلا کرنے سے روزہ رکھنا مراد ہوتا ہے پس کچھ شبہ نہیں ہے کہ روزہ رکھنا اُسی خیال سے کہ خدا ریاضت بدنی سے راضی ہوتا ہے۔ مذہبی امر قرار پایا ہے ✦

محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس خیال کو کہ خدا انسان کی ریاضت بدنی یعنی جسم اور روح کو تکلیف میں ڈالنے سے راضی ہوتا ہے متعدد طرح سے باطل کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ رہبانیت اسلام میں نہیں ہے۔ اس لئے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس خیال پر رمضان کے روزوں کا حکم دیا ہو۔ مگر انبیا کا کام صرف سمجھدار ہی لوگوں پر منحصر نہیں ہے، بلکہ اُن کو تمام لوگوں سے کام پڑتا ہے اور عام لوگوں کو ایسے امور کی نسبت جس سے اُن کو خدا کے رضامند کرنے کا خیال پیدا ہو زیادہ خیال ہوتا ہے۔ عرب کے لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کو دیکھتے

ـله تارک الدنیا - راہب ✦ ـله تارکۃ الدنیا - راہبہ ✦ احمد ۱۱

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۰﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۱﴾

اور لوگوں میں سے وہ شخص ہے کہ اُس کی بات تجھ کو دنیا کی زندگی کے تعجب میں ڈالتی ہے، اور اللہ کو گواہ لاتا ہے اُس چیز پر جو اُس کے دل میں ہے حالانکہ وہ بہت جھگڑالو ہے ﴿۲۰۰﴾ اور جب پیٹھ موڑتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے تاکہ اُس میں فساد کرے اور ضائع کرے کھیتی کو اور مویشی کو، اور اللہ نہیں دوست رکھتا فساد کو ﴿۲۰۱﴾

تھے کہ خدا کے خوش کرنے کے خیال سے اور اپنے پیغمبر کی پیروی کی نظر سے روزہ رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اُس رسم کے جاری رکھنے کی ایک عمدہ اور آسان اور غیر مخالف فطرت انسانی کے طریقہ میں اجازت دی، چنانچہ الفاظ "كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" صاف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اِس رسم کے موجد نہ تھے، بلکہ اس رسم کو صرف بدستور قائم رہنے دیا تھا۔ باایں ہمہ اُس رسم کی سختی کو نہایت عمدگی سے نرم اور قابل برداشت کر دیا، کہ بیماروں اور مسافروں کو اور دنوں میں اور جو لوگ روزے سے زیادہ تکلیف اُٹھاتے ہیں روزہ رکھنے اور فدیہ دینے میں مجاز کر دیا ❊

باوجود ان سب باتوں کے جب کہ روزہ حد اعتدال سے نہ گذر جاوے، اور وبال جان نہ ہو جاوے اور انسان پر صعوبت نہ ڈالے، جس کا اشارہ "يُطِيْقُوْنَهٗ" کے لفظ میں ہے، تو بلاشبہ تزکیۂ نفس اور روح میں نیکی اور صلاحیت پیدا ہونے کا ذریعہ ہے۔ کم کھانا بلاشبہ انسان کے دل اور دماغ کو زیادہ صحیح اور درست رکھتا ہے، اور انسان کے دل کو خدا کی طرف زیادہ تر متوجہ کرتا ہے، اور جو عبادت خدا کی غیر روزہ کی حالت میں کی جاتی ہے روزہ کی حالت میں زیادہ تر دلی توجہ سے ہوتی ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ انسان کو اپنے تئیں تکلیف میں ڈالنا خدا کو پسند آتا ہے۔ بلکہ یہ سبب ہے کہ انسان میں یہ ایک فطرتی امر ہے کہ جب کسی خاص امر کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے تو اُس کو غذا کی طرف کم رغبت یا کم توجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح قلیل غذا انسان کو اُس طرف جس پر وہ توجہ کرنی چاہتا ہے زیادہ تر متوجہ کر دیتی ہے یہی باعث ہے کہ روزہ کی حالت میں خدا کی عبادت غیر روزہ کی حالت کی بہ نسبت زیادہ تر توجہ اور خلوص سے ہوتی ہے۔ اسی سبب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے کی رسم کو ایک نہایت اعتدال سے جاری رہنے دیا ❊

حضرت موسےٰ نے کوہ سینا پر، یا حضرت عیسےٰ نے بیابان میں، یا محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے کوہ حرا میں، جب کہ زمانہ نزول وحی قریب تر تھا روزے رکھنے اختیار کیے، یا غذا سے پرہیز کیا، یا

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۲۰۲﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۰۴﴾

اور جب کہ اُس سے کہا جاوے کہ ڈر خدا سے تو اُس کو پکڑ لیتا ہے تکبر گناہ پر، پھر کافی ہے اُس کو جہنم، اور البتہ وہ بُری جگہ ہے ﴿۲۰۲﴾ اور بعض آدمی وہ ہیں جو بیچتے ہیں اپنے آپ کو خدا کی رضامندیوں کی طلب میں، اور اللہ بندوں پر مہربان ہے ﴿۲۰۳﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو داخل ہو اسلام میں سب کے سب، اور مت پیروی کرو شیطان کے قدموں کی، بیشک وہ تمہارا دشمن ہے علانیہ ﴿۲۰۴﴾

معمولی غذا میں کمی کی، اُس کا یہی سبب تھا۔ بس جب کہ روزہ ایسی حالت میں کہ اُس کا رکھنا شاق نہ ہو۔ تزکیۂ نفس اور روحانی نیکی کا ذریعہ ہے، تو اُس رسم کا نہایت اعتدال کے ساتھ قائم رکھنا جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم رکھی، فطرت انسانی کے بالکل مطابق و موافق ہے ✦

﴿۱۸۳﴾ (اُحِلَّ لَكُمۡ) یہودی اور عیسائی دن رات کا روزہ رکھا کرتے تھے یعنی روزہ فطار کرنے کے بعد ہی سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ توریت او رانجیل میں جہاں روزہ کا ذکر ہے دن رات کا روزہ بیان ہؤا ہے۔ رمضان کے روزوں کا جب حکم ہؤا تو کوئی حد روزے کی مقرر نہ تھی مسلمان بھی یہودیوں کی دیکھا دیکھی دن رات کا روزہ رکھتے تھے جو ان پر نہایت شاق گذرتا تھا۔ اور جس منشاء سے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو قائم رکھا تھا اس کے بھی مخالف تھا۔ اس لئے اس آیت میں خدا کی طرف سے یہ حکم ہؤا کہ صرف دن ہی کا روزہ رکھنا چاہیئے رات جو آرام کے لئے ہے وہ روزہ میں داخل نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ سمجھنا کہ پہلے مسلمانوں کو بھی دن رات کے روزہ رکھنے کا حکم تھا اور وہ حکم اِس آیت سے منسوخ ہو گیا محض غلطی ہے ✦

﴿۱۸۶﴾ (وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ) اِس آیت میں اور جو آیتیں کہ اس کے بعد ہیں اُن میں کافروں یا دشمنوں سے لڑنے کا حکم ہے۔ مگر صاف بیان کیا گیا ہے کہ جو تم سے لڑیں اُن سے لڑو اور زیادتی مت کرو ✦

اکثر لوگ مذہب اسلام پر یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اُس میں تحمل اور بردباری اور عاجزی اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں کی طرف سے پہنچیں اُن کی صبر سے برداشت نہیں ہے۔ اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق اور خدا کی راہ میں تکالیف برداشت کرنے کے برخلاف ہیں ✦

مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید میں جو احکام لڑائی کے نہایت

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٠٥﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢٠٦﴾

پھر اگر تم ڈگمگا جاؤ بعد اس کے کہ تمہارے پاس آئی ہیں نشانیاں تو جان لو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ﴿٢٠٥﴾ کیا وہ (کسی اور بات کا) انتظار کرتے ہیں بجز اس کے کہ آوے اُن کے لئے اللہ سفید بادلوں کے سایوں میں اور فرشتے، اور پورا کر دیا جاوے کام، اور اللہ ہی کی طرف سب کام رجوع کرتے ہیں ﴿٢٠٦﴾

نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُن کو مسلمانوں نے جو خلیفوں یا بادشاہوں کے نام سے مشہور ہوئے دینداری کے بہانے سے اپنی خواہشِ نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بداخلاقی اور ناانصافی سے برتا، اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے، اور علمائے اسلام نے اُن کی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کئے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے۔ مگر اُن کے ایسا کرنے سے جو بُرائی یا عیب قرار دیا جاوے وہ انہی پر محدود ہے جنہوں نے ایسا کیا نہ اسلام پر۔ ہر ایک منصف مزاج کا اور ہر ایک معترض اور نکتہ چین کا یہ فرض ہے کہ اُن ظالموں کے کردار کو اُنہی پر محدود رکھے نہ یہ کہ اُن کے کردار سے مذہبِ اسلام پر نکتہ چینی کرے ٭

مذہبِ اسلام میں اگرچہ بجا بجا عفو و صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور لوگوں کو اُس کی رغبت دلائی گئی ہے، مگر اُسی کے ساتھ بدلا لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانونِ قدرت کے مناسب نہیں ہے؟ اور کیا اِس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے؟ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں، اور سننے و پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلےٰ درجہ کی نیکی کے ہیں، مگر درحقیقت وہ ہوائی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے، اور چونکہ وہ اصول فطرتِ انسانی کے بلکہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں کبھی اُن پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ ایسا قانون بنانے سے جس پر کبھی عملدرآمد نہ ہو سکے کوئی نتیجہ اور فائدہ مترتب نہیں ہوتا، بلکہ دل میں اُس قانون کی حقارت بیٹھتی ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہے ٭

کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار اور متحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانے والی جس سے آنکھوں میں چکا چوند آجاوے نہیں ہے۔ گو اُس کے مقولے ایسے نہیں ہیں کہ سب سے پہلے اُسی میں بیان کئے گئے ہوں بلکہ بہت سے

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۰۷﴾	پوچھ بنی اسرائیل سے کہ ہم نے اُن کو صریح نشانوں میں سے کس قدر دیں اور جو کوئی بدلڈالے اللہ کی نعمت کو بعد اس کے کہ اُس کے پاس آچکی ہو، تو بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب کرنے والا ہے ﴿۲۰۷﴾

ایسے ہیں جو اُس سے پہلے لوگوں نے بھی جن کے پیرو اب بت پرست اور کافر گنے جاتے ہیں بنا بن گئے ہیں۔ مگر ہم کو دیکھنا چاہئیے کہ اُن کا لوگوں میں کیا اثر ہؤا رہا ۔

انجیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دے۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے، مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے، اور اسی طرح لوگوں کی جان و مال امن میں رہے! نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب ایسے ہی ہو جائیں تو دنیا سے شر اُٹھ جاوے۔ مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہؤا ہے؟ یا کبھی ایسا ہوگا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جو خیال میں شدنی قرار دیکر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ "تو اپنے کل کے کھانے کی فکر مت کر، خدا کل کی روزی پہنچانے کی فکر کرنے والا ہے" دل کو یہ مقولہ نہایت ہی پیارا اور اُس پیار سے خدا پر اعتماد دلانیوالا معلوم ہوتا ہے، مگر کبھی کسی نے اس پر عمل کیا ہے؟ آیندہ کبھی اس پر عمل ہوگا؟ اگر ہم اس ناشدنی امر کو ایک لحمہ کے لئے شدنی تصور کر کے تمام دنیا کے لوگوں کو اسی مقولہ پر عمل کرتا ہؤا سمجھ لیں، تو دنیا کا کیا حال ہوگا؟ پس اس قسم کی تمام باتیں انسان کو دھوکا دینے والی ہیں اور قانون قدرت کے برخلاف ہونے سے خود اپنی سچائی کو مشتبہ کرتی ہیں ۔

عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا پھلا، اور سرسبز و شاداب ہؤا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہؤا، مگر دیکھو کہ اُس نے کیا پھل پیدا کیا۔ ایک بھی نصیحت اُس کی کام نہ آئی، اور خود مذہب نے خونریزی اور بیرحمی اور نانصافی، اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھلائی وہ شاید دنیا میں بےمثل ہوگی، اور جس نیکی پر اُس کی جڑ لگائی گئی تھی اُس نے کچھ پھل نہیں دیا کیونکہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی کیا روحانی کیا اخلاقی اور کیا تمدنی، اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں، کیا یہ پھل اُسی درخت کا ہے جس کی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو خلاف قانون قدرت تھی؟ حاشا و کلا، بلکہ یہ اُس کا پھل ہے کہ اُس درخت کو وہاں سے اُکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے، اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے اسی قدر اُس میں نقصان ہے ۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۰۸﴾

آراستہ کی گئی ہے اُن لوگوں کے لئے جو کافر ہوئے دنیا کی زندگی، اور وہ ٹھٹھا کرتے ہیں اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور جو لوگ پرہیزگار ہیں قیامت کے دن اُن سے بالاتر ہونگے، اور اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب ﴿۲۰۸﴾

اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے۔ خون کا بہانا، آدمی کا ہو یا درندے یا ایک پشہ کا، خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجھا ہے، مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو قانون قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا، قتل و خونریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسی قانون قدرت سے ہونی چاہئے۔ وہی جو ایک پشہ کا مارنا گناہ عظیم سمجھتے تھے ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آیند ہو جب کہ قانون قدرت کے برخلاف ہے محض نکما اور بے اثر ہے۔ اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون قانونِ قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ جہاں تک کہ قانون قدرت اجازت دیتا ہے رحم ہے۔ معافی کی جگہ اُسی کے اصول پر معافی ہے۔ بدلے کی جگہ اُسی کے مطابق بدلا ہے۔ لڑائی کی جگہ اُسی کے اصولوں پر لڑائی ہے۔ ملاپ کی جگہ اُسی کی بنا پر ملاپ ہے۔ اور یہی بڑی دلیل اُس کی سچائی کی اور قانون قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے ✦

اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے اُن کو امن دیا ہو، مسلمان ہو یا کافر، اُس کی اطاعت اور احسانمندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھ جو عہد اقرار ہوئے ہوں اُن کو نہایت ایمانداری سے پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اُس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے حملہ کرکے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا، یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اُس نے تلوار کھینچنے کی اجازت دی ہے۔ ایک اُس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے، اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے، نہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں، خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جب کہ اُس ملک یا قوم میں

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۰۹)

سب آدمی ایک گروہ تھے، پھر بھیجا اللہ نے نبیوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، اور اُن کے ساتھ برحق کتاب اُتاری تاکہ لوگوں میں اس بات میں جس میں وہ مختلف ہو گئے ہیں حکم دیں، اور اس میں اختلاف نہیں کیا اُن لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی بعد اس کے کہ اُن کے پاس نشانیاں آ گئیں مگر آپس کے حسد سے، پھر ہدایت کی اللہ نے اپنی مرضی سے حق بات کی اُن لوگوں کو جو اُس میں ایمان لائے جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور اللہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہے سیدھے رستے کی (۲۰۹)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲۱۰)

(اے ایمان والو) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم داخل ہو گے جنت میں حالانکہ تم پر (ویسی مصیبت) نہیں آئی ہے جیسی کہ اُن لوگوں پر آئی تھی) جو تم سے پہلے گذرے، اُن کو خوف نے پکڑا اور تکلیف نے، اور کپکپا دئے گئے، یہاں تک کہ رسول نے اور اُن لوگوں نے جو اُس پر ایمان لائے تھے کہا کہ کب خدا کی مدد ہو گی، جان لو کہ بیشک اللہ کی مدد قریب ہے (۲۱۰)

مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں اُن کے جان و مال کو امن نہ ملے، اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اُس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمانداری کا بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں، یا امن کا علانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو، اور گو صرف بوجہ اسلام اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی اُن کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں، یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اُس ملک میں امن لئے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، اُن کو اُن مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے، یا اُن کے لئے امن اور اُن کے لئے ادائے فرائض مذہبی کی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اُس کو

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ
مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۱۱)
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ
هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (۲۱۲) وَعَسٰٓى اَنْ
تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ
عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۱۳)

تجھ سے پوچھتے ہیں (کہ کس طرح اپنا مال) خرچ کریں، تو کہدے کہ جو کچھ تم مال میں سے خرچ کرو تو ماں باپوں اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے (خرچ کرو) اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بیشک اللہ اُس کا جاننے والا ہے (۲۱۱) لکھی گئی تم پر لڑائی، اور وہ بُری معلوم ہوتی ہے تم کو (۲۱۲) اور شاید جس چیز کو تم بُرا جانتے ہو اور وہی بہتر ہو تمہارے لئے، اور شاید جس چیز کو تم دوست رکھتے ہو وہی بُری ہو تمہارے لئے، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۲۱۳)

مذہب اسلام کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا +

یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے ۔ یہی لڑائی ہے جس کے کرنے کی ترغیب دی ہے ۔ یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے ۔ یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے ۔ یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں ۔ کون کہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی نا انصافی اور زیادتی ہے ؟ کون کہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے ؟ کون کہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانون قدرت ، انسان کی فطرت کے مخالف ہے ؟ کون کہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے ؟ کون کہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہونا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا ؟ +

لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے ۔ اُس میں بجز اس کے کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری کرو، دل کو مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کرو یا مارے جاؤ، اور کچھ نہیں کہا جاتا ۔ وہی قرآن نے بھی کہا ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اُس موقع اور محل کو جس کی نسبت قرآن میں لڑنیوالوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں چھوڑ کر اُن آیتوں کو عموماً خونخواری اور خونریزی پر منسوب کرے، جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے ، تو یہ خود اُس کا قصور ہوگا نہ اسلام کا +

لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اُس میں بھی فروگذاشت نہیں کیا ۔ عورتوں کو ، بچوں کو ، بوڑھوں کو ، جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں اُن کو قتل کرنے کی ممانعت کی ۔ عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُس کے قتل کی اجازت

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۴﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے میں لڑنے سے، کہدے کہ اُس میں لڑنا بڑا بُرا ہے، اور خدا کی راہ سے روکنا ہے اور اس کے ساتھ کفر کرنا ہے، اور مسجد حرام سے (روکنا ہے) اور اُس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالدینا بہت زیادہ بُرا ہے اللہ کے نزدیک، اور فتنہ (برپا کرنا) زیادہ بُرا ہے قتل سے، اور تم سے ہمیشہ لڑے جاوینگے جب تک کہ پھیر دیں تم کو تمہارے دین سے اگر وہ کر سکیں، اور جو تم میں سے پھر جاوے اپنے دین سے پھر مر جاوے اور کافر ہو، تو یہی لوگ ہیں کہ مٹیامیل ہو جاتے ہیں اُن کے عمل دنیا میں اور آخرت میں، اور یہی لوگ آگ (میں جانے) والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہینگے ﴿۲۱۴﴾

نہیں دی۔ صلح کو، معاہدۂ امن کو، قبول کرنے کی رغبت دلائی۔ باغ کو، کھیتوں کو، جلانے کی ممانعت کی۔ قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لیکر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد غلام اور لونڈی بنا لینے کا تھا اُس کو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس میں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی، بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کئے۔ مگر جب کہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے، جنہوں نے عمر کو، عثمان کو، علی کو، حسین کو، ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلایا تھا۔ پس اُن کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے ❖

مشرکین مکّہ نے اُن لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے صرف اسلام کی عداوت سے، اور خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم پر بہت سے ظلم کئے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں قتل کے درپے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی، اور آخرکار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان مکّہ کو چھوڑ کر مدینے چلے آئے۔ پھر اُنہوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا، اور مکہ میں حج کے آنے سے روکا۔ لڑائی پر آمادہ ہوئے۔ تب اسلام نے بھی اُن سے لڑنے کا حکم دیا۔ پس جس قدر احکام قتل مشرکین کے ہیں وہ سب اُنہی لڑنے والوں سے متعلق ہیں۔ وہ بھی اُسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جاوے جیسے خود خدا نے فرمایا ہے کہ " وقاتلوھم حتی لا تکون فتنہ ویکون

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۱۵﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ﴿۲۱۶﴾ قُلِ الْعَفْوَ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۷﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ ﴿۲۱۸﴾ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۱۹﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ﴿۲۲۰﴾

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں وہی لوگ امیدوار ہیں خدا کی مہربانی کے، اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان ﴿۲۱۵﴾ تجھ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے سے، کہدے کہ اُن دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور فائدے ہیں لوگوں کے لئے، اور اُن کا گناہ بڑا ہے اُن کے نفع سے، اور پوچھتے ہیں تجھ سے کہ کس طرح (اپنا مال) خرچ کریں ﴿۲۱۶﴾ کہدے حاجت سے زیادہ کو، اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لئے نشانیاں تاکہ تم فکر کرو ﴿۲۱۷﴾ دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں، اور پوچھتے ہیں تجھ سے یتیموں سے، کہدے کہ اُن کے لئے اصلاح کرنی بہتر ہے ﴿۲۱۸﴾ اور اگر تم اُن کو ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے (یعنی تمیز کرتا ہے) فساد کرنے والوں کو اصلاح کرنے والوں سے، اور اگر خدا چاہتا تو سختی میں ڈالتا تم کو، بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ﴿۲۱۹﴾ اور مت نکاح میں لاؤ مشرک عورتوں کو جب تک کہ ایمان لاویں، اور البتہ مسلمان لونڈی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ تم کو اچھی لگتی ہو، اور مت نکاح میں لو مشرک مردوں کو جب تک کہ وہ ایمان لاویں، اور البتہ مسلمان غلام بہتر ہے مشرک مرد سے اور اگرچہ تم کو اچھا معلوم ہوتا ہو ﴿۲۲۰﴾

الذین للہ ۔۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو ڈرانے تھے اور ایذا دیتے تھے تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے۔ پھر بھی وہ برابر ایذا و تکلیف دیتے رہے، یہاں تک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے، اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جاویں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ اُن پر غالب ہو جاؤ تاکہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیرنے کے لئے ایذا نہ دے سکیں، اور تم شرک میں نہ پڑو ✣

أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ
يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾ وَ
يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ
هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ
فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ
يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ
مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ
الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاؤُكُمْ
حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ
أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ
وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ
مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

یہ لوگ بلاتے ہیں آگ (یعنی دوزخ) کی طرف ، اور اللہ بلاتا ہے جنت اور بخشش کی طرف اپنی مرضی سے ، اور بیان کرتا ہے اپنی نشانیاں لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں (۲۲۱) اور تجھ سے پوچھتے ہیں حیض سے کہدے کہ وہ نجاست ہے پس کنارہ رکھو عورتوں کو حیض کی حالت میں اور اُن سے مقاربت نہ کرو جب تک کہ پاک ہوں ، پھر جب پاک ہوجاویں تو اُن کے پاس جاؤ جس طرح کہ خدا نے تم کو حکم کیا ہے ، بیشک اللہ دوست رکھتا ہے معافی چاہنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے ستھرائی والوں کو (۲۲۲) عورتیں تمہاری کھیتی ہیں پھر اپنی کھیتی پاس جاؤ جس طرح تم چاہو ، اور آگے بھیجو اپنے لئے (یعنی نیکی) اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک تم اُس سے ملو گے ، اور خوشخبری دے ایمان والوں کو (۲۲۳)

"یکون الدین للہ" ، کا فقرہ بھی اُنہی آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکین عرب کے حملہ کے دفعہ کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی ہیں ۔ اس کے یہ معنی سمجھنے کہ اتنا لڑنا چاہئے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہوسکتی ہے ۔ اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہئے کہ اللہ کے دین کے بجالانے میں جو کافر حرج ڈالتے ہیں وہ نہ رہے ، اور اللہ کے لئے دین ہوجاوے کہ مسلمان خدا کے لئے اُس کو بے ایذا کے بجالاسکیں *

(۱۹۲) (وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ) اس آیت سے حج کے احکام شروع ہوئے ہیں ، مگر قبل اس کے کہ ہم اُس کی ماہیت اور اُس کے اسرار پر بحث کریں پہلے سیدھی سادی طرح سے بتادینا چاہئے کہ مسلمان عُمرہ اور حج کیونکر کرتے ہیں اور یہ بتانا چاہئے کہ جو کچھ حج میں کیا جاتا ہے اُس میں سے قرآن مجید میں کس کس چیز کا ذکر ہے *

حج میں آٹھ چیزیں ہیں ۔ احرام و نیت ، طواف قدوم ، سعی بین الصفا والمروہ ، خروج منیٰ ، وقوف مزدلفہ ، منے اور رمی جمار ، طواف الزیارت ، طواف الصدر ۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾	اور مت بناؤ اللہ کو آڑ اپنی قسموں کی (نیک کاموں سے) بچنے کو، اور پرہیزگاری کرو اور لوگوں میں اصلاح کرو اور اللہ سننے والا ہے جاننے والا ﴿۲۲۴﴾

چنانچہ ہم اُن میں سے ہر ایک چیز کو علٰحدہ بیان کرتے ہیں ؞

احرام اور نیّتِ حج

احرام باندھنے کے لئے مقامات معیّن ہیں جو میقات کہلاتے ہیں۔ مکہ کے رہنے والوں کے لئے خاص حرم کعبہ میقات ہے، اور مدینہ کی طرف سے آنے والوں کو ذو الحلیفہ، اور عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذات عرق، اور شام کی طرف سے آنے والوں کے لئے جحفہ، اور نجد کی طرف سے آنے والوں کے لئے قرن، اور یمن کی طرف سے آنے والوں کے لئے جس میں ہندوستان کے جانے والے بھی داخل ہیں یلملم ؞

میقات پر پہنچ کر صرف حج کی یا صرف عمرہ کی یا حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے۔ احرام کے معنی ایسے بزرگ اور مقدس کام کے شروع کرنے کے ہیں جس کا ادب توڑا نہ جاسکے۔ احرام میں صرف ایک چادر بطور تہ بند کے باندھتے ہیں، اور ایک چادر اوڑھنے کے لئے ہوتی ہے۔ مگر سر پر چادر نہیں اوڑھی جاتی، سر کھلا رہتا ہے۔ چادر ایک پاٹ کی ہو خواہ دو پاٹ کی سی ہوئی کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ قطع کیا ہوا کپڑا جو قینچی سے قطع کر کے سیتے ہیں پہننا منع ہے ؞

میقات پر پہنچ کر غسل کیا جاتا ہے یا وضو، اور اُس کے بعد نیت کر کے احرام باندھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں، " لبیك اللهم لبيك لا شريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك لك لا شريك لك لبيك " اور ہر نماز کے بعد یا جب اونچی جگہ پر چڑھے یا نیچے اُترے تو وہی جملہ کہنا چاہئے ؞

زمانہ احرام میں سر کو ڈھانکنا، یا ایسا کپڑا جو قطع ہو کر سیا گیا ہو پہننا، موزہ یا جُراب سے پاؤں کو ڈھانکنا، شکار کھیلنا، یا دوسرے کو شکار بتانا، سر منڈانا، ناخن ترشوانے، عورت کے پاس جانا، منع ہے ؞

طوافِ قدوم

جب مکہ میں پہنچے اور حرم کعبہ دکھائی دے تو کہے " الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾	نہیں پکڑیگا اللہ تم کو تمہاری لغو قسموں میں ولیکن تم کو پکڑیگا اُس چیز میں کہ کمائی ہے تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا ہے بُردبار ﴿۲۲۵﴾ اُن لوگوں کے لئے جو قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں (کے پاس جانے) سے توقف کرنا ہے چار مہینے پھر اگر وہ پھر جاویں (اپنی قسم سے) تو بیشک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ﴿۲۲۶﴾ اور اگر انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا ہے تو بیشک اللہ سننے والا ہے اور جاننے والا ﴿۲۲۷﴾

اللہ اکبر واللہ اکبر وللہ الحمد"۔

جب حرم کے اندر جائے حجر اسود کے سامنے کھڑا ہو، اگر ممکن ہو تو اُس کو بوسہ دے ورنہ ہاتھ سے بوسہ لینے کا اشارہ ہی کرلے، اور کعبہ کے گرد گھومنا شروع کرے، اور جب حجر اسود کے سامنے آوے یا اُس کا بوسہ لے یا اُسی طرح سے اشارہ کرے سات مرتبہ گھومے اور کوئی دعا جو اُس کا جی چاہے پڑھتا رہے اور اُس گھومنے میں تیز مونڈھے ہلا کر چلے۔

سات دفعہ گھومنے کے بعد جس کو طواف کہتے ہیں مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز کی پڑھے۔

سعی بین الصفا والمروہ

اُسی دن طواف کعبہ کے بعد صفا و مروہ میں جو نہایت چھوٹے چھوٹے پہاڑ ہیں سات دفعہ پھرے صفا کی پہاڑی پر چڑھے، اور کعبہ کی طرف منہ کرکے کہے، "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد اللّٰھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید"۔ اس کے بعد جو دعا چاہے مانگے، اور صفا پر سے اُتر کر مروہ کو جاوے اس رستے میں دو نشان بنے ہوئے ہیں اُن نشانوں کے بیچ میں دوڑ کر چلے۔ جب مروہ پر چڑھے تو کعبہ کی طرف منہ کرکے وہی تمام جملے جو صفا پر پڑھا تھا پڑھے۔ یہ ایک دوڑ ہوئی، جس کو ایک شوط کہتے ہیں۔ اسی طرح سات دفعہ کرے۔ ساتویں دوڑ مروہ پر ختم ہوگی۔

اگر احرام باندھتے وقت صرف عمرہ کی نیت کی ہے، تو عمرہ ختم ہوگیا۔ احرام کھول دے، اور پھر آٹھویں ذی الحجہ کو حرم کے اندر جا کر حج کا احرام باندھے۔ اور اگر حج اور عمرہ دونوں کی اکٹھی نیت کی، یا صرف حج کی نیت کی ہو تو بدستور احرام باندھے رکھے۔

خروج منیٰ

جو لوگ عمرہ ادا کرکے احرام سے خارج ہوگئے ہیں اُن کو چاہئے کہ حرم میں جا کر صبح کی نماز پڑھیں

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾	اور جن عورتوں کو طلاق دیگئی ہو ٹھیری رہیں اپنے آپ تین حیض تک اور نہیں روا ہے اُن کو کہ چھپاویں جو کچھ کہ پیدا کیا ہے اللہ نے اُن کے رحموں میں اگر ہیں ایمان لاتے اوپر اللہ اور پچھلے دن پر اور اُن کے خاوند زیادہ حقدار ہیں اُن کے پھیر لینے کے اس میں (یعنی اپنے نکاح میں) اور اگر وہ اصلاح چاہیں اور عورتوں کے لئے بھی (مردوں پر) اُسی کی مانند (حق) ہے جیسا کہ (مردوں کا) اُن پر ہے ساتھ نکوئی کے اور مردوں کے لئے اُن پر (اس معاملہ میں) فضیلت ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ﴿۲۲۸﴾

اور حج کا احرام باندھیں۔ اور منیٰ کو روانہ ہوں، اور جن لوگوں نے احرام نہیں کھولا وہ صبح کی نماز کے بعد منیٰ کو روانہ ہوں۔ رات کو منیٰ میں رہیں نویں تاریخ صبح کی نماز کے بعد علی الصباح عرفات کے میدان میں جاویں، اور غروب آفتاب تک اُسی میں رہیں، اور جو دعائیں چاہیں مانگتے رہیں، وہاں امام اونٹنی پر چڑھ کر خطبہ پڑھتا ہے، اور لوگوں کو نیکی اور خدا پرستی کی نصیحت کرتا ہے، اور ہزاروں لوگ اُس کے گرد کھڑے ہو کر سنتے ہیں اور جو نہیں سُن سکتے وہ اپنی ہی جگہ دعا وغیرہ پڑھتے ہیں +

وقوفِ مُزدلفہ

مغرب کی نماز کے بعد اُس میدان سے لوگ روانہ ہوتے ہیں، اور مزدلفہ کے میدان میں آکر رات بسر کرتے ہیں +

مِنیٰ اور رمیِ جمار

دسویں ذی الحجہ کو مزدلفہ سے چلکر منیٰ میں پہنچتے ہیں، منیٰ کے میدان میں تین ستون بطور نشان کے بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک ستون پر سات سات کنکریاں ایک ایک کر کے مارتے ہیں، اور ہر کنکری کے مارنے کے وقت یہ پڑھتے ہیں،، اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد +

جب تینوں ستونوں پر یہ کنکریاں مار لیں تو ہر بلندی و پستی پر اور نماز کے بعد جو لبیک کہتا تھا وہ کہنا موقوف کر دے، اور جمرۃ العقبہ کے پاس ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے وہاں قربانی کرے، اور سر منڈوائے یا بال کترواڈالے اور احرام کھولدے اور کپڑے پہن لے، مگر عورت کے پاس

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾	طلاق (رجعی) دو دفعہ دینی ہے پھر یا تو نیکی سے رکھ لینا ہے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور نہیں حلال ہے تم کو کہ لو اُس چیز میں سے جو کچھ تم نے اُن کو دیا ہے کچھ بھی مگر جب کہ اس بات سے دونوں ڈریں کہ دونوں نہیں قائم رکھ سکنے کے حدیں اللہ کی، پھر اگر تم ڈرو کہ دونو نہیں قائم رکھینگے اللہ کی حدوں کو تو اُن دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے اُس چیز میں کہ عورت اُس کو اپنے بدلے دے، یہ ہیں اللہ کی حدیں پھر اُن سے تجاوز مت کرو اور جس نے تجاوز کیا اللہ کی حدوں سے پھر یہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾ پھر اگر عورت کو طلاق دیدی (یعنی تیسری بار) تو اُس کے بعد اُس کو حلال نہیں ہے جب تک کہ نکاح کرے اُس کے سوا دوسرے شوہر سے، پھر اگر وہ اُس کو طلاق دیدے تو اُن دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے پھر نکاح کر لینے میں اگر گمان کریں کہ دونوں قائم رکھینگے حدیں اللہ کی اور یہ اللہ کی حدیں ہیں بیان کرتا ہے اُن کو اُس گروہ کے لئے کہ جانتے ہیں (یعنی اُس گروہ کے لئے جو جاننے کے قابل ہیں نہ غیر مکلفین کے لئے جو مجنون یا نابالغ ہیں) ﴿۲۳۰﴾

جانے کی اب تک اجازت نہیں ٭

گیارھویں اور بارھویں کو بدستور منیٰ میں رہے، اور دونوں دن بھی اُن تینوں ستونوں کو سات سات کنکریاں اُسی طرح مارے جس طرح کہ دسویں تاریخ کو ماری تھیں ٭

طواف الزیارت

انھی تاریخوں میں یعنی دسویں یا گیارھویں یا بارھویں کو قربانی کے بعد منیٰ سے حرم میں آوے اور خانہ کعبہ کا طواف اُسی طرح کرے جس طرح اوپر بیان ہُوا، اور پھر منیٰ میں چلا جائے۔ بعد اس کے اپنے کام میں لگے اور جو چاہے سو کرے ٭

اگر کسی نے طواف قدوم کے بعد سعی بین الصفا والمروہ نہ کی ہو تو اس کو اس طواف کے

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۳۱)

اور جب کہ تم نے عورتوں کو طلاق دی پھر وہ پہنچ گئیں اپنی میعاد کو پھر یا تو روک لو اُن کو ساتھ نیکی کے یا چھوڑ دو اُن کو ساتھ نیکی کے اور مت رد کو اُن کو ضرر پہنچانے کو تا کہ اُن پر زیادتی کرو اور جو کوئی ایسا کریگا تو بیشک اُس نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کی نشانیوں کو تمسخر اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں اور اُس چیز کو (یاد کرو) جو اُتاری ہے تم پر کتاب اور حکمت سے اور نصیحت کرتا ہے تم کو اُس سے اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے (۲۳۱)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲)

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دیدی اور اُنھوں نے اپنی مدت پوری کر دی تو اُن کو اپنے خاوندوں سے جب کہ وہ نیکی سے آپس میں راضی ہو جاویں نکاح کرنے سے منع مت کرو، اس بات سے کہ اُس شخص کو کہ جو تم میں سے خدا پر اور اخیر دن پر ایمان لایا ہے نصیحت کی جاتی ہے، یہ بات تمہارے لئے پاکیزہ اور پاک ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۲۳۲)

بعد کر لینی چاہیئے ✦

طوافُ الصدر

جو لوگ اور مُلکوں سے حج کرنے کو آتے ہیں، اور حج کے بعد واپس جانا چاہتے ہیں تو اُن کو صرف طواف کر کے روانہ ہونا چاہیئے ✦

اقسام حج

حج تین قسم ہے۔ افراد، قران، تمتع۔ اگر صرف حج کی نیت سے احرام باندھا ہے اُس کا نام تو حج افراد ہے۔ اور اگر حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھا ہے اُس کا نام قران ہے

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور بچے والیاں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلادیں، یہ اُس کے لئے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہے اور جس شخص کا بچا ہے اُس پر نیکی کے ساتھ اُن کا کھانا اور اُن کا کپڑا دینا ہے، کوئی شخص تکلیف نہیں دیا جاتا مگر بقدر اُس کی طاقت کے، نہ ضرر میں ڈالی جاوے کوئی ماں بسبب اُس کے بچے کے اور نہ وہ جس کا بچا ہے بسبب اُس کے بچے کے اور وارث پر بھی اسی کی مانند ہے، پھر اگر دونوں دودھ چھڑانے کا آپس کی رضامندی و مشورہ سے ارادہ کریں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں ہے، اور اگر تم اپنی اولاد کو پلائیوں سے دودھ پلوا لینا چاہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے جب کہ حوالہ کردو جو کچھ تم نے دینا کیا ہے نیکی سے اور ڈرو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس کو دیکھتا ہے ﴿۲۳۳﴾

اور اگر صرف عمرہ کی نیت سے، اور عمرہ کے بعد پھر حج کی نیت سے، احرام باندھا ہے تو حجِ تمتع ہے *

حج افراد اور تمتع کی تو بالکل وہی صورت ہے جو بیان ہوئی، الّا حج قران میں اس قدر فرق ہے کہ طواف قدوم اور سعی بین الصفا والمروہ دو دفعہ کرنی لازم ہے *

ارکان حج جو قرآن مجید میں مذکور ہیں

میقات کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ غالباً جو لوگ باہر سے کعبہ کی زیارت کو یا حج کو آتے تھے، اور جب قریب پہنچتے تھے تو حج کی نیت سے ایسی باتوں کے کرنے سے جن کو تقدس اور ادب کے برخلاف سمجھتے تھے اجتناب کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ مقامات بطور میقات قرار پاگئے اور زمانہ کے گذرنے پر اُنہی مقامات سے مسافروں کا احرام میں داخل ہونا ایک امر لازمی اور ضروری قرار پاگیا۔ اگر کوئی شخص بلا ارادہ حج اور بغیر باندھے احرام کے میقات پر مکہ میں چلا جاوے، اور مکہ میں پہنچنے کے بعد حج کا ارادہ کرے اور احرام باندھے، تو اُس کے حج میں بھی کوئی نقص

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾	اور جو لوگ تم میں سے مرجاویں اور بیویاں چھوڑیں تو اُن کو خود چار مہینے اور دس دن انتظار کرنا چاہئے پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اُس بات میں جو اپنے لئے نیکی سے کرنا چاہیں اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے خبردار ہے ﴿۲۳۴﴾

نہیں ہونیکا ❖

احرام کے وقت تہ بند باندھنے اور بغیر قطع کیا ہوا کپڑا پہننے کا بھی قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس کا رواج زمانۂ جاہلیت سے برابر چلا آتا تھا، اور اسلام میں بھی قائم رہا۔ یہ پوشاک جو حج کے دنوں میں پہنی جاتی ہے ابراہیمی زمانہ کی پوشاک ہے حضرت ابراہیم کے زمانہ میں دنیا نے سویلزیشن[1] میں جو تمدنی امور سے علاقہ رکھتی ہے کچھ ترقی نہیں کی تھی۔ وہ قطع کیا ہوا کپڑا بنانا نہیں جانتے تھے۔ اُس زمانہ کی پوشاک یہی تھی کہ ایک تہ بند باندھ لیا کسی کو اگر زیادہ ستر ہوا تو ایک ٹکڑا کپڑے کا بطور چادر کے اوڑھ لیا۔ سر کو ڈھانکنا، اور قطع کیا ہوا کپڑا پہننا کسی کو نہیں معلوم تھا۔ حج جو اُس بڈھے خداپرست کی عبادت کی یادگاری میں قائم ہوا تھا جس نے بہت سوچ بچار کر کہا تھا، "إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ"، تو اس عبادت کو اُسی طرح اور اُسی لباس میں ادا کرنا قرار پایا تھا جس طرح اور جس لباس میں اُس نے کی تھی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شروع سویلزیشن کے زمانہ میں بھی اُسی وحشیانہ صورت اور وحشیانہ لباس کو ہمارے بڈھے دادا کی عبادت کی یادگار میں قائم رکھا ❖

احرام میں داخل ہونے اور حج کی نیت یعنی حج کے قصد کرنے کا قرآن مجید کے اُن لفظوں سے کہ "فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ" پایا جاتا ہے ❖

احرام کے دنوں میں جنگل کے جانوروں کے شکار کی ممانعت بھی قرآن سے پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے، "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ۔ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا" ❖

احرام کے دنوں میں لڑائی اور فساد اور عورت کے پاس جانے کی ممانعت بھی قرآن کی اس آیت سے پائی جاتی ہے، "فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" ❖

احرام اور ارکان کے ختم ہونے تک سر منڈانے کی ممانعت کا بھی اشارہ اس آیت سے نکلتا ہے، "وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ" ❖

[1] تہذیب۔ شائستگی۔ احمد بابا

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا (۲۳۵)	اور تم پر گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ اشارۃً تم نے عورتوں سے پیغام نکاح کیا ہو یا تم نے اپنے دل میں اُس کو پوشیدہ رکھا ہوا اللہ جانتا ہے کہ بیشک تم اُن کو یاد کرو گے ولیکن اُن سے خفیہ وعدہ مت کرلو، بجز اس کے کہ کہو کوئی بات نیک (۲۳۵)

طواف کا اور اس میں ذکر اللہ کرنے کا اشارہ بھی قرآن سے پایا جاتا ہے، جیسا کہ ان آیتوں میں ہے" وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" +

" فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" مگر سات دفعہ پھرنے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے غالباً ایام جاہلیت سے برابر چلا آتا ہے +

سعی بین الصفا والمروہ جس طرح ایام جاہلیت میں لوگ کرتے تھے، اُسی طرح اب بھی کرتے ہیں۔ اس کا بھی اشارہ قرآن میں موجود ہے، جہاں فرمایا ہے "إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا +

عرفات میں جانے کا بھی قرآن کی اس آیت سے اشارہ پایا جاتا ہے " فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" +

مزدلفہ میں رہنے اور منیٰ میں ایام تشریق میں ٹھیرنے کا بھی اشارہ ان آیتوں سے پایا جاتا ہے۔ "ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ ۔۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ" +

قربانی جو حج میں کی جاتی ہے اُس کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ وہ قربانی تین طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جو جانور کو ساتھ لے کر جاتے ہیں اس ارادہ سے کہ مکہ میں جاکر ذبح کریں گے، اُس کا ذکر تو اس آیت میں ہے "وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ " +

دوسری قسم قربانی کی وہ ہے جو حج تمتع میں کی جاتی ہے، اور اُس کا ذکر اس آیت میں ہے "فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ" +

تیسری قربانی عام طور پر حج کے بعد ہے، اور اُس کا ذکر اس آیت میں ہے "وَيَذْكُرُوا

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۳۵)	اور مت قصد کرو عقد نکاح کا جب تک کہ پہنچے میعاد معینہ اپنی مدت کو اور جان لو کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تمہارے دلوں میں ہے پس اُس سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ بخشنے والا ہے بردبار (۲۳۵)

اسم اللّٰہ فی ایام معلومات علی ما رزقہم من بہیمۃ الانعام فکلوا منہا واطعموا البائس الفقیر" ؛

حجر اسود اور رمی جمار کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ حجر اسود کعبہ کے ایک کونے میں لگا یا گیا تھا، اُس سے مقصد صرف یہ تھا کہ طواف کی تعداد معلوم رہے۔ اُسی کونے سے طواف شروع ہوتا ہے اور اُسی مقام پر ختم ہوتا ہے، اور حجر اسود کو چھو لیا جاتا ہے یا بوسہ دیا جاتا ہے، یا اُس کی طرف اشارہ کر لیا جاتا ہے کہ جس سے معلوم ہو کہ ایک طواف ختم ہوا۔ رمی جمار کی کوئی ٹھیک وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ تمام ارکان حج اسلام میں وہی بحال رہے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں تھے، اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہی رسم رمی جمار کی جو زمانہ جاہلیت میں تھی اسلام میں بھی مثل دیگر ارکان حج کے عملدرآمد رہی ؛

حج کی حقیقت

جب کہ حضرت اسمٰعیل مکہ میں آباد ہوئے، اور ابراہیم اور اسمٰعیل نے کعبہ کو بنایا۔ تو اور قومیں جو گرد و نواح میں خانہ بدوش پھرتی تھیں وہاں آکر آباد ہوئیں، اور جیسا کہ دستور ہے اُس مقدس مسجد کی زیارت کو لوگ آنے لگے۔ وہاں کوئی زیارت کی چیز بجز بے چھت کی مسجد کی دیواروں کے اور کچھ نہ تھی۔ جو کچھ زیارت تھی وہ یہی تھی کہ لوگ جمع ہو کر اُس زمانہ قدیم کے وحشیانہ طریقہ پر خدا کی عبادت کرتے تھے، ننگے سر، تہ بند بندھا ہوا، ننگ دھڑنگ اُن دیواروں کے گرد جو خدا کے نام سے بنائی گئی تھیں اُچھلتے اور کودتے اور حلقہ باندھ کر چوگرد پھرتے تھے، جس کا اب ہم نے طواف نام رکھا ہے ؛

حضرت ابراہیم نے بغرض آبادی مکہ اور ترقی تجارت یہ بات چاہی کہ لوگوں کے آنے اور زیارت کرنے اور اُس مقام پر عبادت معبود کے بجالانے کے لئے ایام خاص مقرر کئے جاویں، تاکہ لوگوں کے متفرق آنے کے بدلے موسم خاص میں مجمع کثیر ہوا کرے، اور سب مل کر خدا کی عبادت بجالاویں، اور مکہ کی آبادی اور تجارت کو ترقی ہو۔ اس امر کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (۲۳۷) وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲۳۸)

تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اگر تم عورتوں کو طلاق دو اُس وقت کہ اُن کو چھُوا بھی نہیں ہے یا اُن کے لئے تم نے کوئی مقدار (یعنی مقدار مہر) مقرر بھی نہیں کی ہے اور اُن کو کچھ دو، مقدور والے پر نیکی سے دینا ہے اپنے مقدور کے موافق اور تنگدست پر اپنے مقدور کے موافق (یہ ایک طرح کا) حق ہے نیک لوگوں پر (۲۳۷) اور اگر تم نے اُن کو طلاق دی ہے قبل اس سے کہ اُن کو چھُوا ہو اور تم نے اُن کے لئے مقدار (یعنی مقدار مہر) مقرر کی ہے تو جو تم نے مقرر کیا ہے اُس کا نصف دینا چاہئے) مگر یہ کہ وہ معاف کردیں یا وہ شخص معاف کرے جس کے اختیار میں نکاح باندھنا تھا اور تمہارا معاف کرنا زیادہ تر قریب ہے پرہیزگاری کے لئے اور مت بھولو آپس کے احسان کو بیشک اللہ تعالےٰ اُس چیز کو جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے (۲۳۸)

اذ بوأنا لابراهيم مكان البيت ان لا تشرك بي شيئا وطهر بيتي للطائفين والعٰكفين والركع السجود واذن في الناس بالحج يأتوك رجالا وعلى كل ضامر يأتين من كل فج عميق ليشهدوا منافع لهم (سورہ حج)

جہاں حضرت ابراہیم کو کہا ہے کہ ”حج کو لوگوں میں مشہور کردے تیرے پاس پیدل اور دُبلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر ہر ایک دور دراز رستے سے لوگ آوینگے تا کہ اپنے فائدوں کے لئے موجود ہوں“ تفسیر ابن عباس میں ”لیشهدوا منافع لهم“ کی تفسیر میں لکھا ہے ”منافع الدنيا والاخرة ومنافع الاخرة بالدعاء والعبادة ومنافع الدنيا بالربح والتجارة“ یعنی منافع سے دنیا و آخرت دونوں کے منافع مراد ہیں۔ آخرت کا منافع دعا مانگنے اور عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اور دنیا کا منافع فائدہ اُٹھانے اور تجارت سے ❊

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس رسم کو اُنہی اغراض کے لئے جاری رکھا جس غرض سے کہ حضرت ابراہیم نے مقرر کی تھی، جس کا اشارہ اس آیت میں ہے ”ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم“ یعنی حج کے دنوں میں اگر تم تجارت سے روزی کمانے کی تلاش کرو تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ پس یہ سمجھنا کہ بانیٔ اسلام نے کعبہ شریف کو مثل بارس پتھر کے

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۹﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۴۰﴾	حفاظت کرو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی اور خدا کے لئے کھڑے ہو عاجزی کرنے والے ﴿۲۳۹﴾ پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیادہ یا چلتے ہوئے یا سواری پر چلتے ہوئے (نماز پڑھ لو) پھر جب تم کو امن ہو تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھائی ہے وہ چیز کہ تم نہیں جانتے تھے ﴿۲۴۰﴾

قرار دیا تھا کہ جس نے اُس کو چھوا اور سونا ہوگیا یہ ایک غلط خیال ہے۔ ابراہیم اور اسمٰعیل کی بنائی ہوئی مسجد میں لوگ نماز پڑھنے کو آتے تھے اور ابراہیمی طریقہ پر نماز پڑھتے تھے۔ جو سختی اور اضطراب کہ اسمٰعیل اور اُس کی ماں ہاجرہ پر صفا و مروہ کے مقام پر پانی کی تلاش میں گذرا تھا، اور اُس بیقراری کی حالت میں جس طرح اُس نے اپنے خدا کو یاد کیا تھا اور دعا مانگی تھی، اُس کی یادگاری میں وہی حالت اپنے پر طاری کرتے ہیں، اور خدا کی عبادت کا اپنے دل میں جوش پیدا کرتے ہیں۔ موسم حج کا صرف تجارت کی نظر سے مقرر کیا گیا تھا تاکہ قوم اُس سے فائدہ اُٹھاوے، اور اُن ایام میں عرب کی قومیں قافلوں کے لوٹنے اور آپس میں لڑائی جھگڑوں سے باز رہیں۔

وہی تمام طریقے جو حج کی نسبت ابراہیم کے وقت سے چلے آتے تھے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی قائم رکھے۔ اس میں دنیاوی منفعت کے سوا روحانی بھی بہت بڑی تربیت ہے۔ اول اُس بزرگ کی سالانہ یادگاری ہے جو دنیا کی قوموں کے لئے، اور خدائے واحد کا نام دنیا میں پھیلانے اور فطرت اللہ یا دین اللہ کو تمام دنیا میں شائع کرنے کا باعث ہوا۔ ایسے بزرگوں کی یادگاری قائم رکھنا، اور اُن کے پرانے تاریخی واقعات کو زندہ کرنا اُن کے دائمی احسانوں کا اعتراف کرنا ہے، اور اس بات کا ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ خدا نے کس طرح انسان تک اپنی برکت اور اپنا فضل پہنچایا تھا۔ یہ یادگاری آیندہ انہی نیکیوں اور فوائد کے جاری رکھنے میں بہت بڑی مددگار ہوتی ہے اور انسان کے دل کو نرم اور نیکیوں کی طرف راغب رکھتی ہے۔ ہمت بندھتی ہے، دل اور روحانی قوت نیکیاں کرنے پر تازہ ہوجاتی ہے۔ دوسرے تمام ارکان حج میں بجز ابراہیمی طریقہ کی نماز اور دعا اور خدا کی عبادت کے اور کچھ نہیں ہے، اور جب کہ وہ ایسے مقام پر کی جاتی ہے جس کے تاریخی واقعات صرف خیال ہی سے دل پر بہت بڑا اثر پیدا کرتے ہیں، اور جب کہ وہ ایک بہت بڑے جم غفیر کے ساتھ ادا کی جاتی ہے جو دور دراز ستوں اور مختلف ملکوں سے آکر خدا کی عبادت کے لئے جمع ہوئے ہیں، تو صرف اُس ہیئت مجموعی ہی سے جو اثر دل پر اور انسان کی روح پر پڑتا ہے وہ کسی اور طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک عملی طریقہ روحانی تربیت کا ہے جس کی مثل

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۴۱)

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور بیویاں چھوڑیں وصیت کریں اپنی بیویوں کے لئے ایک برس تک کچھ دینے کی بغیر نکال دینے کے پھر اگر وہ نکل جاویں تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ وہ کریں جو کچھ کہ اُن کے دل میں ہے نیکی سے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا (۲۴۱)

کوئی دوسرا طریقہ دنیا میں نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ چند روز کے لئے اُس وحشیانہ حالت میں زندگی بسر کرنی جو اُس بڈھے دادا کے زمانہ میں تھی بہت قوی اثر خدا کی محبت کا دل میں پیدا کرتی ہے۔ سویلیزیشن کے زمانہ میں جب کہ نیک دلی اور سچائی اور خدا پرستی اور خدا کے احسانات کی یادگاری میں وہی وحشیانہ سوانگ بھرا جاوے تو اُس کا نہایت قوی اثر دل پر ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ ایک گروہ کثیر کے مجمع کے ساتھ ہو، اور مجمع کا مجمع ایک شخص یا ایک ذات پاک کی یادگاری میں دیوانہ وار مستغرق ہو۔ انسوبلیزڈ[۱] زندگی بھی ایک طرح پر نہایت عمدہ ہوتی ہے، اور دل کی سادگی اور بیگناہ زندگی کے سبب سے تقدس کی طرف زیادہ میلان رکھتی ہے، اور خیالات کو بن سمجھے خدا کی طرف زیادہ رجوع کرتی ہے۔ بے سمجھا تقید دل پر بہت بڑا اثر رکھتا ہے۔ اس کے بعد شک کا دور دورہ آتا ہے۔ جب تک کہ وہ مٹ نہ جاوے، اور سمجھنے کے بعد دل پر یقین کا تسلط نہ ہو پس اُس پاک خدا کی چند روزہ عبادت کے لئے اُسی مقدس زندگی کو اختیار کرنا روحانی تربیت کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتا ہے ✦

حقیقت حج کی ہماری سمجھ میں یہ ہے جو ہم نے بیان کی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُس پتھر کے بنے ہوئے چوکھونٹے گھر میں ایک ایسی منعدی برکت ہے کہ جہاں سات دفعہ اُس کے گرد پھرے اور بہشت میں چلے گئے، یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ کوئی چیز سوائے خدا کے مقدس نہیں ہے۔ اُسی کا نام مقدس ہے، اور اسی کا نام مقدس رہیگا۔ اُس چوکھونٹے گھر کے گرد پھرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اُس کے گرد تو اونٹ اور گدھے بھی پھرتے ہیں۔ وہ تو کبھی حاجی نہیں ہوئے پھر دو پاؤں کے جانور کو اُس کے گرد پھر لینے سے ہم کیونکر حاجی جانیں ہاں جو حقیقتہً حج کرے وہ حاجی ہے ✦

اس بیان سے حج کے ارکان کی بھی حقیقت بخوبی واضح ہوئی ہوگی۔ احرام باندھنا ابراہیمی زمانہ کی صورت کا بنانا ہے۔ طواف کرنا کعبہ کی دیواروں کے گرد صدقے ہونا نہیں ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس طریقہ پر نماز ہے جو ابراہیمی زمانہ میں اُس چوکھونٹے گھر کے گرد پڑھی جاتی تھی صفا و مروہ میں سعی کرنا اسمٰعیل اور ہاجرہ کے استقلال اور خدا پر کامل یقین کو یاد کرنا ہے، کہ اُس اضطرا

[۱] مہذب ۔ ناشائستہ ✦ احمد ۱۱

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۲۴۲﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۴۳﴾	اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے نیکی سے کچھ دینا حق ہے پرہیزگاروں پر (۲۴۲) اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیاں تاکہ تم سمجھو (۲۴۳)

اور اضطراب کی حالت میں بھی جو پانی کی تلاش میں وہاں اُن پر گذری تھی اُنھوں نے نہیں چھوڑا تھا، اور ایسی حالت میں بھی خدا ہی پر اُنہوں نے بھروسہ کیا۔ پس اُس یقین کو یاد کر کے اپنے دل کو خدا کی محبّت میں زیادہ تر ترقی کرنا ہے ✦

حج میں قربانی کی کوئی مذہبی اصل قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی۔ مکہ ایک بیابانِ غیر ذی زرع تھا۔ اس قدر لوگوں کے جمع ہونے سے خوراک کا میسر آنا مشکل تھا۔ اس لئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لیجاتے تھے جو بُدن اور قلائد کے نام سے مشہور تھے۔ اور جو نہ لیجاتے تھے وہ مکّہ میں خریدتے تھے، اُن کو ذبح کر کے خود بھی کھاتے تھے اور لوگوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حج میں صرف یہی اصل قربانی کی قرآن مجید سے پائی جاتی ہے، جہاں خدا نے فرمایا ہے ”فکلوا منها واطعموا البائس الفقير“۔ ”لكم فيها منافع الى اجل مسمى ثم محلها الى البيت العتيق“۔ ”والبدن جعلناها لكم من شعائر الله لكم فيها خير فاذكروا اسم الله عليها صواف فاذا وجبت جنوبها فكلوا منها واطعموا القانع والمعتر“۔ وہاں پر نہ کوئی دیوتا ہے نہ دیبی ہے، نہ پہاڑ پر کوئی چیز ہے، جس پر بکرا یا مینڈھا یا اونٹ چڑھایا جاوے۔ نہ خدا کو اُس کی بو خوش آتی ہے، نہ اُن کا خون پیتا ہے، نہ اُن کی جان لینے سے خوش ہوتا ہے۔ بلکہ وہ تو صرف نیکی اور بھلائی چاہتا ہے، جیسے کہ خود اُس نے کہا ہے ”لن ينال الله لحومها ولا دماءها ولكن يناله التقوى منكم“۔ پس اس زمانہ میں جو حج کے دنوں میں حاجت سے زیادہ قربانی کی رسم ہے اور لاکھوں جانور ذبح کر کے جنگل میں ڈالتے ہیں، جن کو گیدڑ اور کوّے بھی نہیں کھاتے اُس کا کچھ بھی نشان مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ خدا نے حج ادا کرنے کی زیادہ سختی انسان پر نہیں کی، اور ہر شخص کی استطاعت پر اُس کو منحصر کیا ہے، جو نہایت وسیع معنی رکھتا ہے، وہ بھی تمام عمر میں ایک دفعہ اگر ہو سکے ✦

(۲۲۷) (وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ) اسلام کے مخالفین نے ضد سے یا کج بحثی و نا سمجھی سے جو الزام اسلام پر لگائے ہیں اُن میں سے طلاق کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ یہودی تو یہ الزام لگا نہیں سکتے کیونکہ موسیٰ نے تو یہ حکم دیا ہے کہ جب کوئی طلاق دینی چاہے تو طلاق نامہ لکھدے۔ بعض بت پرست قومیں جن کے ہاں طلاق نہیں ہے اور کسی قدر عیسائی جن کے ہاں بجز زنا کے اور کسی حالت میں طلاق

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۴﴾

کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی اُن کا حال نہیں جانا) جو نکل بھاگے اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے اور وہ ہزاروں تھے پھر اُن سے کہا اللہ نے [1] مر و تم (یعنی بسبب موت کے ڈر کے یا اپنی نامردی اور لڑنے کے ڈر سے) پھر جلایا اُن کو (یعنی اُن کے دل میں شجاعت اور ارادہ جنگ پیدا کیا) بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر البتہ فضل کرنیوالا ہے ولیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۲۴۴﴾

جائز نہیں اس مسئلہ پر الزام دیسکتے ہیں، الزام کی بنا یہ ہے کہ یہ مسئلہ رحم و محبت و ہمدردی کے برخلاف ہے، جان ملٹن نے اس سے اختلاف کیا ہے اور نہایت عمدہ دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ جب شوہر و جورو میں ایسی ناموافقت ہو جاوے جو تمدن و حسن معاشرت کے منافی ہو تو انجیل کے احکام کے رو سے طلاق نا جائز نہیں ہے *

بہرحال اس وقت تین شریعتیں طلاق کے معاملہ میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اول یہودیوں کی جس میں بغیر کسی سبب قوی کے مرد کو طلاق دینا جائز قرار دیا گیا ہے اور ایسا کرنے میں کوئی گناہ یا الزام مرد پر عائد نہیں کیا گیا۔ بلاشبہ یہ شریعت ایک ناپسندیدہ شریعت ہے اور رحم و محبت اور حسن معاشرت و تمدن کے برخلاف ہے، ایسی شریعت سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ دوم بُت پرستوں اور حال کے زمانہ کے عیسائیوں کی جن میں طلاق جائز نہیں یا بجز زنا کے اور کسی حالت میں جائز نہیں۔ اس شریعت میں اس مقدس رسم کا بلاشبہ نہایت ادب کیا گیا ہے، مگر جس طرح کہ یہودی شریعت میں افراط تھی اُسی طرح اس شریعت میں تفریط ہے اور دونوں فطرت انسانی کے برخلاف ہیں، اگر کسی سبب و حالت سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جاویں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو اُن کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے، اور وہ علاج طلاق ہے، پس کچھ شک نہیں کہ ایسی حالت میں بھی طلاق کا جائز نہ ہونا حسن معاشرت اور انسانی فطرت کے برخلاف ہے۔ تیسری شریعت محمدیہ ہے جس کا ذکر اس آیت اور اُس کے بعد کی آیتوں میں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نصیحتوں اور ہدایتوں میں ہے۔ اس شریعت حقہ نے اس

[1] موتوا بحذر کم الموت او موتوا بحسبکم و بحذرکم من الحرب کما قال اللہ تعالیٰ فی سورۃ آل عمران قل موتوا بغیظکم * سید احمد

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۴۵) مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۴۶) أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۲۴۷)

اور لڑو (اے ایمان والو) اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بیشک اللہ سننے والا ہے جاننے والا (۲۴۵) کون وہ شخص ہے جو قرض دے اللہ کو قرض نیک پھر دوگنا کر دے اُس کو اُس کے لئے دوگنا کرنا بہت دفعہ اور اللہ تنگی کرتا ہے اور فراخی کرتا ہے اور اُسی کی طرف رجوع کئے جاؤ گے (۲۴۶) کیا تو نے بنی اسرائیل کے اُس گروہ کو نہیں دیکھا جو موسیٰ کے بعد ہوئے (یعنی امت شموئیل پیغمبر) جب کہ اُنہوں نے اپنے نبی کو کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر تا کہ ہم خدا کی راہ میں لڑیں (یعنی جالوت سے) نبی نے کہا کہ کیا تم ایسے نہیں معلوم ہوتے کہ اگر تم پر لڑائی لکھی جاوے تو تم نہ لڑو گے اُنہوں نے کہا کہ کیوں نہ ہم لڑیں گے اللہ کی راہ میں حالانکہ بیشک ہم خارج کئے گئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے پھر جب اُن پر لڑائی لکھی گئی تو پھر گئے بجز تھوڑوں کے اُن میں سے اور اللہ جانتا ہے ظالموں کو (۲۴۷)

خوبی اور اس اعتدال سے اِس مسئلہ کو قرار دیا ہے جس سے زیادہ عمدہ نہیں ہو سکتا، اور نہ جس سے زیادہ تمدن اور حسن معاشرت کی حفاظت انسانی فطرت کے مطابق ہو سکتی ہے شریعتِ محمدیہ نے طلاق کو بھی حالت میں جائز قرار دیا ہے جب کہ زن و شوہر میں مرض ناموافقت و عدم محبت کا ایسے درجہ پر پہنچ جاوے جو علاج کے قابل نہ ہو، یا یوں کہو کہ بجز طلاق کے دوسرا کوئی علاج اُس کا نہ ہو۔ مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا راز کا اور ایک عجیب قسم کے اتحاد و اختلاط کا ہے کہ اُس میں جو خرابی پیدا ہو سوائے اُنہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں یا نہیں، اس لئے اس شریعت حقہ کے بانی نے اُس حد کی تعیین اُنہی کی رائے اور اُنہی کی طبیعت پر منحصر کی ہے، اور اُسی کے اخلاق کو اُس کا قاضی بنایا ہے۔ جس کی تسلی و موانست کے لئے ابتدا میں

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۸) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۴۹)

اور اُن سے کہا اُن کے نبی نے کہ بیشک اللہ نے ٹھیک تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے اُنھوں نے کہا کیونکر اُس کی ہم پر بادشاہی ہوگی حالانکہ ہم اُس سے بادشاہی کے زیادہ مستحق ہیں اور نہ اُس کو کچھ دولت کی فراخی دیگئی ہے اُن کے نبی نے کہا کہ بیشک اللہ نے اُسی کو تم پر منتخب کیا ہے، اور اُس کو علم اور جسم میں فراخی دی ہے اور اللہ دیتا ہے اپنا ملک جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت دینے والا ہے جاننے والا (۲۴۸) اور اُن کو اُن کے نبی نے کہا کہ بیشک اُس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس صندوق جس میں ایک تسکین ہے تمہارے پروردگار سے اور (جس میں) اُس چیز کا بقیہ ہے جو آل موسیٰ اور آل ہارون نے چھوڑا ہے آجاویگا، اُٹھالاوینگے اُس کو فرشتے بیشک اس میں البتہ نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو (۲۴۹)

عورت بطور انیسِ دلنواز اور مونس و غمگسار کے پیدا ہوئی تھی، اور اس بات کا کہ وہ علاج بے محل و بے موقع بداخلاقی اور بد خواہش نفسانی سے نہ کیا جاوے جہاں تک کہ انسانی فطرت کے مناسب حال تھا ارشاد کیا ہے۔ مردوں کو فہمایش کی ہے کہ ہمیشہ عورتوں کے ساتھ محبت رکھیں، اور اُن کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں، اُن کی سختی و بدمزاجی کو تحمل سے برداشت کریں۔ عورتوں کو فہمائش کی کہ اپنے مردوں کی تابعداری کریں، اُن کے ساتھ محبت رکھیں، اُن کی وفادار رہوں۔ پھر طلاق کی نسبت فرمایا کہ گو طلاق جائز کی گئی ہے مگر کوئی چیز زمین کے پردہ پر طلاق سے زیادہ خدا کو غصہ دلانے والی پیدا نہیں ہوئی۔ عورت کی نسبت فرمایا کہ جو عورت بغیر لاعلاج ضرورت کے اور بغیر سخت حالت کے اپنے شوہر سے طلاق کی خواہاں ہو اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ہمارے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم طلاق سے ایسے ناراض ہوتے تھے کہ بعض فقہ صحابہ کو شبہ ہوا کہ طلاق دینے والے نے ایسا جرم کیا ہے کہ قتل کرنے کے قابل ہے۔ پھر ان ہدایتوں اور تہدیدوں ہی پر طلاق کے روکنے میں

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۵۰﴾

پھر جب آگے بڑھ گیا طالوت اپنے لشکر سمیت تو اُس نے کہا بیشک اللہ تم کو مبتلا کریگا ساتھ ایک نہر کے پھر جو کہ پی لے اُس سے تو وہ مجھ سے (یعنی میرے گروہ سے) نہیں ہے اور جو کوئی اُس کو نہ چکھے تو بیشک وہ مجھ سے (یعنی میرے گروہ سے) ہے مگر (پینے والوں میں سے) جس نے بھر لیا ایک چلّو اپنے ہاتھ سے (وہ پہلے حکم میں داخل نہیں ہے) پھر پی لیا لوگوں نے اُس میں سے مگر اُن میں سے تھوڑوں نے (نہیں پیا) پھر جب کہ وہ اور وہ لوگ جو اُس پر ایمان لائے تھے اُس کے پار ہوئے تو بولے کہ ہم کو آج کے دن جالوت اور اُس کے لشکروں کے (مقابلہ کی) طاقت نہیں ہے، اُن لوگوں نے کہا کہ جو جانتے تھے کہ بیشک وہ خدا سے ملینگے، بہت ہوا ہے کہ چھوٹا گروہ غالب ہوا ہے بڑے گروہ پر خدا کی مرضی سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۲۵﴾

بس نہیں کیا، بلکہ نکاح اور ملاپ کے قائم رکھنے کی اور بھی تدبیریں فرمائیں، یعنی پوری تفریق واقع ہونے کو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہے، اور یہ اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جاوے اور رنجش مٹ جاوے اور دونوں کی محبت تازہ ہو جاوے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں، دوسری طلاق کے بعد بھی اسی طرح وہ آپس میں بدستور جورو خصم ہو سکتے ہیں، لیکن اگر تیسری دفعہ طلاق دیجاوے تو ثابت ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں بہتر ہے کہ پوری تفریق ہو جاوے، ایسی حالت میں کہ عورت کو مرد سے کنارہ کش رہنا پڑتا ہے طلاق دینے کو منع فرمایا اس امید پر کہ شاید زمانہ مقاربت میں محبت والفت کی ایسی تحریک ہو کہ خیال طلاق کا دل سے جاتا رہے، پس یہ تمام احکام نہایت خوبی و عمدگی و اعتدال سے فطرت انسانی کے مطابق ہیں، خدا نے اُن احکام کی نسبت فرمایا کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں ان کو توڑنا نہیں چاہیئے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ حدیں کچھ دیواریں یا خندقیں نہیں ہیں بلکہ یہ حدیں فطرت انسانی کی حدیں ہیں جن کو توڑنا انسانیت کی حد سے خارج ہونا ہے۔ پس جو لوگ مسئلہ طلاق پر معترض ہیں جب وہ اُس کو

ترجمہ	آیت
اور جب سامنے ہوا جالوت اور اُس کے لشکر تو اُنہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے لوں میں) صبر ڈال اور قائم رکھ ہمارے قدم اور مدد کر ہماری کافروں کی قوم پر (۲۵۱)	وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ (۲۵۱)

بخوبی سمجھینگے اور فطرت انسانی پر غور کرینگے تو بالیقین جانینگے کہ بلاشبہ یہ حکم اُسی کا حکم ہے جس نے فطرت انسانی کو بنایا ہے ❖

(۲۴۴) (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا) اس آیت سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کن لوگوں کا ذکر ہے مفسرین نے لفظ ،، مُوْتُوْا ،، اور لفظ ،، احیا ،، سے یہ قیاس کیا کہ یہ لوگ حزقیل نبی کے وقت میں تھے، حزقیل نبی کا ایک قصہ مُردوں کی ہڈیوں کے دیکھنے اور پھر اُن کے زندہ ہونے کا حزقیل نبی کی کتاب میں مندرج ہے، ہمارے ہاں کے مفسروں نے صرف اُن دو لفظوں سے ایک قصہ مثل قصہ حزقیل بنا لیا ہے جو محض غلط ہے اور ،، حذر الموت ،، کے لفظ سے اُنہوں نے وباء سے اُن لوگوں کا اپنا ملک چھوڑ کر چلا جانا قرار دیا ہے مگر اس تفسیر کی کوئی سند نہیں ہے صرف اُسی غلط خیال پر یہ تفسیر بیان کی ہے ❖

حذر الموت کے لفظ سے بسبب وبا کے اُن لوگوں کا ملک سے چلا جانا ایک نہایت غلط قیاس ہے کیونکہ اسی مقام پر خدا نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے لڑنے کی ترغیب دی ہے اور اس لیئے لڑائی میں مارے جانے کے خوف سے اُن لوگوں کا ملک کو چھوڑ کر چلا جانا مراد ہو سکتا ہے نہ کہ وبا کے ڈر سے ❖

موت اور احیا کے حقیقی معنی بھی یہاں مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ آیت میں کوئی اشارہ اِس بات کا کہ یہ امر معجزہ سے ہُوا تھا اور کیا محل معجزہ دکھانے کا تھا اور کس پیغمبر نے دکھایا تھا اور کس کو دکھایا تھا مذکور نہیں ہے، اور چونکہ یہ الفاظ موقع جنگ میں واقع ہیں اس لیے موت سے اُن لوگوں کی نامردی اور بُزدلاپن مراد ہے جو لڑائی میں موت کے ڈر سے ملک چھوڑ گئے تھے، جیسے کہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ اگر یہ بات نہیں کرتے تو اچھا مرو یعنی مصیبت میں پڑے رہو، خدا نے اور جگہ بھی موت کے لفظ کو اُنہی معنوں میں استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ،، قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ،، یعنی اپنے غصہ میں مرو یعنی تباہ و خستہ دل رہو، اور احیا کے لفظ سے اُن کے دل میں قوت آنا اور لڑنے پر آمادہ ہونا اور دشمن کو شکست دینے پر قادر ہونا مُراد ہے، اور اسی تمثیل پر مسلمانوں کو دوسری آیت میں دشمنوں سے لڑنے اور دل کو مضبوط رکھنے کی ترغیب دی ہے، پس موت و احیا سے حقیقی موت و زندگی سمجھنا اور تمام قصہ کو حزقیل نبی کے فرضی قصہ پر جو حزقیل کی کتاب میں ہے محمول کرنا بہت بڑی غلطی ہے ❖

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۲﴾	پھر اُنہوں نے اُن کو اللہ کی مدد سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے اُس کو بادشاہی اور حکمت عطا کی اور اُس کو جو کچھ وہ چاہتا تھا سکھایا اور اگر اللہ کا دفع کرنا آدمیوں کو بعض آدمیوں کا بعض سے نہ ہوتا تو تباہ ہو جاتی زمین (یعنی ملک) ولیکن اللہ فضل کرنے والا ہے عالموں پر ﴿۲۵۲﴾

بلاشبہ جب کہ قرآن مجید میں اُن لوگوں کا زیادہ حال بیان نہیں ہؤا ہے تو مفسر کا صرف یہ کام ہے کہ تاریخی گذشتہ واقعات پر خیال کرے اور دیکھے کہ کون سے تاریخی واقعہ سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے اور کوئی قرینہ اُس واقعہ سے آیت کے متعلق کرنے کا ہے یا نہیں اور اس طرح آیت کا تعلق اُس واقعہ سے قرار دے۔ اس مقام پر قرآن مجید میں اُن واقعات کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل اور مدیانیوں اور فلسطینیوں میں واقع ہوئے تھے اور اس لئے قیاس کرنے کو صریح موقع ہے کہ اس آیت میں بھی اُنہی واقعات میں سے کسی واقعہ کا ذکر ہے ✦

مدیانیوں کے ہاتھ[1] سے بنی اسرائیل نے سخت شکست پائی تھی اور اپنا گھر چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگ گئے تھے اور سات برس تک اُن پر یہ مصیبت رہی، پھر جدعون نبی اُن میں مبعوث ہوئے اور اُنہوں نے اُن کو لڑائی پر ترغیب دی اور اُن کا دل مضبوط کیا اور مدیانیوں پر اُنہوں نے فتح پائی۔ پس خدا تعالےٰ نے مسلمانوں کو بتایا کہ جو لوگ لڑائی میں موت کے ڈر سے بھلگے وہ ایسی بدتر حالت کو جو مرنے کے برابر ہے پہنچ گئے تھے، پھر اللہ نے اُن کو ہمت وجرأت سے زندہ کیا اور فتحمند وخوشحال ہوئے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی موت کے ڈر سے بزدلی نامردی جو موت کے برابر ہے اختیار کرنی نہیں چاہئے۔ بلکہ اپنے دشمنوں سے لڑنا اور بہادری و دلیری و استقلال کو کام میں لانا چاہئے ✦

(۲۷) (اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ) اس آیت سے لغایت آیت ۲۹۲ طالوت وجالوت کی لڑائیوں کا ذکر ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ بنی اسرائیل میں شموئیل نبی تھے اور ان آیتوں میں پانچ واقعوں کا بیان ہے ✦

(۱) بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے درخواست کرنا کہ اُن پر کوئی بادشاہ مقرر کرے ✦

(۲) شموئیل نبی کا بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہ مقرر کرنا ✦

---

[1] دیکھو توریت میں کتاب قضاۃ باب ششم ✦

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۳﴾ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۵﴾

یہ نشانیاں ہیں اللہ کی ہم اُنہیں تجھ کو پڑھ سُناتے ہیں برحق اور بیشک تو رسولوں میں سے ہے ﴿۲۵۳﴾ یہ رسول ہیں فضیلت دی ہم نے اُن میں بعض کو بعض پر، اُن میں سے وہ ہے جس سے خدا نے کلام کیا اور اُن میں بعضوں کے درجے بلند کئے، اور دیں ہم نے عیسٰی مریم کے بیٹے کو نشانیاں، اور ہم نے اس کی مدد کی ساتھ روح قدس کے، اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑمرتے وہ لوگ جو اُن کے بعد ہوئے بعد اُس کے کہ اُن کے پاس نشانیاں بھی آئیں ولیکن اُنہوں نے اختلاف کیا پھر اُن میں سے بعض وہ ہے جو ایمان لایا اور اُن میں سے بعض وہ ہے جو کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑمرتے ولیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۲۵۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو خرچ کرو اُس چیز میں سے جو ہم نے تم کو دی ہے قبل اس کے کہ آوے وہ دن کہ اُس میں نہ بیچنا ہے اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر وہی ظالم ہیں ﴿۲۵۵﴾

(۳) تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد میں بنی اسرائیل کے پاس آجانا *

(۴) طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی سے منع ہونا *

(۵) فلسطینیوں کا شکست پانا اور جالوت کا داؤد کے ہاتھ سے مارا جانا *

یہ تمام واقعات توریت کی کتاب شموئیل میں مندرج ہیں مگر تیسرے اور چوتھے واقعہ میں کسی قدر اختلاف ہے یعنی کتاب شموئیل میں تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد سے پہلے آجانا لکھا ہے اور قرآن مجید میں طالوت کے عہد میں اور اس پر عیسائی مورخوں نے اعتراض کیا ہے کہ غلطی سے ماقبل کے قصے کو مابعد کے واقعے میں شامل کردیا ہے *

کتاب شموئیل سے پایا جاتا ہے کہ تابوت سکینہ بمقام شیلوہ تھا جہاں عیلی بنی اسرائیل پر

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـــــُٔـــوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَھُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۲۵۶)	اللہ، نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے زندہ ہے ہمیشہ قائم رہنے والا، نہ گھیرتی ہے اُس کو اونگھ اور نہ نیند اُسی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے وہ شخص جو شفاعت کرے اُس کے پاس مگر اُس کی مرضی سے جانتا ہے جو کچھ اُنکے آگے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے، اور وہ نہیں پا سکتے کچھ بھی اُس کے علم سے بجز اُس کے جو وہ چاہے، گھیر لیا اُس کی بادشاہت نے آسمانوں کو اور زمین کو اور تھکاتی نہیں اُس کو اُن کی نگہبانی اور وہ اعلےٰ ہے بہت بڑا (۲۵۶)

حاکم تھا اُس کے عہد میں بنی اسرائیل اور فلسطینیوں میں بمقام ابن عیزر لڑائی ہوئی اور بنی اسرائیل کی شکست ہوئی (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۴ ورس ۲) تب بنی اسرائیل نے تابوت سکینہ کو شیلوہ سے لشکر گاہ میں منگایا اور دوبارہ لڑے اور شکست عظیم ہوئی اور عیلی کے دونوں بیٹے مارے گئے اور تابوت سکینہ کو فلسطینی چھین لے گئے (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۴ ورس ۱۰ و ۱۱) عیلی بھی یہ خبر سُنکر کرسی پر سے گر پڑا اور مر گیا اُس زمانہ میں شموئیل نبی ہو چکے تھے مگر اُن کی عمر چھوٹی تھی ✦

فلسطینی تابوت سکینہ کو مقام ابن عیزر سے جہاں سے اُنہوں نے فتح کیا تھا بمقام اشدود لے گئے اور داگون بُت کے مندر میں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۵ ورس ا لغایت ۵) پھر وہاں سے بمقام گت لے گئے (دیکھو کتاب مذکور ورس ۸) پھر وہاں سے بمقام عقرون لے گئے (دیکھو کتاب مذکور ورس ۱۰) اُس کے بعد فلسطینیوں نے ایک گاڑی میں دو گایوں کو جوت کر اور تابوت سکینہ کو اُس پر رکھ کر جنگل میں چھوڑ دیا اور وہ گائیں اُس کو لے کر بمقام بیت الشمس چلی آئیں اور یوشع کے کھیت میں جا کھڑی ہوئیں اُس سے تابوت اُتار لیا۔ اور اپنے ہاں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۶) کتاب شموئیل میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کی شکست ہونے اور تابوت چھین لیجانے کے سات مہینہ بعد ہوا ✦

اس کے بعد تابوت سکینہ قریات یعاریم میں آیا اور ابیناداب کے گھر میں بمقام گبعاہ رکھا گیا (دیکھو کتاب شموئیل باب ۷ ورس ۱) مگر کتاب شموئیل میں نہیں لکھا کہ بیت الشمس میں کس قدر مدت رہا، عیسائی مورخوں کے نزدیک ۱۱۴۱ قبل مسیح کے تابوت سکینہ فلسطینیوں نے چھین لیا تھا اور ۱۱۴۰ میں قریات یعاریم میں آ گیا وہاں آنے کے بیس برس بعد یہودیوں

ترجمہ	آیت
کچھ زبردستی نہیں ہے دین میں بلاشبہ ظاہر ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے پھر جو کوئی منکر ہو غیر خدا کی پرستش کا اور ایمان لاوے اللہ پر تو بیشک اُس نے پکڑ لیا مضبوط ذریعہ جس کے لئے ٹوٹنا نہیں ہے اور اللہ سننے والا ہے جاننے والا (۲۵۷)	لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (۲۵۷)

نے بتوں کی عبادت شموئیل نبی کی فہمائش سے موقوف کی اور خدا کی پرستش اختیار کی (دیکھو کتاب شموئیل ا باب ۷ ورس ۱ و ۲) اور بنی اسرائیل سے شموئیل کی سرداری میں ایک لڑائی فلسطینیوں سے ہوئی اور فلسطینیوں نے شکست کھائی۔ جب شموئیل ضعیف ہوئے تب بنی اسرائیل نے کسی بادشاہ کے مقرر کرنے کو کہا اور طالوت کو ۱۰۹۵ قبل مسیح میں بادشاہ کیا ❖

کتاب شموئیل میں طالوت یعنی شاؤل اور جالوت کی لڑائی اور اُس کے مارے جانے کا ذکر ہے مگر طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب قضاۃ باب ہفتم میں جدعون کے لشکر کو ایک چشمہ کے پانی پینے سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ ۱۲۴۹ قبل مسیح کے ہوا تھا اس لئے عیسائی مورخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے ❖

ان دونوں اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے لئے جو مخالفت کتاب شموئیل پر مبنی ہیں ضرور ہے کہ کتاب شموئیل میں جو واقعات اور جو ترتیب اُن واقعات کی ہے اُن کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور یہ بات بھی مان لی جاوے کہ کوئی واقعہ طالوت کے لشکر کا ایسا نہیں ہے جو کتاب شموئیل میں لکھنے سے رہ گیا ہو حالانکہ خود عیسائی مورخ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ شموئیل کی کتابوں کے مضامین میں باہم اختلاف ہے۔ کتاب اول شموئیل باب ۱۶ ورس ۲۱ و ۲۲ سے ظاہر ہے کہ طالوت داؤد سے اور اُس کے باپ یشی سے بخوبی واقف تھا، داؤد کو اُس کے باپ کے پاس سے بلایا تھا اور اپنا سلحدار کیا تھا، اُسی کتاب کے باب ہفدہم ورس ۱۵ سے ظاہر ہے کہ داؤد طالوت سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ لڑائی کے ہنگامہ میں جب داؤد اپنے بھائیوں کی خبر لینے آیا تو داؤد نے کہا کہ جالوت سے میں لڑونگا، یہ خبر سن کر طالوت نے داؤد کو بلایا اور گفتگو کے بعد لڑنے کی اجازت دی اور اپنی زرہ و خود و تلوار بھی دی جس کو داؤد نے لے کر پھر دیدیا (دیکھو کتاب اول شموئیل باب ۱۷ ورس ۳۱ لغایت ۳۹) مگر اُسی باب کے ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ جب داؤد لڑنے کو بڑھا تو طالوت نے اپنے لشکر کے سردار سے پوچھا کہ یہ جوان کس کا بیٹا ہے اور ورس ۵۸ میں لکھا ہے کہ جب داؤد نے جالوت کا سر کاٹ لیا اور طالوت کے پاس لے آیا تو طالوت نے پوچھا کہ تو کس کا بیٹا ہے۔ پس ان آیتوں سے

اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ﴿۲۵۸﴾ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوۡتُ یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵۹﴾	اللہ دوست ہے اُن کا جو ایمان لائے ہیں اُن کو نکالتا ہے اندھیرے سے اُجالے میں (۲۵۸) اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے دوست خدا کے سوا وہ ہیں جن کی وہ پرستش کرتے ہیں وہ اُن کو نکالتے ہیں اُجالے سے اندھیرے میں وہی لوگ آگ میں پڑنے والے ہیں وہی اس میں ہمیشہ رہینگے (۲۵۹)

معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک طالوت داؤد سے مطلق واقف نہ تھا۔

اِس اختلاف کے سبب خود عیسائی مورخوں کی یہ رائے ہے کہ کتاب شموئیل میں قصہ اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے جالوت کی لڑائی کے بعد داؤد طالوت کا مصاحب اور سلح دار ہوا ہے۔ اس پر بھی اختلاف رفع نہیں ہوتا کیونکہ سولھویں باب سے داؤد کی پہلی دفعہ بطور مطرب بربط نواز کے طالوت سے ملاقات ہونی پائی جاتی ہے۔

متقدمین علمائے عیسائی نے خیال کیا ہے کہ باب ہفتدہم کتاب اوّل شموئیل کے ورس ۱۱ لغایت ۳۱ ورس ۵۵ لغایت ۵۸ و باب ہیجدہم کے ورس ۱ لغایت ۵ صحیح نہیں ہیں اور اُن کو خارج کر دیا ہے چنانچہ سپٹواجینٹ کے قلمی نسخہ ویٹیکن میں وہ آیتیں نہیں ہیں اور اگر وہ آیتیں نکال ڈالی جاویں تب بھی اور آیتوں میں جیسے کہ باب ۱۶ کے ورس ۱۸ لغایت ۲۱ و باب ۱۷ کے ورس ۳۳ لغایت ۳۸ کی مطابقت ہی نہیں ہو سکتی۔ انہی اختلاف کے سبب بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ سارے کا سارا سترھواں باب الحاقی و نامعتبر ہے جان کیٹو نے اپنی کتاب سیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیونکہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا اُنھوں نے باقی حصّوں میں بھی تصرف کیا ہو"۔

علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ شموئیل کی کتابیں کب لکھی گئیں اور کس نے لکھی ہیں، یہودی اور بڑے بڑے عیسائی عالم خیال کرتے ہیں کہ شموئیل کی کتاب کا بڑا حصہ یا پہلے چوبیس باب شموئیل کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی ناثان نبی و گید نبی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ابربانیل اور گروشس خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کتابیں یرمیاہ نبی نے لکھی ہیں، جان کی یہ رائے ہے کہ یہ کتابیں شموئیل کے بہت زمانہ بعد یعنی قید بابل کے تیسویں سال میں لکھی گئی ہیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو واقعات کا اُلٹ پلٹ ہو جانا یا بعض واقعات کا تحریر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آسکتا ہے۔

لہ احیاء العلوم۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۶۰﴾	کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا (یعنی اُس کا حال نہیں جانا) جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اُس کے پروردگار میں کیونکہ اللہ نے اُس کو بادشاہت دی تھی جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اُس نے (یعنی نمرود نے) کہا کہ میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم نے کہا کہ بیشک اللہ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے پھر تو اُس کو مغرب سے نکال بھر دنگ رہ گیا وہ شخص جو کافر تھا اور اللہ نہیں ہدایت کرتا ظالم لوگوں کو ﴿۲۶۰﴾

ہماری غرض اِس بحث سے شموئیل کی کتابوں پر جرح و قدح کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہ سے کہ شموئیل کی کتابوں سے بیان میں مختلف ہے اعتراض نہیں ہو سکتا جب تک کہ اور طرح پر اُس کی غلطی ثابت نہ کی جاوے ✤

میں یہ نہیں چاہتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی صحت پر کسی کو اس وجہ پر مجبور کردوں کہ قرآن میں لکھا ہے، بلکہ میں دونوں واقعوں پر جو قرآن و کتاب شموئیل میں مندرج ہیں بطور ایک نکتہ چین مورخ کے غور کرنا اور اُس نکتہ چینی سے دونوں قولوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہتا ہوں ✤

تابوت سکینہ کو فلسطینی فتح کر کے چھین لے گئے تھے، کتاب شموئیل میں اُس کا واپس بھیج دینا ایسے عجیب اور کراماتی واقعوں پر مبنی کیا ہے جس کو کوئی آزاد رائے کا مورخ جو واقعات کو انسانوں کے حالات اور افعال کا نتیجہ سمجھتا ہے تسلیم نہیں کر سکتا۔ لڑائی کی شکست ہونے کے بعد بنی اسرائیل نہایت ضعیف ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ اُنھوں نے پھر قوت حاصل کی تھی، تابوت سکینہ کا دشمنوں کے ہاتھ میں چلا جانا بلاشبہ اُن کو نہایت رنج دیتا ہوگا اور اُن کی نہایت آرزو یہ ہوگی کہ یہ وہ اُس کو پھر اپنے دشمنوں سے واپس لیں ✤

اِس شکست کے بیس برس بعد وہ فلسطینیوں سے پھر لڑے اور فلسطینیوں نے شکست پائی جس سے معلوم ہوتا ہے فلسطینی کمزور ہو گئے تھے فلسطینی خوب جانتے ہونگے کہ بنی اسرائیل جب تک کہ تابوت سکینہ اُن کے نہ ہاتھ لگے لڑائی سے باز نہیں آنے کے۔ اس عرصہ میں بنی اسرائیل کو زیادہ قوت ہوگئی اور شموئیل نبی نے تمام فرقوں کو جو عیلی کے مرنے کے بعد متفرق ہو گئے اکٹھا کر لیا اور طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور یہ امر بنی اسرائیل کی زیادہ قوت کا اور فلسطینیوں کو جو کمزور ہو نے جانے

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶۱) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۶۲)

یا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اُس کا حال نہیں جانا جس نے رُویا میں دیکھا) کہ گویا وہ گذرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ سر کے بل گرا ہوا تھا اُس نے کہا کہ کیونکر زندہ کریگا (یعنی آباد کریگا) اللہ اُس کو اُس کے مرجانے کے (یعنی ویران ہونے کے) بعد پھر اللہ نے اُس کو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اُس کو اُٹھایا خدا نے کہا کتنی دیر تک تو پڑا رہا اُس نے کہا کہ میں پڑا رہا ایک دن یا کچھ کم ایک دن کہا بلکہ تو پڑا رہا سو برس پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے پینے کو (کیا) وہ نہیں بگڑا ہے اور دیکھ اپنے گدھے کو (کیا وہ) نہیں گل گیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو ایک نشانی آدمیوں کے لئے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کس طرح ہم اُن کو حرکت دیتے ہیں پھر اُن کو گوشت پہناتے ہیں پھر جب اُس کو (یہ بات) ظاہر ہوئی اُس نے کہا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۲۶۱) اور جب کہا ابراہیم نے (خواب میں) اے پروردگار مجھ کو دکھا کہ کس طرح تو زندہ کریگا مردوں کو خدا نے کہا کیا تو یقین نہیں کرتا ابراہیم نے کہا کیوں نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہوجاوے خدا نے کہا کہ لے چار پرندوں کو پھر اُن کے ٹکڑے اپنے پاس کر ڈال پھر رکھدے ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ٹکڑا پھر اُن کو بُلا تیرے پاس چلے آئینگے دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا (۲۶۲)

تھے زیادہ خوف کا باعث ہوا ہوگا اُنہوں نے سمجھا ہوگا کہ اگر تابوت سکینہ واپس کر دیا جاوے تو شاید مصیبت جنگ سے حفاظت ہوجاوے انہوں نے جا بجا اُس کو منتقل کیا اور آخرکار ایک گاڑی میں لاد کر مع نذر و تحائف کے بیت الشمس کی سرحد میں جو بنی اسرائیل کا ایک شہر فلسطینیوں کی سرحد سے ملا ہوا تھا چھوڑ آئے ، اور اس تمام اصلی واقعہ پر خیال کرنے سے اس بات کو کہ تابوت سکینہ طالوت کے عہد میں

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۴﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۵﴾

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنا مال خدا کی راہ میں مانند مثال ایک دانہ کی ہے جو اُگا لے سات بالیں ہر بال میں سو دانے اور اللہ دو چند کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا ہے جاننے والا ﴿۲۶۳﴾ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کی راہ میں پھر جو کچھ کہ اُنہوں نے خرچ کیا ہے اُس کا پیچھا نہیں کرتے احسان جتا کر اور نہ (نمائش سے) رنج دیکر، اُن کے لئے اُن کا بدلا ہے اُن کے پروردگار کے پاس اور نہ اُن پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے ﴿۲۶۴﴾ بات اچھی کہنی اور معاف کرنا بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے پیچھے رنج دینا ہو اور اللہ غنی ہے بردبار ﴿۲۶۵﴾

آیا ہو گا جیسا کہ قرآن میں مندرج ہے زیادہ ترجیح ہوتی ہے ✦

دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کی نسبت اول ہم کو خیال کرنا چاہئیے کہ جہاں طالوت و جالوت میں لڑائی ہوئی تھی وہ کیا مقام تھا، فلسطینی مقام سوکوہ و عزیقاہ و آفس دمیم میں جمع ہوئے تھے اور بنی اسرائیل وادئ ایلاہ میں، دونوں لشکروں کے درمیان دریائے شورق واقع تھا فلسطینی اُس کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب جنوب تھے اور بنی اسرائیل اُس کے دائیں کنارہ پر یعنی جانب شمال تھے اور بنی اسرائیل نے دریا کو عبور کر کے فلسطینیوں پر حملہ کیا تھا پس قرآن مجید کے ان لفظوں کی کہ "اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ" جغرافیہ اور تاریخ سے بخوبی تصدیق ہوتی ہے ✦

باقی رہا اُس کے پانی پینے سے منع کرنا۔ ہر شخص جو لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فوج کشی کرتی ہے تو ہر ایک شخص اُس کی قوم کا بہادر اور بےبہادر دل چلا اور دل کا بودا قومی لحاظ سے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے لیکن جب وقت حملہ کرنے کا آتا ہے تو سپہ سالار ایک طریقہ ایسے لوگوں کے انتخاب کرنے کا مقرر کرتا ہے جس کے سبب حملہ میں وہی لوگ شریک ہیں جو نہایت بہادر اور دل چلے ہوں اور درحقیقت اپنے دلی جوش سے لڑائی میں شریک ہوئے ہوں ✦

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶۶)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ ملیا میل کرو اپنی خیراتوں کو احسان جتانے سے اور رنج دینے سے اُس شخص کی مانند جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھلاوے کو اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور اخیر دن پر تو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر جس پر کچھ مٹی ہو پھر پڑے اُس پر زور کا مینہ اور چھوڑ جائے اُس کو صفاچٹ، وہ کسی چیز پر جو اُنھوں نے کمائی ہے قدرت نہیں رکھتے اور اللہ ہدایت نہیں کرتا کافروں کی قوم کو (۲۶۶)

جب جدعون نے مدیانیوں پر فوج کشی کی تھی تو اُس نے حملہ کے وقت یہ قرار دیا تھا کہ جو شخص اُس چشمہ سے جو اُس کے لشکر کے پاس تھا پانی پی لے وہ حملہ میں شریک نہ ہو اور جو نہ پیئے بلکہ صرف ہاتھ بھگو کے زبان کو تر کر لے وہ حملہ میں شریک رہے اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جن لوگوں کو لڑنے اور جان دینے میں تذبذب ہو وہ چھٹ جائیں اور جو بالکل لڑنے اور مرنے پر آمادہ ہوں وہ حملہ میں شریک رہیں *

اگرچہ شبہ ہے کہ جہاں جدعون کی مدیانیوں سے لڑائی ہوئی تھی وہاں کوئی چشمہ نہیں تھا اور اس لئے کتاب قضاۃ میں طالوت کا واقعہ جدعون کے قصہ سے ملا دیا ہے لیکن اگر اُس کو جدعون ہی کے وقت کا واقعہ تسلیم کر لیا جاوے تو طالوت کو یہ واقعہ ضرور معلوم ہوگا اور اتفاق سے طالوت کا لشکر بھی دریا کے کنارہ پر پڑا تھا اور دریا کے پار اُتر کر حملہ کرنا قرار پایا تھا ہر طرح پر یقین کرنے کا موقع ہے کہ طالوت نے بھی اُسی طریقہ پر اُن لوگوں کا جو حملہ میں دل سے شریک ہونے کو تھے انتخاب کرنا چاہا ہوگا اور وہی طریقہ انتخاب کا اختیار کیا ہوگا جو جدعون نے اختیار کیا تھا ــ

ہاں کتاب شموئیل میں اس انتخاب کا ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کتاب شموئیل میں اُس کا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ نہ ہوا ہو عیسائی مؤرخوں نے کج بحثی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید میں جدعون کے قصہ کو طالوت کے قصہ میں ملا دیا ہے پس یہ اعتراض کرنے والوں کی غلطی ہے۔ کیونکہ تمام واقعات کو خیال کرنے سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا تھا وہ علیحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ علیحدہ ہے۔ اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہو سکتا

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۶۷)

اور مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کی رضامندی چاہنے کو اور اپنے دلی اعتقاد سے مانند مثال ایک باغ کی ہے جو بلندی پر ہو پڑے اُس پر زور کا مینہ پھر اپنے پھل دوچند لاوے اور اگر اُس پر زور کا مینہ نہ پڑے تو شبنم ہی اس کو کافی ہے اور اللہ اُس چیز کو جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے (۲۶۷)

کہ اُس زمانہ کے یہود جب قرآن مجید نازل ہوا اس واقعہ کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونے کا یقین رکھتے تھے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُنہی کے مقابلہ میں قرآن مجید میں علانیہ ایسا بیان نہیں ہوسکتا تھا ✤

آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہے نہایت صاف ہیں صرف ایک مقام تفسیر کے قابل ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "طالوت کے عہد سلطنت میں تابوت سکینہ کو فرشتے اُٹھا لاوینگے"، "تحملہ الملائکۃ" جالوت نے جب لڑائی میں مغلوب ہونے کے ڈر سے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے ملک میں بھیجدینا چاہا تو اُس کو بیلوں کی گاڑی پر لاد کر بنی اسرائیل کے ملک کی سرحد میں چھوڑوا دیا تھا یہ قصہ شموئیل کی کتاب میں ہے۔ ہمارے علمائے مفسرین نے کہدیا کہ اُن بیلوں کو جن پر کوئی ہنکنے والا نہ تھا فرشتے ہنکا لائے تھے اور یہی معنی "تحملہ الملائکہ" کے قرار دیدئیے بعض عالموں نے سمجھا کہ یہ معنی تو ٹھیک تحملہ کے لفظ کے چسپاں نہیں ہوتے اُنہوں نے یہ قیاس لگایا کہ موسیٰ کے بعد سے تابوت سکینہ کو دنیا سے اوپر فرشتے ادھر اُٹھائے ہوئے تھے پھر طالوت کو لا کر دیدیا، یہ سب غلط قیاسات ہیں آیت کا مطلب صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کے ہاتھ آنے کی بڑی خواہش تھی شموئیل پیغمبر نے جب طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو فرمایا کہ اُس کی بادشاہت میں تابوت سکینہ آجاویگا، اور چونکہ اُس کا ہاتھ آنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا اس لئے اُنہوں نے کہا کہ اُس کو فرشتے اُٹھا لاوینگے، جیسے کہ ایسے موقع پر بطور تقویت قلب کے بولا جاتا ہے ✤

(۲۶۱) (اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ) قبل اس کے کہ اس کی تفسیر بیان کی جاوے لفظ "کالذی" میں جو حرف کاف ہے اُس پر جو بحث ہے وہ بیان کرنی چاہئے علمائے نحو میں سے کسائی اور فرّا اور ابو علی فارسی کا یہ قول ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جہاں فرمایا ہے کہ "الم تر الی الذی حاجّ ابراھیم" وہاں بھی "الذی" کی جگہ "کالذی" مراد ہے اور پھر اس آیت میں جو "اَوْ كَالَّذِيْ" آیا ہے اُس کا عطف پہلی آیت کے معنوں پر ہے نہ لفظ پر۔ یہ بحث تو صرف

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ
مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ
وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ
فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۶۸﴾
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ
طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا
لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا
الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ ﴿۲۶۹﴾
وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ
تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ
اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۲۷﴾

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اُس کا ایک باغ ہو
کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اُن کے
نیچے نہریں اور اُس شخص کے لئے اُس باغ میں ہر طرح
کے میوے ہوں اور اُس شخص پر بوڑھاپا آگیا ہو
اور اُس کی اولاد ناتوان ہو پھر اُس باغ پر لُوکا جھونکا
آیا جس میں آگ تھی پس اُس نے جلادیا، اسی طرح بیان کرتا ہے
اللہ تمہارے لئے نشانیاں تاکہ تم فکر کرو ﴿۲۶۸﴾
اے لوگو جو ایمان لائے ہو خرچ کرو پاک کمائی میں
سے جو تم نے کمایا ہے اور اُس میں سے جو ہم نے
تمہارے لئے زمین میں سے نکالا ہے اور مت ارادہ
کرو کہ اُس میں سے خراب کو خرچ کرو ﴿۲۶۹﴾
اور تم بھی تو اُس خراب کو نہیں لیتے مگر یہ کہ چشم پوشی
کرو اُس میں اور جان لو کہ بیشک اللہ غنی ہے
تعریف کیا گیا ﴿۲۷﴾

سیاق عبارت سے اور ایک نحوی قاعدہ سے متعلق ہے، اِس بحث سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ
"الذی" پر کاف تشبیہ لانے سے جو یہ معنی ہو گئے ہیں کہ "اُس شخص کی مانند" تو مانند کے کہنے
سے کیا مطلب ہے۔ اخفش نے اِس بحث کو نہایت مختصر کر لیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہاں کاف
زائد ہے، مگر کاف زائد کے لانے کی اور اُس کے زائد ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی صاف
بات تھی کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ "کیا تو نے نہیں دیکھا اُس شخص کو جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا"
اور دوسری آیت میں فرمایا کہ "کیا تو نے نہیں دیکھا اُس شخص کو جو ایک قریہ میں گذرا" کہنے کی کیا حاجت
تھی۔ مبرد نحوی دوسری آیت میں چند لفظ محذوف مانتا ہے اور اُس کا قول ہے کہ تقدیر آیت کی
یوں ہے" والم تر الی من کان کالذی مرّ علی قریۃ" یعنی تو نے کیا نہیں دیکھا اُس شخص کو
جو تھا مثل اُس شخص کے جو ایک قریہ پر گذرا، مگر اِس سے بھی آیت کا مطلب نہیں کھلتا اور
یہی سوال باقی رہتا ہے کہ مثل اُس شخص سے کیا مطلب ہے +

صاحب بیضاوی نے غالباً اُن مشکلات کو خیال کیا ہے اور ایک اور قول بیان کرنے سے
اپنی دانست میں اس مشکل کو حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ "او کالذی مرّ علی قریۃ" حضرت ابراہیم
کا قول ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے، یعنی جب نمرود نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ "میں زندہ

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ
بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً
مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ (۲۷۱) يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ
مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ
اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۷۲) وَمَآ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ وَمَا
لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ اِنْ تُبْدُوا
الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ
اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ
سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۷۳)

شیطان تم کو وعدہ دیتا ہے محتاجی کا اور تم کو
حکم کرتا ہے بے حیائی کا اور اللہ تم کو وعدہ دیتا
ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا اور اللہ وسعت
والا ہے جاننے والا (۲۷۱) حکمت عطا کرتا ہے
جس کو چاہتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی تو
بیشک اُس کو بہت سی بھلائیاں عطا ہوئیں اور
نصیحت نہیں پکڑتے مگر عقل والے (۲۷۲) اور جو کچھ خرچ
کیا تم نے خرچ میں سے یا نذر مانی تم نے نذر ماننے
سے تو بیشک اللہ اُس کو جانتا ہے اور ظالموں کے
لئے کوئی مددگار نہیں ہے، اگر تم اپنی خیراتوں کو
ظاہر کرو تو یہ بھی اچھا ہے اگر تم ان کو چھپاؤ اور
اُن کو فقیروں کو دو تو وہ بھی تمہارے لئے اچھا
ہے اور دور کر دیگا تم سے تمہارے گناہوں میں سے اور اللہ
اُس چیز کو جو تم کرتے ہو جانتا ہے (۲۷۳)

کرتا ہوں" تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تو زندہ کرتا ہے تو اس طرح زندہ کر جس طرح کہ خدا نے اُس
شخص کو زندہ کیا تھا جو ایک قریہ پر گذرا تھا، اس تفسیر کے مطابق تقدیر آیت کی یہ ہوتی ہے کہ "اِن
کنت تحیی واحیی کاحیاء اللہ الذی مر علی قریۃ"۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لفظ کاف سے اُس
شخص کی مانند مراد نہیں بلکہ جس طرح وہ زندہ ہوا تھا اُس طرح زندہ کرنے کی مانند مراد ہے۔ اور پھر
قاضی بیضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو زندہ ہوا تھا یا تو عزیر تھے یا خضر تھے یا کوئی کافر
منکر بعث تھا۔ عزیر تو ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ کے بہت بعد ہوئے ہیں۔
اور یہ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب نے خضر سے مراد کس سے لی ہے اور یا قریہ خضر پر کب گذرا تھا۔ اور نہ یہ
معلوم کہ وہ کافر منکر بعث کون تھا رجماً بالغیب جو کچھ جی میں آیا یا سنا لکھ دیا، راوی کی روایت (گو
وہ کیسی ہی صریح البطلان ہو) تفسیروں میں قصوں کے لکھ دینے کو کافی ہے، پس یہ قول حضرت
ابراہیم کا کسی طرح نہیں ہو سکتا ❊

اگر قرآن مجید کا ٹھیک ٹھیک ادب کیا جاوے اور اس کو دیو پری کا قصہ نہ قرار دیا جاوے جیسے کہ
عجائب پسند مسلمان قرار دیتے ہیں تو آیت کے معنی نہایت صاف ہیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے
کہ کاف حرف تشبیہ کا ہے اور "کان" بھی اُسی کاف تشبیہ سے بنا ہے اور کاف تشبیہ کو بسبب کسی

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

(اے محمد) اُن کی ہدایت کا تیرا ذمہ نہیں ہے، ولیکن اللہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو خیرات سے تو تمہارے ہی لئے ہے اور تم نہ خرچ کرو گے مگر اللہ کی خاص رضامندی چاہنے میں اور جو کچھ کہ خرچ کرو گے تم خیرات سے پورا پہنچایا جائیگا تمہارے پاس اور تم مظلوم نہ ہو گے، خیرات اُن فقیروں کے لئے ہوتی ہے جو رُکے ہوئے ہیں (یعنی سوال کرنے سے) اللہ کی راہ میں نہیں استطاعت رکھتے چلنے کی زمین میں (یعنی سفر کرنے کی) گمان کرتا ہے نادان اُن کو دولتمند سوال سے باز رہنے کے سبب سے، تو اُن کو پہچانتا ہے اُن کے چہرہ سے نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو کچھ کہ تم خرچ کرو گے خیرات سے تو بیشک اللہ اُس کا جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾

ضرورت کے مثلاً بغرض اہتمام تشبیہ یا تبدیل سیاق کلام یا کسی اور ضرورت کے مُشبّہ بہ سے جدا کر کے مقدم کر دینا جائز ہے مثلاً ” زید کالاسد “ سے جب کاف تشبیہ کو کسی سبب سے جدا کر کے مقدم کریں تو یوں کہینگے ”کانّ زید الاسد“ اِس مقام پر بھی، الذی ، مشبّہ نہیں ہے بلکہ اُس سے اُس شخص کے مرور کی تشبیہ یا تمثیل مراد ہے پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ ” الم تر الی الذی کانہ مرّ علےٰ قریۃ “ یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے اُس شخص کو جو گویا کہ گذرا تھا ایک قریہ پر، درحقیقت وہ شخص گذرا نہیں تھا بلکہ اُس نے رویا میں دیکھا تھا کہ میں ایک قریہ پر گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے اور جو تقدیر آیت کی ہم نے بیان کی ہے اُس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اُس شخص کا حال بیان کیا جاتا ہے جو یہ سمجھا تھا کہ گویا میں ایک قریہ میں گیا ہوں اور اس طرح کا بیان صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ رویا کا واقعہ ہے۔ مگر نحوی قاعدہ کے موافق ” کانّ “ کا لفظ الذی موصول کے صلہ میں واقع نہیں ہو سکتا اس ضرورت سے حرف تشبیہ یعنی لفظ کانّ کو متقدم لانا پڑتا تھا اور وہ متقدم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُس کے اسم و خبر صلہ کے جزو تھے اس لئے حرف کاف جو اصل لفظ تشبیہ کا تھا وہ اُس کی جگہ متقدم کیا گیا ❊

قرآن مجید میں اُس شخص کا جس کا رویا یہاں بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے اور نہ اُس قریہ کا ذکر ہے

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّہَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾	جو لوگ کہ خرچ کرتے ہیں اپنا مال رات کو اور دن کو چھپواں اور ظاہرا تو اُن کے لئے اُن کا بدلا ہے اُن کے پروردگار پاس اور نہ خوف ہے اُن پر اور نہ وہ غمگین ہونگے ﴿۲۷۵﴾

جس میں گذرنا اُس شخص نے رویا میں دیکھا تھا، غالباً اُس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اُس شخص نے رویا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے البتہ اُس شخص کی جس نے یہ رویا دیکھا اُس کی تعیین کرنی چاہئے۔ غالباً آنحضرت کے زمانہ میں اُس شخص کے نام کو ہر کوئی جانتا ہوگا مگر اب ہمارے پاس اُس شخص کا نام متعین کرنے کو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے تاریخی واقعات سے جہاں تک کہ تحقیق ہو سکتے ہیں اور جن پر اعتماد ہو سکتا ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت نحمیا نبی تھے ❊

توریت میں جو واقعات بیت المقدس کی ویرانی کے لکھے ہیں اور جو زمانہ اُس کا قرار دیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر نے سنہ ۵۹۰ قبل مسیح میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور سنہ ۵۸۸ قبل مسیح میں بیت المقدس کو فتح کر لیا اور معبد کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا مگر کیخسرو بادشاہ ایران نے غلبہ پاکر یہودیوں کو قید بابل سے آزاد کیا اور سنہ ۵۳۶ قبل مسیح کے انہوں نے بیت المقدس میں واپس آکر قربانیاں کیں اُس کے بعد کسی بادشاہ نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دی اور کسی نے پھر منع کر دیا پھر سنہ ۵۱۸ قبل مسیح میں دارا نے بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دیدی مگر ہاں کی دشمنی سے حرج پڑتا رہا ❊

سنہ ۴۵۷ قبل مسیح کے عزرا پیغمبر بیت المقدس میں گئے اور یہودیوں کی بھلائی کا زمانہ شروع ہوا مگر بیت المقدس اُسی طرح جلا ہوا اور ڈھیا ہوا پڑا تھا حضرت نحمیا نبی کو اُس کا نہایت رنج تھا اُنہوں نے خدا سے بہت التجا اور دُعا کی کہ وہ کسی طرح پھر تعمیر ہو، ایک دفعہ ارتخشتائی بادشاہ کے حضور میں حاضر تھے بادشاہ نے پوچھا کہ تم کیوں رنجیدہ ہو، اُنہوں نے کہا کہ میں کیوں رنجیدہ ہوں کہ وہ شہر جس میں ہمارے بزرگوں کے مزار ہیں ویران پڑا ہے اور اُس کے دروازے آگ سے جلے پڑے ہیں، بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تو کیا چاہتا ہے حضرت نحمیا نے کہا کہ آپ مجھ کو وہاں جانے دیں تاکہ میں اُس کو پھر تعمیر کروں، بادشاہ نے اجازت دی اور ایک میعاد مقرر کی کہ اس عرصہ میں تعمیر کر کے واپس آجانا ❊

حضرت نحمیا بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے تو لوگ اُن پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ کیا وہ بیت المقدس کو بنا لینگے اور اُس کے پتھروں کو جو جلے ہوئے اور خاک کے ڈھیروں کے تلے جمع ہیں نکال لینگے، کتاب نحمیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷۶)	جو لوگ کہ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہونگے مگر جس طرح کہ کھڑا ہوو ہ شخص جس کو مخبوط کر دیا ہو شیطان نے چھونے سے، یہ اس لئے ہے (یعنی اُن کا خبط یہ ہے) کہ وہ کہتے ہیں کہ بیچنا بھی تو مثل سود ہی لینے کے ہے اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام پس جس کے پاس کہ اُس کے پروردگار سے کوئی نصیحت آوے تو وہ باز رہے پھر اُس کے لئے ہے جو کچھ کہ گذرا اور اُس کا کام خدا کے حوالہ ہے اور جس نے کہ پھر کیا تو وہ آگ میں پڑے والے ہیں وہ اُسی میں ہمیشہ رہینگے (۲۷۶)

بڑی فکر تھی اور خدا کے سامنے ہمیشہ التجا اور دُعا کیا کرتے تھے، بلاشبہ اُن کے دل میں یہ بات گذری ہوگی کہ اس شہر کے مرجانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کس طرح اللہ تعالےٰ اُس کو زندہ یعنی آباد کریگا۔ انہیں تردّدات اور خدا سے التجا کرنے کے زمانہ میں جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے حضرت نحمیا نے رویا میں دیکھا اور اُن کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہو جائیگا اُسی رویا کا ذکر اس آیت میں ہے اور وہ رویا یہ ہے کہ اُنہوں نے دیکھا کہ مَیں ایک قریہ میں گیا ہوں جو بالکل ڈھے گیا ہوا اور ویران پڑا ہے رویا ہی میں اُنہوں نے کہا کہ اس قریہ کے اس طرح مرجانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کس طرح خدا اُس کو زندہ یعنی آباد کریگا اسی حالت میں اُنہوں نے دیکھا کہ مَیں مر گیا ہوں اور پھر جی اُٹھا ہوں رویا میں اُن سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے اُنہوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم اُس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رہے اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں اور اپنے گدھے کو دیکھ کہ اُس کا کیا حال ہو گیا ہے اور دیکھ کہ پھر اُس کی ہڈیاں کس طرح ہلتی ہیں اور کس طرح اُن کے اوپر گوشت چڑھتا ہے۔ اس عجیب رویا سے اُن کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جاویگا، پس یہی قصہ جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو بتاتا ہے اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہمارے مفسروں کی عادت ہے کہ سیدھی بات کو بھی ایک عجوبہ بات بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی باتیں بے تحقیق اور قصے اور کہانیاں اُس میں شامل کر دیتے ہیں اسی طرح اس میں بھی کیا ہے باایں ہمہ جب اُن تمام باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو جو اصل بات ہے وہ بھی اُس میں سے نکل سکتی ہے، چنانچہ اس مقام پر بھی جو روایت ابن عباس کے نام سے تفسیر کبیر میں بیان کی ہے اُس سے

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ
الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ
فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ
وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ
فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ
تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ
فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ
بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ

مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیراتوں کو اور
اللہ نہیں دوست رکھتا کسی کفر کرنیوالے گنہگار
کو، بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اچھے کام
کئے ہیں اور پڑھتے رہے ہیں نماز اور دیتے رہے
ہیں زکوٰۃ اُن کے لئے اُن کا بدلا ہے اُن کے
پروردگار کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ
غمگین ہونگے ﴿۲۷۷﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو
ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ کہ باقی رہا ہے سود
سے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۲۷۸﴾ پھر اگر تم نہیں
کرتے تو اجازت دو لڑائی کرنے کی اللہ سے اور اُس
کے رسول سے اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا
راس المال ہے (یعنی زر اصل) نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم
پر ظلم کیا جائیگا ﴿۲۷۹﴾ اور اگر کوئی (یعنی مقروض) تنگدست
ہو تو انتظار کرنا چاہئے فراخی تک اور تمہارا خیرات
کر دینا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾
اور ڈرو اُس دن سے جس میں خدا کی طرف رجوع کرو گے
پھر پورا دیا جائیگا ہر شخص کو جو کچھ اُس نے کمایا ہے اور
وہ مظلوم نہ ہونگے ﴿۲۸۱﴾ اے لوگو جو ایمان لائے
ہو جب تم لین دین کرو قرض کا کسی مقررہ میعاد
تک تو اُس کو لکھ لو اور چاہئے کہ تمہارے بیچ میں کوئی
لکھنے والا انصاف سے لکھ لے

پایا جاتا ہے کہ یہ تمام واقعہ جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک رویا تھا اُس روایت میں بجائے
حضرت نحمیا کے حضرت عزیر کا نام لکھا ہے ممکن ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے حضرت عزیر ہی ہوں مگر
تاریخ سے مطابقت کرنے سے حضرت نحمیا کا ہونا زیادہ تر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اُسی روایت
میں لکھا ہے کہ جب وہ بیت المقدس میں پہنچے تو وہاں انجیر اور انگور پھل رہے تھے اُنہوں نے انجیر
اور انگور کھائے اور انگوروں کو نچوڑ کر اُن کا شیرہ پیا اور سو رہے اور سونے ہی کی حالت میں خدا تعالےٰ
نے اُن کو مردہ کر دیا اور سو برس تک مرے پڑے رہے ان لفظوں سے صاف ثابت ہوتا ہے

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ	اور انکار نہ کرے کاتب یہ لکھے جیسا کہ سکھایا ہے اُس کو اللہ نے پس چاہیئے کہ لکھے وہ شخص جس کے اوپر حق (یعنی قرض) ہو اور چاہیئے کہ ڈرے اپنے پروردگار اللہ سے اور نہ نقصان کرے اُس میں سے کچھ پس اگر وہ شخص جس پر حق (یعنی قرض) ہے بے وقوف ہو یا ضعیف ہو یا خود تحریر نہ کر سکتا ہو پس چاہیئے کہ لکھے اُس کا ولی انصاف سے اور گواہ کر لو دو گواہ کو مردوں میں سے

کہ علمائے متقدمین کی بھی یہ رائے تھی کہ یہ واقعہ حالت نوم میں گذرا تھا جس کو ہم نے سیدھی طرح رویا سے تعبیر کیا ہے باقی قصہ جو اس روایت میں لکھا ہے محض بے اصل ہے جس کے لئے کوئی سند نہیں ہے ✦

قرآن مجید کا سیاق کلام اس طرح پر واقع ہؤا ہے کہ جو قصّے اُس میں بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصد بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت یوسف کے خواب کا جہاں ذکر ہے وہاں بھی اسی طرح بیان ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ مَیں نے گیارہ ستاروں اور چاند اور سورج کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا، اور یوں نہیں بیان کیا کہ مَیں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اور سورج مجھ کو سجدہ کرتے ہیں، کیونکہ خواب میں دیکھنا قرینۂ مقام سے علانیہ روشن تھا، اسی طرح اس مقام پر بھی حضرت عُزیر کے خواب کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور "فلمّا تبیّن" کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ تمام واقعات جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں رویا میں واقع ہوئے تھے ✦

(۲۶۲) (واذ قال ابراھیم) جس طرح کہ پہلی آیت کے سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا قصہ ایک رویا کا واقعہ تھا اُسی طرح اس قصہ کا بھی رویا میں واقع ہونا پایا جاتا ہے اول تو اس وجہ سے کہ سب سے اول جو قصہ ابراہیم کا نمرود کے ساتھ بیان ہؤا اور واقعی قصہ تھا اُس سے ابراہیم کے اس قصہ کو علیحدہ کرکے اُس قصہ کے بعد بیان کیا ہے جو رویا میں واقع ہؤا تھا۔ دوسرے یہ کہ کیفیت احیائے موتیٰ امر مُشاہد بالعین نہیں ہے اگر کوئی شخص کسی مردہ کو زندہ کر دے یا بیمار کو اچھا کر دے تو اس قدر مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ مردہ زندہ یا بیمار اچھا ہو گیا مگر اُس کی کیفیت احیاء و کیفیت صحت امر مشاہد نہیں ہے اور اس لئے لفظ اَرِنِی سے کسی ایسے امر سے مراد نہیں ہے جو وقوع فی المشاہدہ ہو بلکہ اِطمینانِ قلبی مراد ہے پس گویا حضرت ابراہیم کا یہ کہنا کہ "اے رب میرے دل کو بتا دے کہ مردے کس طرح زندہ ہونگے"۔ تیسرے یہ کہ اس قسم کے تردّدات جو بزرگوں کو

فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَ
امْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ
أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ
إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا يَأْبَ
الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا
تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ
صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ
ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ
وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ
أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ
عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا

پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں
اُن لوگوں میں سے جن پر تم راضی ہو گواہوں میں
سے (تاکہ) اگر بھول جاوے ایک اُن دونوں
میں کا تو اُن دونوں میں کا ایک دوسرے کو یاد
دلاوے اور انکار نہ کرنا چاہئے گواہوں کو جبکہ
وہ طلب کئے جاویں اور نہ کاہلی کرو اُس کے
لکھنے میں اُس کی میعاد تک چھوٹی ہو یا بڑی
یہ تمہارے لئے زیادہ انصاف ہے اللہ کے نزدیک
اور زیادہ قوی ہے گواہی کے لئے اور قریب تر
ہے کہ شک میں نہ پڑو مگر جب کہ تجارت کا (لین دین)
ہو اور باہم دست بدست اُس کو بھراتے ہو تو
تم پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ اُس کو نہ لکھو

اور اہل دل کو واقع ہوتے ہیں اُن کا رفع اور تسلی اُسی طریق سے ہوتی ہے جس کو مشاہدات یا مکاشفات یا رویا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو فطرت انسانی کے بالکلیہ مطابق ہے۔ حضرت ابراہیم نے اور نہ اُن سے پیشتر کسی نے اِس دنیا میں مُردوں کا زندہ ہونا دیکھا تھا اور اس لئے کوئی ذی عقل خدا سے ایسا سوال نہیں کرسکتا تھا، پس صاف پایا جاتا ہے کہ جو تعجب احیاءِ موات کی نسبت حضرت ابراہیم کے دل میں پیدا ہوا تھا اُسی کا رفع ہونا چاہا تھا اور اُس کا رفع ہونا نہ دنیاوی مشاہدہ اور نہ ان ظاہری آنکھوں کے دیکھنے سے علاقہ رکھتا تھا پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ جو یہاں مذکور ہوا ہے وہ ایک رویا حضرت ابراہیم کا ہے۔ انہوں نے رویا میں خدا سے کہا کہ مجھ کو دکھلا یا بتا کہ تو کس طرح مردہ زندہ کریگا پھر خواب ہی میں خدا کے بتلانے سے انہوں نے چار پرندہ جانور لئے اور اُن کا قیمہ کرکے ملا دیا اور پہاڑوں پر رکھ دیا پھر بلایا تو وہ سب جانور الگ الگ زندہ ہو کر چلے آئے اور اُن کے دل کو مردوں کے زندہ ہونے سے جن کے اجزا بعد مرنے کے عالم میں مخلوط و منتشر ہو جاتے ہیں طمانیت ہوگئی ✣

کل مسلمان عالموں اور قدیم مفسروں کو بھی اس بات پر یقین نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم نے سچ مچ جانوروں کا قیمہ کرکے پہاڑوں پر رکھ دیا تھا اور اس لئے اس آیت کی نسبت مفسرین کی تین رائیں قائم ہوئی ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کی یہ رائے ہے کہ درحقیقت حضرت ابراہیم نے جانوروں کا قیمہ کرکے پہاڑوں پر رکھ دیا اور پھر جب بلایا تو وہ زندہ ہو کر چلے آئے۔ دوسرے

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِکُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾	اور گواہ کر لو جب کہ تم خرید و فروخت کرو اور نہ ضرر پہنچایا جاوے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر تم نہ کرو تو بیشک وہ تمہاری بداعمالی ہے اور ڈرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تم کو اللہ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے ﴿۲۸۲﴾

وہ لوگ ہیں جو صُرۡھُنَّ کے معنی قیمہ کرنے کے نہیں لیتے بلکہ اپنے سے ہلا لینے کے لیتے ہیں اور جزء کے معنی ہر ایک جانور کے جزء کے نہیں لیتے بلکہ مجموعہ جانوروں میں سے بعض مراد لیتے ہیں جس سے آیت کا مطلب صرف یہ رہجاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے چند جانور اپنے سے ہلائے اور پھر کوئی جانور کسی پہاڑ پر اور کوئی کسی پہاڑ پر چھوڑ دیا اور پھر جب بُلایا تو سب چلے آئے لیکن اگر ایسا کیا ہو تو یہ لڑکوں کا کھیل ہوا اس سے احیاء اموات سے کیونکر طمانیت ہو سکتی ہے تیسرے وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جانوروں کا قیمہ کرنا اور پہاڑوں پر رکھنا واقع نہیں ہوا بلکہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ایسا کرنے کا حکم دیا تو اس حکم سے حضرت ابراہیم کے دل کو طمانیت ہو گئی پھر اُنہوں نے نہ جانور پکڑے نہ اُن کا قیمہ کیا نہ پہاڑوں پر رکھا۔ گو کہ یہ پچھلے گروہ مفسرین کے بھی اس امر کے واقع ہونے سے یعنی جانوروں کے قیمہ کرنے اور پھر اُن کے زندہ ہونے سے انکار کرتے ہیں مگر ہماری سمجھ میں ان تینوں گروہ نے رویا کے واقعات کو ظاہری واقعات سمجھنے میں غلطی کی ہے +

عیسائی بحث کرنے والوں نے ہمارے مفسرین کے لغو اقوال کو غنیمت سمجھا اور بلا تحقیق اصل مطلب کے قرآن مجید پر اعتراض کرنے کو موجود ہوئے۔ کتاب حزقیل میں حضرت حزقیل کے رویا کا ذکر ہے کہ وہ ایک جنگل میں جس میں آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں پڑی تھیں پہنچے خدا نے کہا کہ کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں پھر حزقیل نے اُن ہڈیوں سے خدا کے حکم سے کہا کہ تم زندہ ہو گی تم پر رگ اور گوشت آجاویگا اور جان پڑجاویگی اور تم زندہ ہو جاؤ گی چنانچہ وہ ہڈیاں ہلیں اور گوشت و چمڑہ پیدا ہوا پھر وہ سب اُسی طرح زندہ ہو گئیں۔ اور توریت کتاب پیدایش باب پندرھویں میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کو بیٹا پیدا ہونے کی بشارت کے وقت خدا نے کہا تھا کہ چار جانور لے اور اُن کے دو دو ٹکڑے کر کے ہر ایک ٹکڑے کو اُس کے مقابل رکھدے۔ حضرت ابراہیم نے چارپایوں کے ٹکڑے کئے مگر پرندوں کے ٹکڑے نہیں کئے اور پھر اُس کو نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ پس عیسائیوں نے مفسرین کی لغو اور ناتحقیق روایتوں کو دیکھ کر کہدیا کہ یہ دونوں قصّے جو قرآن مجید میں موجود ہیں اور جن کے ساتھ مفسرین نے روایتیں لائی ہیں وہ ان

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ	اور اگر تم سفر پر ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا گروی ہے (مرتہن کے) قبضہ میں دی ہوئی پھر اگر امین جانیں بعض تم ہیں کے بعض کو پس چاہیئے کہ ادا کرے اُس شخص کو اُس کی امانت جس کو امین جانا ہے

دونوں قصّوں سے جو توریت میں مذکور ہیں بنائی گئی ہیں۔ مگر ہم اس وقت ناقابل فہم قصوں پر جو توریت میں اور کتاب حزقیل میں مذکور ہیں بحث نہیں کرتے بلکہ صرف اس قدر بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو یہ دونوں قصّے مذکور ہیں اُن سے اور توریت و کتاب حزقیل کے مندرجہ قصّوں سے کچھ تعلق نہیں ہے ٭

(۲۷۶) (واحل اللّٰہ البیع وحرم الربوٰا) حضرت عمر نے کہا کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اور ربا کی تفسیر ہم سے نہیں فرمائی۔ یعنی ہم کو اس بات کے دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا کہ ربا جس کو خدا نے حرام فرمایا وہ کیا ہے اور کونسا ربا ہے جو حرام ہوا ہے اور جس پر ایسی سخت وعید نازل ہوئی ہے، پس جب کہ اتنے بڑے خلیفہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ربا کی حقیقت پر تشفی نہ تھی تو ضرور تھا کہ صحابہ و تابعین اور آئمہ مجتہدین اور علماے امت میں اختلاف رائے ہو اور ہر ایک اپنے اجتہاد کے موافق اُس کی نسبت مسائل قرار دے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہوتا ہے اور رہو گا اور اس چودھویں صدی نبوی میں جس کا یہ دسواں برس ہے مَیں بھی بقدر اپنے فہم کے علماے اُمّت سے اس مسئلہ میں مختلف رائے رکھتا ہوں ٭

علماے امّت اور فقہاے اسلام نے ربا کی دو قسمیں کی ہیں ایک ربا الفضل اور دوسری ربا النسیہ۔ ربا الفضل سے ایسی بڑھوتری مراد ہے کہ ہم جنس چیز کے دست بدست مبادلہ کرنے میں لی دی جاوے۔ اس قسم کے ربا کی حُرمت زیادہ تر حدیثوں پر مبنی ہے اور اس باب میں کہ کون سی ہم جنس چیزوں کے مبادلہ میں بڑھوتری لینا ربا ہے ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہے ٭

امام ابو حنیفہ کے نزدیک اُس ہم جنس مال کے مقابلہ میں بڑھوتری ربا ہے جو پیمانہ سے نپتا یا وزن سے تُلتا ہو ٭

امام شافعی کے نزدیک وہ مال یا خود قیمتی ہو جیسے چاندی سونا یا شئے خوردنی ہو ٭

امام مالک کے نزدیک وہ مال یا خود چاندی، سونا ہو یا ایسا ہو جس سے انسان کا قوت ہوتا ہو یا جو اس کی اصلاح کرتا ہو جیسے کہ نمک ٭

ان اختلافات کا نتیجہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک چاندی اور سونے کے سوا باقی ایسی

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْا	خدا کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں اور اگر تم ظاہر کرو

بڑھوتری کے ہیں اور ہر ایک بڑھوتری حرام نہیں ہے بلکہ وہی خاص بڑھوتری حرام ہے جو آپس میں عرب کے لوگوں میں ربا کے نام سے موسوم تھی اور وہ بڑھوتری اُدھار کے معاملہ میں ہوتی تھی پس خدا نے جو یہ فرمایا ،، وحرم الربا ،، اس سے وہی اُدھار والی بڑھوتری حرام ہوئی اور بیع کے حلال کرنے سے وہ بڑھوتری جو نقدًا دست بدست ہو حرام نہیں ہوئی اور نہ ربا کے حرام ہونے میں داخل ہوئی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی حرمت حدیث کی رُو سے ہوئی ہے کیونکہ ایسا کہنے میں ظاہر قرآن کی تخصیص خبر واحد سے ہو جاویگی اور یہ جائز نہیں ✧

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابن عباس نے اپنے اس قول سے رجوع کی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ عکرمہ جو ان کے خاص شاگرد رشید تھے اور اُنہیں کے پاس رہتے تھے اور انہیں سے تربیت پائی تھی اُن کو ابن عباس کے رجوع کی خبر نہ تھی اور اس سبب سے وہ روایت جس میں ابن عباس کا رجوع کرنا بیان کیا گیا ہے نہایت مشتبہ ہو جاتی ہے بہر حال اگر ابن عباس کا رجوع کرنا بھی تسلیم کیا جائے تو اُس کا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ بیع فاسد سے جو ربا ہو اس کو ابن عباس پہلے جائز سمجھتے ہونگے پھر اُنہوں نے اس کو ناجائز سمجھا نہ یہ کہ اُنھوں نے اس معاملہ کو اس ربا میں داخل کیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے ✧

ربا النسیئۃ وہ ہے جو عرب کے لوگوں میں زمانہ جاہلیت میں مشہور اور معروف تھا اور وہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کو کچھ مال دیتا تھا اس اقرار پر کہ مدیون ہر مہینہ ایک مقدار معین اُس کو دے اور راس المال بدستور مدیون کے ذمہ باقی رہے جب وعدہ ادا ے راس المال کا گذر جاتا تھا تو دائن پورا روپیہ اپنا طلب کرتا تھا اور اگر وہ نہ دے سکتا تھا تو میعاد بڑھا دیتا تھا اور راس المال کو بھی بڑھا دیتا تھا اور اس پر ہر مہینہ ایک مقدار معین لیتا تھا پس جو مقدار کہ ماہواری لی جاتی تھی یا جو اضافہ کہ راس المال میں کیا جاتا تھا اُسی پر عرب جاہلیت ربا کا اطلاق کرتے تھے اور اسی کی حرمت اس آیت میں آئی ہے اور لفظ ،، حرم الربا ،، سے یہی خاص ربا حرام ہوا ہے ✦

یہ طریقہ ربا کا جو عرب جاہلیت میں جاری تھا بعینہ ہندوستان کے سود خواروں میں جاری ہے کہ وہ ایک شخص کو روپیہ قرض دیتے ہیں اور اُس پر ماہواری یا ششماہی سود لیتے ہیں اور اگر وہ میعاد پر ادا نہیں ہوتا تو اُس سود کو بھی اصل میں داخل کر دیتے ہیں اور مجموع اصل وسود پر پھر سود لیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میعادِ ادا منقضی ہونے پر دوسری میعاد بڑھا دیتے ہیں اس طرح پر کہ میعاد بڑھانے کی عوض کبھی کچھ نقد روپیہ لے لیتے ہیں اور کبھی مقدارِ اصل کو زیادہ کر دیتے ہیں اور ایسا بھی

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اُس کو چھپاؤ تم سے اللہ اس کا حساب لیگا پس بخشیگا	مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ

کرتے ہیں کہ غلہ ایک میعاد معین کے لئے قرض دیتے ہیں اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ جتنا دیا ہے اُس کا ڈیوڑھا یا دُگنا لینگے اور جب میعاد پر ادا نہیں ہوتا ہے تو اُس اضافہ کو بھی اصل میں شامل کر کے میعاد بڑھا دیتے ہیں اور اس مجموع پر ڈیوڑھا یا دُگنا لینے کا اقرار کرتے ہیں یہ سب صورتیں اُس ربا کی ہیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے اور بلاشبہ یہ ربا حرام ہے +

ربا النسیئۃ کے اب یہ معنی ٹھیرے کہ مدیون سے علاوہ زر اصل کے کچھ روپیہ یا مال بطور فائدہ کے لینا مگر ایک بحث اور باقی رہ جاتی ہے کہ عموماً ایسا کرنا حرام اور ممنوع ہے اور اُس کا کرنے والا ہر حالت میں اُنہیں وعیدوں کا مستحق ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں یا کسی اور قسم کی بھی قید یا تخصیص قرآن مجید سے پائی جاتی ہے۔ علمائے اسلام کی یہ رائے ہے کہ اس میں کسی قسم کی قید یا تخصیص نہیں ہے مگر میں قرآن مجید کی رُو سے ایسا نہیں سمجھتا بلکہ میری یہ سمجھ ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے اس قسم کے ربا سے حرام ہونے میں بھی ایک تخصیص پائی جاتی ہے جو آئندہ بیان ہوگی +

ربا درحقیقت ایک نہایت بُری چیز ہے اور انسانی اخلاق اور تمدن کے لئے بعضی حالتوں میں نہایت مضر ہے۔ ربا جب کہ ایک پیشہ کر لیا جاتا ہے جیسا کہ سود خور آڑھتئے اور مہاجن بطور پیشہ کے اُس کو برتتے ہیں تو تمدن کے لئے نہایت مضر ہوتا ہے، ذی مقدور شخص اُس روپیہ کو مُلک کی ترقی اور تجارت کی افزونی میں صرف نہیں کرتا بلکہ خود اپنے ہی مُلک کے لوگوں سے اُن کا مال لینے میں فکر کرتا ہے، وہ اپنی محنت اور مشقت سے معیشت پیدا کرنے میں بالکل سُست ہو جاتا ہے اور لوگوں نے جو محنت اور مشقت سے کمایا ہے اس کے لے لینے پر راغب ہوتا ہے، اس کے مال و دولت سے کوئی صنعت یا کوئی ایسا کارخانہ جس سے لوگوں کو معیشت میں مدد پہنچے اور ملک کی دولت کو ترقی ہو نہیں قائم ہوتا، بجز اُس کے کہ غریبوں سے ان کی محنت اور مشقت کے حاصلات کے چھین لینے کا اس کو قابو ملتا ہے، اور کچھ شبہ نہیں کہ ایسا ربا اخلاق و معاشرت و تمدن کے برخلاف ہے +

ایک اور صورت ربا کی ہے جو اُس سے بھی زیادہ اخلاق انسانی اور روحانی نیکی کے برخلاف ہے اور بلاشبہ حرب میں اللہ و رسولؐ کے برابر ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ غریب و محتاج و مفلس ہیں اور نہ کسی عیش و آرام کے لئے بلکہ صرف اپنی زندگی کے لئے قُوتِ لایمُوت بہم پُہنچانے کو روپیہ یا غلہ قرض لیتے ہیں اور ذی مقدور سودی قرض اُن کو دیتے ہیں اور سود لیتے ہیں۔ ایسا کرنا انسانی ہمدردی اور غریبوں کے ساتھ سلوک کرنے کے بالکل برخلاف ہے حالانکہ قرآن مجید میں اُن کے ساتھ سلوک کرنے کا جابجا حکم ہے۔ ایسے لوگوں سے سود لینا شقاوت قلبی اور بدترین اخلاق ہونے

جس کو چاہیگا اور عذاب دیگا جس کو چاہیگا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۲۸۴)	لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۸۴)

کے سوا قرآن مجید کی مستحکم ہدایتوں کے بھی برخلاف ہے اور کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا کہ ایسا ربا نہایت بد اور ناپاک ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایسے ہی ربا کا اس آیت میں ذکر ہے جس کو خدا نے منع فرمایا اور حرام کیا ہے اور کوئی انسانی دل جو ذرا بھی روحانی اخلاق کی طرف مائل ہوگا ایسا نہ ہوگا جو اس قسم کے ربا کو حرام و ناپاک نہ سمجھتا ہو ✣

میری اس سمجھ پر جو کچھ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ "حرم اللہ الربوا" جو ایک عام حکم تھا اُس کو مَیں نے خاص کر دیا ہے اور اُسی ربا پر منحصر کر دیا ہے جو ایسے لوگوں سے لیا جاوے جن کے ساتھ سلوک کرنے اور اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے کی قرآن مجید میں ہدایت ہوئی ہے مگر میرے دل کو یقین ہے کہ قرآن مجید کے تمام سیاق وسباق کلام سے یہی ہدایت پائی جاتی ہے ✣

ربا کی آیت سے پہلی آیتوں میں خدا تعالے نے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے والوں کی خوبیوں کو بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی مثال ایک ایسے دانہ کی ہے جو اُگے اور اس میں سات خوشے لگیں اور ہر خوشے میں سو سو دانے ہوں۔ پھر اُن کو نصیحت کی کہ غریب و محتاجوں کے ساتھ جو تم سلوک کرتے ہو اس کو احسان جتانے سے اور اُن کا دل دُکھانے سے برباد مت کرو اور اُس کی مثال ایسے شخص کی بتائی جس کا ہرا بھرا باغ آگ سے جل گیا ہو۔ پھر اُن کو سمجھایا کہ غریبوں اور مسکینوں کو جو خدا کے لئے دیتے ہو وہ اپنے ہی لئے دیتے ہو اور وہ تمہیں پہنچیگا ✣

اُس کے بعد خدا تعالےٰ نے اُن لوگوں کا ذکر کیا جو غریب اور مسکین لوگوں پر مال خرچ کرتے ہیں اور اُن کے ثواب کا بیان کیا اور اسی کے ساتھ اُن لوگوں کا ذکر کیا جو بعوض سلوک و ہمدردی کرنے کے سود لیتے ہیں پس قرینہ مقام و طرز کلام سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس آیت میں انہیں لوگوں کا ذکر ہے جو غریب مسکین لوگوں سے سود لیتے تھے۔ اور اُسی سُود کو جو ایسے لوگوں سے لیا جاتا تھا جو قابل رحم اور ہمدردی اور سلوک کرنے کے تھے خدا نے حرام کیا اور فرمایا کہ "حرم الربوا" اور پھر فرمایا کہ "یمحق اللہ الربوا و یربی الصدقات" اور پھر فرمایا کہ اے ایمان والو جو کچھ سود کا لینا باقی رہ گیا ہے اُس کو چھوڑ دو اور اگر نہیں چھوڑتے تو خدا و رسول سے لڑنے کو تیار ہو کیونکہ خدا و رسول نے تو اُس کے ساتھ سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے اور تم اُس کے برعکس اُن سے سُود لیتے ہو "خدا کے حکم کے برخلاف کرنا" خدا سے لڑائی کرنی ہے ✣

پس تم کو چاہئے کہ اُن سے اپنا اصل مال لے لو اور اگر کوئی ایسا محتاج ہو کہ اصل دینے کا بھی مقدور نہ رکھتا ہو تو اُس کو مہلت دو تاکہ جب اُس کو فراغت ہو ادا کرے اور اگر اصل بھی چھوڑ دو تو تمہارے

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲۸۵)	ایمان لایا پیغمبر جو اُتاری گئی ہے اُس پر اُس کے پروردگار سے اور سب ایمان لانے والے ہیں، ہر ایک ایمان لایا اللہ اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر نہیں فرق کرتے ہم درمیان کسی ایک کے اُس کے رسولوں میں سے اور اُنھوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے طاعت کی اے ہمارے پروردگار تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیرے پاس پھر جانا ہے (۲۸۵)

لئے بہتر ہے پس جس قدر آیتیں کہ قبل آیت ربا کے ہیں اور جس قدر کہ اس کے بعد ہیں اُن سب کو ملانے اور سیاق وسباق کلام پر نظر کرنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہی ربا حرام کیا گیا ہے جو ایسے غریب محتاج آدمیوں سے لیا جاتا تھا جو کھانے کو محتاج تھے اور غلہ یا کھجوریں یا اور کچھ قرض لیکر قوت لایموت بہم پہنچاتے تھے جن کی نسبت قرآن مجید میں جا بجا سلوک و ہمدردی کرنے کی ہدایت تھی پس میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص گو کہ وہ کوئی مذہب رکھتا ہو ایسے ربا کو ناپاک حرام نہ سمجھتا ہو ✦

اُن کے سوا وہ لوگ ہیں جو ذی مقدور اور صاحب دولت وجاہ وحشمت ہیں اور اپنے عیش وآرام کے لئے روپیہ قرض لیتے ہیں جائدادیں مول لیتے ہیں مکان بناتے ہیں اور قرض روپیہ لے کر چین اُڑاتے ہیں گو اُن کو قرض دینا بعض حالتوں میں خلاف اخلاق ہو مگر اُن سے سود لینے کی حرمت کی کوئی وجہ قرآن مجید کی رُو سے مجھ کو نہیں معلوم ہوتی ✦

اسی طرح بہت سے معاملات قرضہ کے ہیں جو تجارت کے کاروبار میں پیش آتے ہیں اور ایسے بنکوں کے قائم ہونے سے سود تجارت کے مقاصد کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیہ پہنچادیتے ہیں اور ہر قسم کی آڑھتوں کا کام کرتے ہیں اور جن سے تجارت کو اور ترقئ ملک کو اور افزونی آبادی کو نہایت امداد پہنچتی ہے ان معاملات میں جو سود کہ لیا و دیا جاتا ہے مجھ کو قرآن مجید کی رُو سے اُس کے ایسا ربا ہونے کی جس کو اس آیت میں حرام کیا ہے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی پس حکم ربا جو قرآن مجید میں ہے وہ نہایت اخلاق و نیکی پر مبنی ہے اور کسی طرح ترقی تجارت و ترقی ملک و دولت کا مانع نہیں ہے۔ فقہا نے بلاشبہ اپنے اجتہاد اور قیاس سے ایسی قیدیں بڑھا دی ہیں جن سے ربا کا حکم تجارت کی ترقی کا مانع قوی ہو گیا ہے، مگر قرآن مجید سے ایسا نہیں پایا جاتا مفتی شرف الدین رامپوری اور مولوی بُرہان الدین صاحب نے اپنے رسالوں میں ربا کو صرف جنس کے دست بدست مبادلہ میں منحصر کیا تھا جس کو ربا الفضل کہتے ہیں اور نسیہ یعنی قرضہ میں ربا نہیں قرار دیا تھا، مگر میری رائے اس کے برخلاف ہے جیسے کہ اوپر بیان ہوا ✦

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا	نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی کو مگر بقدر اُس کی طاقت کے اس کے لئے ہے وہ جو اُس نے کمایا اور اس پر ہے جو اُس نے کمایا / اے پروردگار ہمارے ہم کو مت پکڑ

اب میں اپنی رائے سے قطع نظر کرتا ہوں اور کتب فقہ اور مسائل مسلمہ فقہ کو تسلیم کر کے مندرجۂ ذیل معاملات پر جو اس زمانہ میں اکثر پیش آتے ہیں نظر ڈالتا ہوں کہ اگر فقہ ہی کی روایتوں پر عمل کیا جاوے تو فقہ کی رُو سے بھی معاملات مندرجۂ ذیل کے سود پر ربا ناجائز کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں +

اول گورنمنٹ پرامیسری نوٹ ۔ اگرچہ مولانا شاہ عبد العزیز صاحب نے گورنمنٹ پرامیسری نوٹ کے سود کے مباح ہونے کا فتویٰ دیا ہے مگر جس اصول پر وہ فتویٰ دیا گیا ہے میری رائے میں وہ اصول صحیح نہیں بلکہ فقہ مسلمہ کی رو سے پرامیسری نوٹ کے سود کے جائز ہونے کی اور وجہ ہے +

فقہ کے اس مسئلہ کو کہ ”کل قرض جر منفعۃ فھو ربوا“ تسلیم کر لو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جس قرضہ میں بڑھوتری ملے وہ ربا ہے۔ قرضہ کے مستحق ہونے کو تین رُکن ضروری ہیں اگر ایک رکن بھی اس میں موجود نہ ہو تو اس پر قرضہ کا اطلاق نہ ہوگا اور اس کی بڑھوتری ربا ناجائز نہ ہوگی اور وہ رُکن یہ ہیں، اول ۔ دائن یا دائنان کا محقق و مشخص ہونا ۔ دوم ۔ مدیون کا محقق و مشخص ہونا ۔ سوم ۔ دائن کو حق طلب باقی ہونا ۔ گورنمنٹ پرامیسری نوٹ میں جس میں زمانۂ ادا موعود نہیں ہے ان ارکان ثلاثہ میں سے دو رُکن مفقود ہیں، ایک مدیون کیونکہ اُس میں کوئی شخص معین و مشخص مدیون نہیں ہے بلکہ صرف ایک مفہوم جس کو گورنمنٹ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں مدیون ہے جو فقہ کی رو سے صلاحیت مدیون قرار پانے کی نہیں رکھتی ۔ دوسرے حق طلب، اس لئے کہ دائن کو اُس قرضہ کے طلب کا حق نہیں ہے ۔ اور جن پرامیسری نوٹوں میں میعادِ ادا موعود ہے ان میں حق طلب ساقط نہیں اِلّا مدیون بدستور غیر متعین و غیر مشخص ہے، پس جو بڑھوتری کہ اُن پرامیسری نوٹوں کے ذریعہ سے حاصل ہو وہ فقہ کی رُو سے ربا نہیں قرار پا سکتی +

ہمارے زمانہ کے علما پرامیسری نوٹوں کی بڑھوتری پر ربا ہونے یا نہ ہونے کا حکم دیں یا نہ دیں، مگر ہمارے زمانہ میں دہلی میں بعینہٖ مثل پرامیسری نوٹ کے ایک معاملہ پیش آیا تھا اور تمام علمائے دہلی نے جو اُس زمانہ تک بڑے بڑے مقدس لوگ موجود تھے اُس کے جواز کا فتوےٰ دیا تھا اور وہ واقعہ یہ تھا کہ بہادر شاہ بادشاہ نے یہ قاعدہ نکالا تھا کہ جو کوئی شخص بادشاہ کو کچھ روپیہ بطور نذرانہ کے دے تو اُس شخص کی تنخواہ اُس روپیہ کے سود کے برابر مقرر ہو جاوے جس شخص نے

إِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا

اگر ہم نے بھول یا ہم نے چوک کی ہے اے پروردگار ہمارے اور مت رکھ ہم پر بھاری بوجھ جس طرح کہ تو نے اُس کو اُن لوگوں پر رکھا جو ہم سے پہلے تھے اے پروردگار ہمارے اور مت رکھ ہم پر

روپیہ دیا اُس کو روپیہ کے واپس مانگنے کا اختیار نہ رہتا تھا اور نہ بادشاہ کو تنخواہ معینہ کے بند کر دینے کا، ہاں یہ بات بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھی کہ اگر وہ تنخواہ معینہ بند کرنی چاہیں تو وہ روپیہ جو بنام نہاد نذرانہ لیا ہے اس شخص کو واپس کر دیں ٭

اکثر ایسا اتفاق ہؤا ہے کہ مثلاً ایک شخص نے بادشاہ کو ہزار روپیہ نذرانہ اس شرط پر دیا کہ دس روپیہ مہینہ کی تنخواہ اُس کی مقرر ہو جاوے بادشاہ نے منظور کیا اور تنخواہ مقرر کر دی۔ دوسرا ایسا شخص آن موجود ہؤا کہ ہزار روپیہ نذرانہ اس شرط پر دینے کو راضی تھا کہ بادشاہ پانچ روپیہ ماہواری اُس کا مقرر کر دیں بادشاہ نے ہزار روپیہ اُس سے لیا اور پہلے شخص کا روپیہ واپس کر دیا اور دس روپیہ تنخواہ اُس کی بند کر دی اور اس میں سے پانچ روپیہ اس دوسرے شخص کی تنخواہ مقرر کر دی اور وہ پانچ روپیہ جو بچے اس کی بھی کسی تیسرے شخص سے نذرانہ لیکر اس کی تنخواہ میں مقرر کر دئیے ٭

یہ معاملہ پرامیسری نوٹ کے معاملہ سے بھی زیادہ مشتبہ ہے کیونکہ جو حالت بادشاہ کی مثل ایک پنشن دار شخص کے تھی اس کے لحاظ سے بادشاہ بذات خود مدیون متصور ہوتے تھے اور اس لئے اس معاملہ میں دو رکن موجود تھے یعنی دائن و مدیون البتہ صرف تیسرا رکن حق طلب معدوم تھا پس اس معاملہ کی بڑھوتری کو تمام علمائے دہلی ربا نہیں سمجھتے تھے اور اگر میری یاد میں غلطی نہ ہو تو بڑے بڑے مقدس مولویوں نے اس قسم کا نذرانہ دیکر تنخواہیں اپنی اور اپنے قرابت مندوں کی مقرر کرائیں تھیں پس میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر یہ بڑھوتری سود ناجائز نہ تھی تو پرامیسری نوٹ کی بڑھوتری کیوں سود ناجائز قرار پا سکتی ہے ٭

دوم معاملات ترفئہ ملک۔ مثلاً گورنمنٹ یا کوئی جماعت محدود اس غرض سے روپیہ قرض لے کہ اس روپیہ سے ایک نہر آبپاشی کے لئے یا آہنی سڑک آمد و رفت کے لئے جاری کرے اور دائن کو اس قرضہ کی بابت سود دینا قبول کرے تو وہ بھی ربائے ممنوع میں جس کا ذکر آیت میں ہے داخل نہیں ہے کیونکہ وہ اس قسم کا قرضہ نہیں ہے جس پر ربا ممنوع ہے ٭

سوم معاملات رفاہ عام۔ فرض کرو کہ کسی شخص یا جماعت نے ایک سرمایہ اس غرض سے جمع کیا ہے کہ اُس کے محاصل سے عام رفاہ کے کام کئے جاوینگے وہ سرمایہ فقہ کی رُو سے وقف ہے اور وہ شخص یا جماعت صرف امین یا متولئے وقف ہے اس سرمایہ کی ملکیت نہیں رکھتی

مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾	"وہ چیز جس کی برداشت کی ہم کو طاقت نہیں اور معاف کر ہم سے اور بخش دے ہم کو اور مہربانی کر ہم پر تو ہی ہمارا مولے ہے پھر مدد کر ہماری کافروں کی قوم پر ﴿۲۸۶﴾

بس اگر وہ سرمایہ بالفرض کسی کو سودی قرض دیا جاوے تو وہ بھی ربائے ممنوع میں داخل نہیں ہو سکتا +

سبب اس کا یہ ہے کہ جو اصول وقواعد جماعت محدود کے لئے اس زمانہ میں مروج ہیں اُن کی رو سے وہ جماعت محدود اپنی ذات سے اُس قرضہ کی مدیون نہیں ہوتی اور نہ اُن کی ذات دائن ہوتی ہے اور یہی حال اُس شخص یا جماعت کا ہے جو کسی سرمایہ وقف کا متولی یا امین ہے پس اُن دونوں صورتوں میں یا دائن شخص معین نہیں ہے یا مدیون شخص معین نہیں ہے۔ اور اس لئے اُس پر ایسے قرضہ کا ہونا جس پر سود لینا ممنوع ہے صادق نہیں آتا اور اس لئے اُس پر ربا ربائے ممنوع نہیں ہے +